یادوں کی دستک

صوفیہ انجم تاج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یادوں کی دستک

(خودنوشت)

صوفیہ انجم تاج

زین پبلی کیشنز، کراچی

Yaadon Ki Dastak

By

Sofia Anjum Taj

Contact:
1244, Millbrook,
Canton,
MI.48188
Ph: 313 561 8671

یادوں کی دستک

صوفیہ انجم تاج

سال اشاعت: جنوری ۲۰۰۷ء
سرورق: صوفیہ انجم تاج
کمپوزنگ: میڈیا گرافکس، کراچی
پرنٹر: ذکی پرنٹرز، کراچی
قیمت: ۲۵۰ روپے (۱۵ امریکی ڈالر یا ۲۰ کینیڈین ڈالر)
تعداد: ۵۰۰
پبلشر: زین پبلی کیشنز، A-8، ندیم کارنر، بلاک N، شمالی ناظم آباد، کراچی۔ ۷۴۷۰۰
فون: 6679796, 6645177
e-mail: quarterlyroshnai@hotmail.com,

انتساب

میرے صحراؤں کی تمازت کو نخلستان کے شاخساروں کا روپ دینے والوں

سیّد عبدالاحد احمد

سیّد مسعود سیّد

سیّد اسلم

عاصمہ سراج

طیبہ جعفری

اور حمیدہ تمنا

کے نام

یادوں کی دستک

ابا (سید عبدالعزیز) کا ایک مخصوص انداز
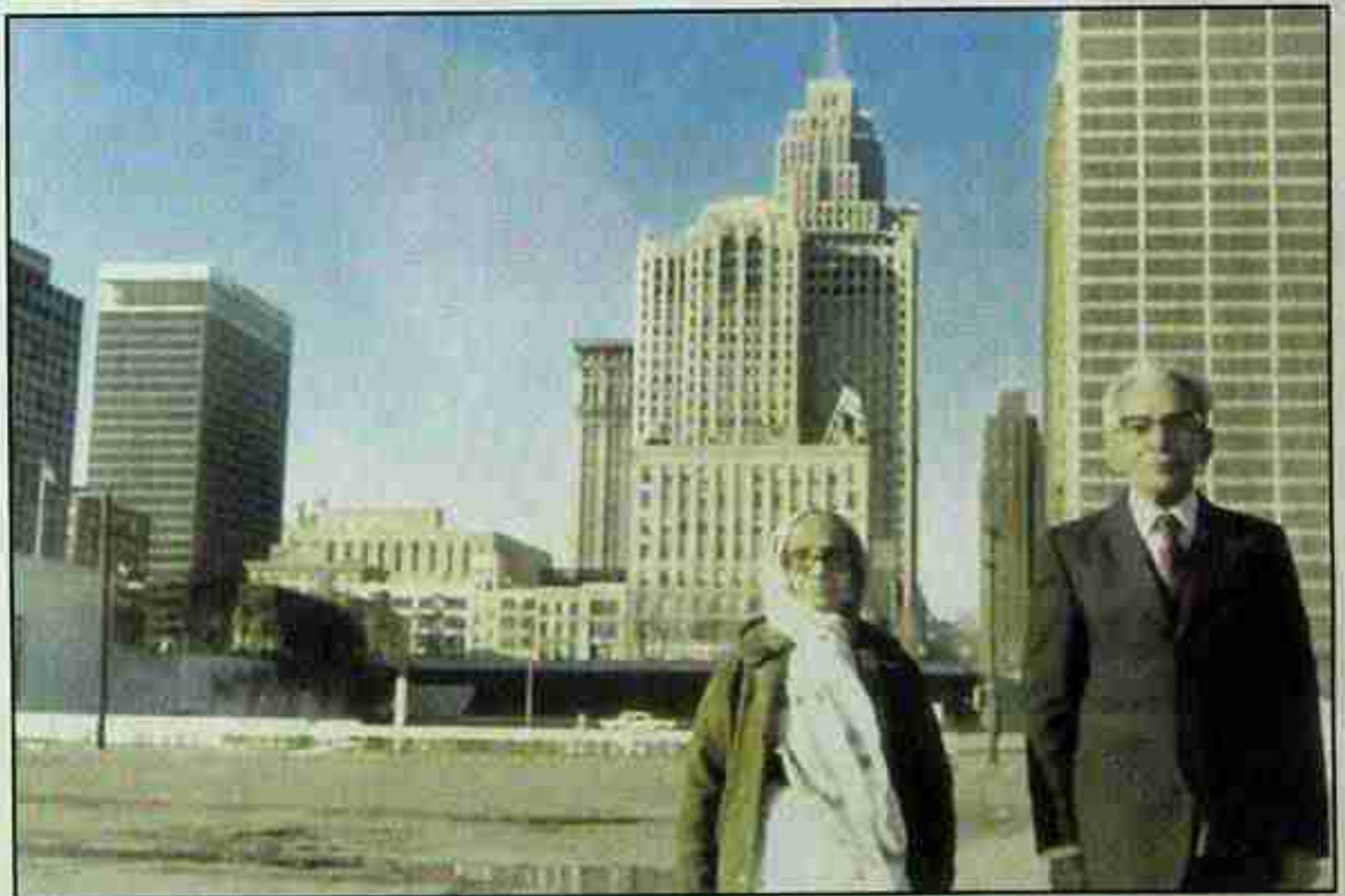
امّی اور ابا نیویارک میں

شیخپورہ میں ندی کا کنارا

شیخپورہ میں عید کی نماز کے بعد گلے ملتے ہوئے لوگ

چھوٹے بھیا (اسد احسن) اکارڈین بجاتے ہوئے

[illegible]

عدالت گنج میں حسین خاندان کی ڈیوڑھی [illegible]

عدالت گنج کوارٹر پٹنہ (بہار، ہندوستان) میں

شجر روشنی باتس کے پیڑوں کی پشت سے جھانکتا ہوا بنگلہ

اردول کا مکان جہاں میری امّی پیدا ہوئی تھیں

[illegible]

شیخپورہ کے بنگلے میں بچوں کے اسکول کا منظر
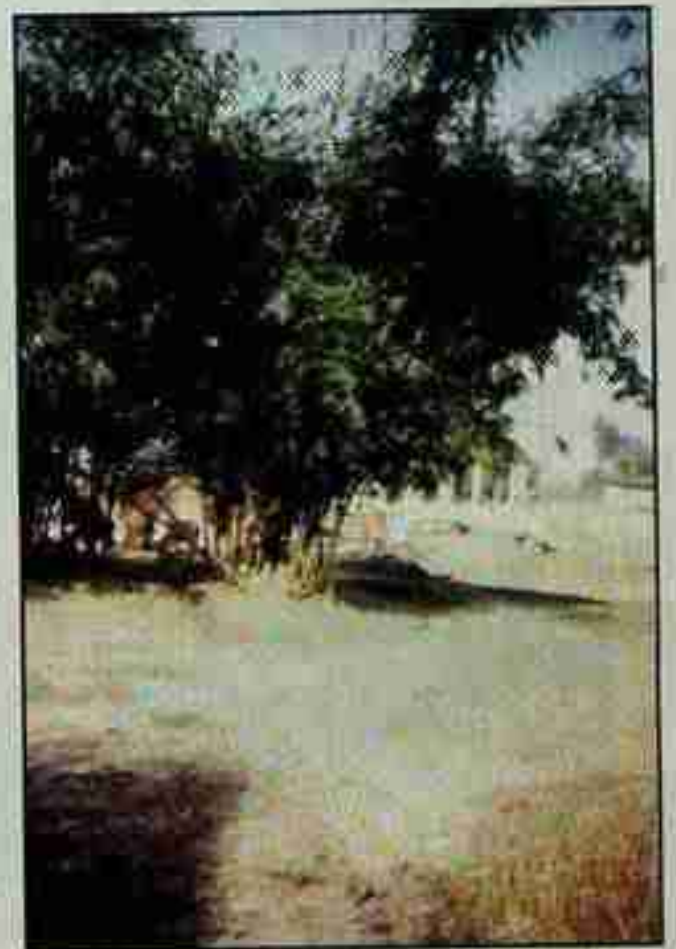
ڈاکٹر ستیہ پال آنند

حرفے چند

یہ کتاب بیتے کل کا فسانہ ہے، گزرے ہوئے ماضی کی داستان ہے۔ ایک ایسا فسانہ، ایک ایسی داستان جو خود نوشت سوانح حیات تو ہے ہی، ایک تہذیب کا المیہ ہے، ایک کلچر کے اختتام پذیر ہونے کی حسرت ناک کہانی ہے۔ اس کہانی میں بہت قریب سے دیکھے ہوئے ایک ہی خاندان کے لوگوں، ایک ہی قبیلے کی تین نسلوں کے افراد کے حوالے سے جو تصویر مترشح ہوتی ہے، وہ ایک پورے دور اور پورے علاقے کی نسل در نسل زندگی، ثقافتی رد و بدل، تہذیب و تربیت، منطقۂ ثقافت، مدنیت، شائستگی، زبان، بولی ٹھولی...... یعنی ایک مکمل چلتی پھرتی اور بولتی ہوئی زندگی کے ہزار، صد ہزار رنگوں کی آمیزش سے پیش ہوتی ہے۔ اس تصویر میں اپنے موئے قلم سے جس خاتون نے رنگ بھرے ہیں، اس کا بچپن، لڑکپن اور شروع جوانی ہندوستان کے صوبہ بہار کے جس مردم خیز خطے میں گزرے، اپنے قلب احساس کی ہر دھڑکن کے ساتھ، اس قدر حساس ڈھنگ سے اس خطے کی ثقافتی تہذیب مرتب کرنے کا کام آج تک شاید کسی اور اہلِ قلم نے نہیں کیا ہے۔ اسی لیے یہ خود نوشت سوانح حیات صرف صوفیہ انجم تاج کے بچپن، لڑکپن اور اوائلِ شباب کی داستان نہ ہو کر ایک پوری تہذیب کی داستان بن گئی ہے۔

حافظہ ایک مقدس ترین ورثہ ہے۔ اس پاک امانت کے خزانے سے خود نوشت سوانح نگار تفاصیل کا انتخاب کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کے تئیں بھی ایماندار رہتا ہے اور اپنے تئیں بھی۔ یعنی ''پدرم سلطان بود'' کے رویے کو ایک ہاتھ کی دوری پر رکھتا ہے۔ جو سوانح نگار اپنے اسلاف اور خاندان کے بارے میں دیانت داری نہیں برت سکتا، جو راست بازی،

بے تعصبی اور حسنِ سیرت سے کام لینے کے عمل میں کچھ تامل محسوس کرتا ہے، جسے اپنے بڑے بوڑھوں کی صرف مدح کرنا ہی آتی ہے، وہ کبھی حافظے کی مقدس امانت کو بجنسہٖ کاغذ پر سپردِ قلم نہیں کر سکتا، جس طرح اسے یہ امانت ملی تھی۔ اس لیے حافظے کے مقدس تر کے اور ورثے میں خیانت کرنا ایک نا قابلِ تلافی جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کچھ عظیم شخصیتوں کی خودنوشت سوانح حیات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے (مہاتما گاندھی اور فرانسیسی مفکر روسو، دو معتبر نام ہیں)، وہاں کچھ نام اس زمرے میں بھی آتے ہیں جس میں سوانح نگاروں پر دشمنی، لاف زنی، خودنمائی، ژاژ خائی کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے (کاسانوا کا نام رومان اور جنس پروری کی سطح پر لیا جا سکتا ہے)۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ راست بازی اور مورخ کی سی صداقت ہی کچھ ایسے پیمانے ہیں جن کو سوانح نگار کے بیان کی صداقت جانچنے کے لیے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مضمون اور متن کے انتخاب میں صوفیہ انجم تاج نے یہی مشکل راستہ اختیار کیا، یعنی اپنے حافظے پر انحصار کرتے ہوئے ان سب شخصیتوں اور ان سے متعلق حالات و حادثات پر مبنی یہ تذکرہ لکھا جو ان کے خاندان کے فرد تو تھے ہی، لیکن اس تہذیب کی علامت تھے جو اب آہستہ آہستہ ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ صوبہ بہار کے مسلمان اشرافیہ کی یہ تہذیب، کلچر گزشتہ صدی کی ساٹھ اور ستر کی دہائی تک تو زندہ تھے، لیکن اب کم کم ہیں اور آنے والے برسوں میں شاید بالکل ختم ہو جائیں گے۔

صوفیہ انجم تاج اس کتاب کو لکھتے ہوئے بیک وقت دو دنیاؤں میں سانس لیتی رہیں۔ کوئی کارے دیگر ممکن ہی نہیں تھا۔ ماضی اور حال میں یہ مفاہمت اور مطابقت کسی زمانے میں ورجینیا وولف نے اپنا شہرہ آفاق ناول To The Light House لکھتے ہوئے پیش کی تھی۔ جب لاشعور کی برقی روشعور پر اپنا دبیز پردہ ڈال کر اسے یوں ڈھک دیتی ہے کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ماضی کیا ہے اور حال کیا ہے۔ دونوں میں کہاں تفاوت ہے اور مطابقت۔ صوفیہ انجم تاج کے اپنے الفاظ میں تخلیقی قوت کی کارکردگی میں یہ ایک عجیب کیفیت ہے:

> ”مجھے ایسے لگا جیسے میرے اندر دو روحیں بستی ہوں۔ ایک وہ جو بچپن کی حسین یادوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی آج تک اسی زمانے میں رہ رہی ہے، جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ دوسری وہ ہے جو عصر حاضر کی بالغ عورت ہے، جس نے زندگی کے نشیب و فراز کو قدم بہ قدم چل کر طے کیا ہے۔

یہ دونوں روحیں آپس میں پرانی سہیلیوں کی طرح کئی باریوں گلے ملتی ہیں کہ یہ قیاس کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ بچپن کی معصوم اور کھلنڈری روح کون سی ہے اور آج کی تعلیم یافتہ، زمانہ شناس بالغ روح کون سی ہے:

میرے ماضی کی حسیں یادیں بہار لاتی ہیں
رات دن میرے لیے، شام و سحر میرے لیے
کھلکھلاتی لڑکیوں کی چوڑیوں کی کھن کھنن
ہیں وہی نغمے ابھی تک معتبر میرے لیے
میرے گھر کے ماہتابی لوگ رخصت ہو گئے
ہیں اندھیرے گھر کے سب دیوار و در میرے لیے

ان ہی ماہتابی لوگوں میں میری گوری نانی بھی تھیں......"

(گوری نانی)

بیانیہ کا یہ انداز نہ صرف خوبصورت ہے، اس میں وہ قوت بھی ہے جو قاری کو بیک وقت دو دنیاؤں میں سانس لینے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ قاری مصنفہ کی سانسوں میں رچ بس جاتا ہے اور وہی کیفیت محسوس کرتا ہے جو ان الفاظ کو تحریر کرتے ہوئے مصنفہ کے اعصاب پر طاری ہوئی ہوگی۔

صوفیہ انجم تاج بنیادی طور پر مصورہ ہیں۔ شاعرہ شاید وہ بعد میں ہیں، اس لیے اس تذکرہ نویسی کے عمل میں یادوں کے بل بوتے پر واقعات نگاری کرتے ہوئے الفاظ کے انتخاب میں شعر کا سا حسن، مصور کے موئے قلم سے تصویر کشی کرتے ہوئے در آیا ہے۔ اس عمل میں وہ قاری کے حواس خمسہ کے بھی پہلوؤں کو عمل براہونے کی دعوت دیتی ہیں۔ ایسے نقش و نگار تو کتاب کے ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ہیں لیکن قاری کی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسی باب سے گوری نانی کا چہرہ مہرہ دیکھیے:

''یہ سوچ ہی رہی تھی کہ پھر گوری نانی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آ گیا۔ ویسا ہی نورانی چہرہ۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ، سفید ساری، کھڑاؤں کی وہی مترنم آواز، آنچل سنوارتی ہوئی شگفتہ، شاداب اور پوری توانائی کے ساتھ میرے قریب آ گئیں۔''

یہاں تک تو ایک باصری پیکر ہے جو رنگوں سے مزین ہے:

نورانی چہرہ، سفید، شگفتہ، شاداب...... '' پھر اس میں قوتِ سامعہ کی آمیزش کی جاتی ہے، '' کھڑاؤں کی وہی مترنم آواز۔'' پھر اس ساکن تصویر کو حرکت دی جاتی ہے، '' آنچل سنوارتی ہوئی...... پوری توانائی کے ساتھ میرے قریب آ گئیں......''

اس کے بعد مصورہ شاعرہ اپنے تصویری شعری قالب میں احساس کی سطح پر اس پیکر کو ''محسوس'' کرتی ہے:

''ان کے نرم نرم اور ٹھنڈے سے آنچل نے میرے چہرے کو چھو لیا۔ ایک سیکنڈ کو میری آنکھیں بند ہو گئیں اور آنکھ کھلی تو میری نظر آنگن کی لہلہاتی ہوئی چنبیلی سے اٹک گئی۔ ایک ٹھنڈی سی ہوا چلی اور میں گوری نانی کے بارے میں دانستہ آنکھ بند کر کے سوچنے لگی۔ اور پھر نہ جانے کون کیا بول رہا تھا۔ میں تو اس منظر سے ہٹ کر دور کہیں اور تھی۔ اور پھر گوری نانی، جیسے میرے اور قریب آتی چلی گئیں۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں اور میں ان کے ہاتھ کے لمس سے سرشار ہوتی ہوئی ان سے لپٹ گئی......''

(گوری نانی)

یہ حسن بیانیہ میں تو اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ موجود ہے۔ شاعرہ کی اپنی شاعری کے تصویری نمونے اس پر مستزاد ہیں۔ یعنی موضوع، متن اور مضمون کی مناسبت سے جہاں کہیں بھی انھیں موزوں محسوس ہوا، انھوں نے یہ حوالے بیانیہ کی پیشانی پر افشاں کی طرح چسپاں کر دیے ہیں۔ اس طرح 'بین السطور' سے اپنے خاندان، اس کے افراد اور ان افراد کی عام فہم روزمرہ کی زندگی کی کارکردگی کے حوالہ جات سے ایک تمدن کی، ایک تہذیب کی تاریخ مرتب کی ہے۔ یہ شعری افشاں بیانیے کے ماتھے پر چمکتی ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے کہانی باتصویر ہو گئی ہے۔

یہ تہذیب کیا تھی؟ اس میں دادا دادی، نانا نانی، ماں باپ یا بڑے بزرگوں کا کیا رتبہ تھا؟ بہوؤں اور بیٹیوں کی کیا حیثیت تھی؟ بچے کس طرح پالے جاتے تھے؟ پوشاکیں کیا تھیں؟ عید، دیوالی، میلے ٹھیلے، کشتی کی سیر وغیرہ منائے جانے والے دن کیسے سج دھج کر مہمانوں کی طرح آتے تھے اور جاتے ہوئے اپنی ناقابلِ فراموش یادیں چھوڑ جاتے تھے۔ اس خاندان پر سیاسی حالات کا اثر کن حیلوں سے رونما ہوا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی، خصوصی طور پر ہندو مسلم تعلقات اور اس سلسلے میں مہاتما گاندھی کی آمد اور مصنفہ کے نانا کے گاندھی جی کے نام استقبالیہ ایڈریس کا ایک حصّہ اس سوانح حیات کو گزشتہ صدی کے ایک نہایت اہم حصّے کا ایک نہایت معتبر ماخذ بنا دیتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے تناظر میں مصنفہ کے نانا کے یہ الفاظ جو بجنسہٖ اسٹیج سے ادا کیے گئے، یاد رکھنے کے قابل ہیں:

> ''کچھ عرصہ قبل پنجاب کے آسمانِ سیاست پر بادل کا حصّہ ایک چھوٹا سا دھبہ دکھائی دیتا تھا، لیکن آج پورے ملک کا سیاسی آسمان بادلوں سے ڈھک گیا ہے۔ ایک زبردست طوفان منڈلا رہا ہے اور فرقہ وارانہ منافرت اور بدخواہی کی لہریں ہمارے اردگرد ضربیں لگا رہی ہیں۔ یہ لہریں کانگرس کے اس عظیم بیڑے کو لے ڈوبنے کے درپے ہیں جو ایک مدت سے فاتحانہ پیش قدمی کرتی آ رہی ہیں۔ یہ ایک عظیم قومی المیہ ہوگا اگر ہم ان لہروں کو اجازت دیں کہ وہ اس خوبصورت بیڑے کو نگل جائیں، جس کی تعمیر ہندوستان کے بہترین فرزندوں کی پیڑھی نے کی، اور جس کو اس نسل کے ہزاروں بہترین پھولوں نے مصائب جھیل کر واجب التعظیم بنایا۔''

(عدالت گنج)

میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ حافظہ ایک مقدس امانت ہے۔ مختلف مذاہب کی مقدس کتابیں جو رشیوں، منیوں، نبیوں اور اللہ کے بندوں کے اقوال زرّیں کو لے کر لکھی گئیں، وہ اکثر اوقات ان کے جانے کے بعد معرضِ تحریر میں لی گئیں اور ''آنکھوں دیکھی''، ''کانوں سُنی'' اور ''یادوں کو تازہ کر کے'' لکھی گئی تحریروں پر مبنی ہیں۔ اسی لیے ہندو ان مقدس کتابوں کو تین حصّے میں رکھ کر دیکھتے ہیں، یہ ہیں: ''ساکھشی'' (آنکھوں دیکھی)، ''شروت'' (کانوں سنی) اور ''سمرتی'' (یادوں کو مجتمع کر کے لکھی گئی)۔ صوفیہ انجم تاج کی سوانح تینوں طرح کے ماخذ کا ایک مرکب ہے۔ لیکن یہ مصنفہ کی ایمانداری کا کمال ہے کہ جہاں ''بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے'' کے برخلاف انھوں نے کچھ حاشیہ آرائی نہیں کی۔ لاف زنی

سے پرہیز کیا ہے۔ وہاں کچھ بھی مخفی نہیں رکھا۔ اگر کچھ واقعات و حالات ان باتوں سے پردہ اٹھاتے ہیں، جنھیں پڑھ کر ان کے اپنے خاندان کے افراد کی سبکی ہوتی ہو، تو بھی انھوں نے اپنے قلم کو روکا نہیں ہے۔ یہ ایک دہری صفت ہے۔

صوفیہ انجم تاج حافظے کی ''ایمانداری'' کے سہارے اس کتاب کی جملہ تفاصیل کو لکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ کچھ بڑھایا نہیں ہے، کچھ کم نہیں کیا ہے۔ بھرتی، استرکاری، حشو و زوائد کا خطرہ ان حالات میں ہمیشہ رہتا ہے جب مصنف اپنے خاندان کے بارے میں لکھ رہا ہو۔ صوفیہ انجم تاج اس سے صاف بچ کر نکل گئی ہیں۔ دوسری طرف ان واقعات سے گریز کرنے کا خطرہ بھی چیل کی طرح منڈلاتا رہتا ہے جس سے خاندان کی سبکی، سب وشتم یا آبروریزی ہوتی ہو۔ مصنفہ کا قلم احتیاط سے کام لیتا ہے، لیکن حقیقت کو ظاہر کرنے میں پیش پیش رہتا ہے۔

زیادہ نہ لکھتا ہوا میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ صوفیہ انجم تاج کی یہ کتاب تذکرہ نویسی اور خودنوشت سوانح کی کوائف نگاری یعنی باقیات نویسی کا وہ نمونہ ہے جو اردو میں 'نہیں' کے برابر ہے۔ مصنفہ ایمانداری سے اپنے بچپن اور لڑکپن کی یادوں کے جزدان کی گرہیں کھولتی چلی گئی ہیں اور جو کچھ بھی برآمد ہوا ہے، اسے بجنسہٖ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

—— (ڈاکٹر) ستیہ پال آنند

شعبۂ انگریزی، یونیورسٹی آف ڈسٹرکٹ آف کولمبیا

واشنگٹن ڈی سی (یو ایس اے)

۱۴ر مارچ ۲۰۰۳ء

مقصد الہ آبادی

انجم تاج اور ان کا فن

انجم تاج کو سب سے پہلے میں نے ایک شاعرہ کی حیثیت سے دیکھا۔ پھر ایک مصورہ کی حیثیت سے اور اب ایک مضمون نگار کی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں۔ گویا انھوں نے تین قسطوں میں اپنے آپ کو مجھ سے روشناس کرایا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ تینوں حیثیتوں میں ان کی شخصیت میں کہیں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ وہی نسوانی جذبات کی موثر ادائیگی، وہی اندازِ بیان کی شستگی وشائستگی، وہی پُرانی قدروں کی پاسداری، ہر چیز، ہر تخلیق میں کارفرما نظر آئے گی۔

ان کی نگارشات سے کوئی بھی شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ اپنے ماضی سے ایک لمحہ کے لیے بھی دور نہیں ہوتیں۔ یا یوں کہیے کہ ہونا نہیں چاہتیں۔ ان کی خوشی، ان کا اصل سرمایہ ہی ان کی ماضی کی خوش گوار یادیں ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی پینٹنگ جو میں نے دیکھیں، جو شعر میں نے سُنے یا جو بھی مضمون میں نے پڑھا، سب میں ہندوستان کے کسی دور افتادہ گاؤں کی تازہ ہوا کے جھونکے محسوس ہوئے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو آئی اور بے نام معصوم رشتوں کی پُر خلوص اپنائیت اور یگانگت کی جھلک دکھلائی دی۔

انجم تاج ان لوگوں میں نہیں جو ہجرت کرتے وقت اپنا سبھی اثاثہ لاد کر چلے آتے ہیں۔ یہ جتنا کچھ ہجرت کرتے وقت اپنے ساتھ لائی ہیں اس سے کہیں زیادہ اور کہیں بیش قیمت اثاثہ اپنے گاؤں میں چھوڑ کر آئی ہیں۔ اسی اثاثہ کی دیکھ بھال میں ہر وقت لگی رہتی ہیں۔ وہ اس اثاثہ کو چھوڑ کر آنے پر مجبور تھیں لیکن اس کی دیکھ بھال کرنے سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا۔ روحانی رشتوں کو ہجرت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ان بدقسمت مہاجرین کے زمرہ میں آتی ہیں جو ہجرت کرتے

وقت دو حصّوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک حصّہ جسم کے ساتھ رہتا ہے، دوسرا روح کے ساتھ کہیں دور، بہت دور اور انجم تاج اُسی دور، بہت دور والے علاقے میں اپنی معصوم یادوں کی قیادت میں اکثر گھومتی پھرتی رہتی ہیں اور اپنے دل کو بہلاتی رہتی ہیں۔ چونکہ میں خود مہاجرین کے اُسی زمرے میں آتا ہوں لہٰذا میں ان کے درد کو بہت اچھی طرح محسوس کرتا ہوں۔

ان کا طرزِ بیان سیدھا سادہ، کہیں کوئی پیچیدگی نہیں، نہ الفاظ میں، نہ خیال میں۔ زبان صاف ستھری، کہیں کہیں ہندوستان کے صوبۂ بہار کے دیہاتوں میں بولی جانے والی گفتگو بھی بر سبیلِ تذکرہ استعمال ہوئی ہے۔ ان کے کردار ہر قسم کی بناوٹ اور ریاکاری سے پاک۔ نمونہ کے لیے ''ذاکر'' سے نقل کردہ اقتباس ملاحظہ ہو جس کی چالاکی کا اظہار بھی کتنی معصومیت سے کیا گیا ہے۔ کچھ اور بھی اقتباسات نمونے کے طور پر پیش کر رہا ہوں جس سے انجم تاج کے فکر و فن اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

''نانی اماں نے بہت ساری باتوں سے اندازہ لگالیا کہ چھوٹی باجی خوش نہیں تھیں اور کیسے نہ اندازہ ہوتا، محبت کرنے والی آنکھیں تو دیواروں کے آر پار بھی دیکھ لیتی ہیں۔''

''ایک بیٹا ہے علاء الحق، جس کی شادی تو بڑے ارمان سے کیا مگر کیا بتائیں بہو ایسی آئی ہے کہ دن بھر میں کسی وقت بس ایک بار تھوڑا سا ماڑ اور چاول دے دیتی ہے...... اس کے بعد ایسا لگا کہ آگے مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا ہو۔ میں کانپ رہی تھی۔ مجھے میری گوری نانی اس قدر یاد آنے لگیں کہ میں تقریباً رونے ہی لگی...... یا اللہ! کبھی کبھی تو بدلہ اس قدر جلدی دے دیتا ہے۔''

(گوری نانی)

''نانا جی! آپ نا جانے ہیں کہ ہم کتنی کتنی رات سو نہ سکے کہ ای (یہ) امریکہ اور عراق کی لڑائی جو ہوئی تو کا (کیا) جانے میری تینوں باجی زندہ بھی ہیں کہ نہیں...... میں بتانے لگی کہ لڑائی امریکہ کی سرزمین پہ نہیں، عراق میں ہوئی تھی۔ لیکن میں یہ سوچنے لگی کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ چاہتا کیا ہے۔ پھر قریب قریب رو کر ہی کہنے لگے کہ باجی! ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ آپ لوگ جہاں بھی رہیے خیریت سے رہیے۔ مگر میرے پاس کوئی ایک بھی ریڈیو نہیں ہے جس سے آپ تینوں بہنوں کی خیریت ملے۔ اس لیے ایک ریڈیو ہم کو خرید دیجیے۔'' (ذاکر)

ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد ان کے لڑکے سبول بھائی پورے خاندان کو لے کر کلکتہ چلے گئے۔ ہائی کورٹ کی نوکری ختم تو کوارٹر بھی ختم۔ کہیں نہ کہیں تو جانا تھا۔ کہاں گئے؟ کس محلے میں، کس گلی میں؟ کسی کو کچھ خبر نہیں۔ زندگی میں ایسے لعل و گہر ملتے ہیں، مگر پھر ایسے بکھر جاتے ہیں کہ بس ان کی چمک دل میں محفوظ رہ جاتی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں ان ہی چمکتی ہوئی روشنیوں اور ان کی یادوں کے سہارے آگے بڑھتی رہتی ہوں۔"

(عدالت گنج)

"پٹنہ ایرپورٹ پر ہر شخص بیمار اور پریشان لگ رہا تھا۔ اتنے دن وطن سے باہر رہتے رہتے تندرست اور بشاش لوگوں کو دیکھنے کی نظر عادی ہو جاتی ہے، اس لیے اپنے غریب وطن کے لوگ سب کے سب مریض لگ رہے تھے جیسے ہر شخص فاقہ کر رہا ہوں۔ کھیت کھلیان جیسے بنجر ہوں۔"

(عدالت گنج)

"جس زمانے کی میں بات کر رہی ہوں، اس زمانے میں رنگ، نسل، زبان، مذہب دیکھے بغیر لوگ محبت کرتے تھے۔" (عدالت گنج)

انجم تاج کی تخلیقات ان کے پُرخلوص جذبات، شدتِ احساس اور تعلقِ خاطر کے وہ نازک آبگینے ہیں جن کی قدر کچھ وہی کر سکتا ہے، جس کا ضمیر خود ان اجزائے ترکیبی سے مرکب ہو۔ امریکہ یا ایسے کسی بھی کسی ترقی یافتہ ملک میں ہجرت کر کے آجانے اور صاحبانہ، یا نیم صاحبانہ زندگی جی کر مطمئن ہو جانے والے شاید انجم کی تخلیقات کی وہ پذیرائی نہ کر سکیں جس کی وہ مستحق ہیں۔ اس تیرِ نیم کش کی خلش کو محسوس کر پانا سب کے بس کی بات نہیں۔ بقولِ شاعر:

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

☆☆☆

ہاں یہ میں ہی ہوں

ہاں یہ میں ہی ہوں۔ میں ہی تو ہوں جو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں کہ میں ان حسین جگمگاتے ہوئے لمحوں کو قلم بند کروں، جن لمحوں نے مجھے ان ہستیوں سے ملنے کا شرف بخشا جو میرے شعور کی دنیا میں چاند تاروں سے کم نہیں ہیں۔ ان کی شفقت اور محبت کی مہکی مہکی، ٹھنڈی ٹھنڈی پھواروں سے میرا وجود ہمیشہ مہکا مہکا اور میری روح ہمیشہ ٹھنڈی رہتی ہے۔ ان ہستیوں کی باتوں کا دلکش لہجہ اپنی پنکھڑی جیسی انگلیوں سے مجھے ہمیشہ چھوتا ہے اور میرے اندر ہزاروں ہزار کرنوں کو جنم دیتا ہے۔ کبھی تو مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ اس دولت سے میرا دامن کیسے بھر گیا، لیکن یہ سچ ہے کہ اس بے رنگ فضا میں دھنک کے ساتوں رنگوں کی بوچھار مجھ پر ہر پل ہوتی رہتی ہے۔ جس وقت بھی چاہتی ہوں ان رنگوں سے خود کو بھگو لیتی ہوں اور اس انمول دولت کو سینے سے لگا لیتی ہوں۔ پھر مجھے اُٹھنے بیٹھنے میں بھی لذت ملتی ہے، چلنے پھرنے میں بھی آرام ملتا ہے، سونے جاگنے میں بھی سکون ملتا ہے، لکھنے پڑھنے میں بھی قوت اور توانائی ملتی ہے۔

آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی آج کل کی دنیا کو میں اپنے ان ہی تصورات اور تجربات کے حوالے کر دیتی ہوں۔ وہ اس کا سارا ملمع اُتار دیتے ہیں۔ اس کے میک اَپ کا سارا غازہ پاؤڈر دھو دیتے ہیں اور اس کا اصلی رنگ روپ میرے سامنے عیاں کر دیتے ہیں۔ میرے تصورات کی حسین پریوں کے سامنے، یہ دنیا بدصورت اور مکروہ لگنے لگتی ہے۔ میرے حسین تصورات اور تجربات کے نورانی آسمان پر چمکتے جھلملاتے ستارے، اپنے مخصوص انداز میں رقص کرتے ہوئے مجھے

محظوظ کرتے ہیں۔ ہنستے، گدگداتے ہیں اور مجھے ماضی کی جانی پہچانی سی آسودگی اور سکون کی لذت ملنے لگتی ہے۔ اور اسی وقت، ٹھیک اسی وقت، میرے خلوت کدۂ دل کے کسی گوشے سے وہی پیار میں ڈوبی ہوئی دلکش آواز فضا میں گونجنے لگتی ہے۔ میری آنکھیں بھر آتی ہیں لیکن میرا پورا وجود خوشی سے ناچنے لگتا ہے۔ میری آنکھیں بوسیدہ دیواروں کی ایک ایک اینٹ سے باتیں کر کے ان یادوں کو پھر سے تازہ کر لیتی ہیں۔

آج کل کی یہ جگمگاتی اور دولت سے لدی پھندی دنیا اپنا سر فخر سے اٹھا کر کھڑی تو ہے، لیکن اس کی چمک دمک میں نہ کوئی کشش ہے، نہ آسودگی، نہ لذت، نہ سرور۔ اس کی تیز روی میں دوڑتا، ہانپتا اور تھکاوٹ سے چور انسان کہتا تو ہے کہ وہ خوش ہے لیکن وہ خوش کہاں ہے؟ اس کی آنکھوں میں تو بے چینی ہے، اس کے ہونٹوں پہ تو افسردگی ہے، اس کے دل میں تو اضطراب ہے۔ وہ تو یوں چل رہا ہے جیسے سڑکوں پر انسان بے مقصد چلتا ہے۔ اسے رُک کر کسی سے پوچھنے کا وقت بھی نہیں ہے کہ تم کیسے ہو؟ کسی اور کی باتوں کو سننے کا وقت تو درکنار، اسے تو اپنے دل کی دھڑکنوں میں پوشیدہ آواز بھی سُنائی نہیں دیتی۔ اسے تو اتنی سی بات سمجھنے کا شعور بھی نہیں ہے کہ وہ کس سمت جا رہا ہے۔ اس کی منزل کہاں ہے۔

یہ خدا شناسی میں ناخدا شناسی کا دور ہے۔ آج کل جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھیے، لوگ قرآن کی ہی باتیں کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ درس کی نہ جانے کتنی محفلیں منعقد ہوتی نظر آتی ہیں۔ لیکن قرآن زبان پر ہے، دل میں نہیں ہے۔ لوگوں نے قرآن شریف کو کتابِ ہدایت سے ہٹا کر کتابِ ثواب بنا کر رکھ دیا ہے۔ سب سے بڑی چیز تو انسان کا اخلاق ہے۔ جس کے سہارے ہر چیز جیتی جا سکتی ہے۔ اخلاق اسلام کا خلاصہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کو پورے طور سے نظر انداز کر کے لوگ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اپنے appearance کو ایک نئی ترتیب دے کر معصوم بن جاتے ہیں، ہر فرض سے انجان بن جاتے ہیں اور زندگی کا جو سب سے پہلا فرض ہے اس کو بہ آسانی اٹھا کر پیچھے رکھ دیتے ہیں۔ اسلام کا خاص مقصد میں اپنے اس کمزور قلم سے کبھی نہ لکھ پاؤں گی مگر اتنا تو ضرور ہی کہوں گی کہ ہر انسان کی عملی زندگی سے اس کی باطنی سوچ کی ایک جھلک تو ضرور ہی مل جاتی ہے۔ کسی کے غم اور خوشی میں شریک ہو کر، اپنے فرائض کی پاس داری کرتا ہوا انسان زندگی بسر کرتے ہوئے بھی اپنے کاندھے پر کوئی بھی بوجھ نہیں محسوس کرے گا۔ وہ بہت ہی سکون سے زندگی میں اپنے قدموں کو اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب کی ساری باتوں سے واقف نہ ہو مگر کم از کم اس کی ذات سے کسی کو تکلیف تو نہ پہنچے گی۔ وہ بڑوں کو عزت تو دے گا، بچوں سے شفقت سے تو پیش آئے گا، اپنی مسکراہٹ اور قہقہوں سے کسی کے سینے میں

تازگی تو بھر دے گا۔

کسی کی ڈانٹ میں پیار کا پہلو تلاش کرنا اور یہ پہلو مل جائے تو ڈانٹ میں شیرینی کا مزا لے کر ڈانٹ پلانے والے کو میٹھی نگاہوں سے دیکھنا، کسی کی معصوم باتوں میں روحانی لطف حاصل کرنا، یہ شعور اب کہاں۔ اس شعور کی تعلیم مجھے بھی نہیں دی گئی۔ یہ شعور تو جیسے خود بہ خود چپکے چپکے میرے اندر آ گیا۔ میں کیا، میری ساری ہمجولیاں، محلّے کی چھوٹی بڑی سہیلیاں، اسکول کی ہندو مسلمان سب لڑکیوں کی گھٹّی گھٹّی میں ہی یہ شعور پیوست تھا۔ کوٹ کوٹ کر یہ تعلیم دے دی گئی تھی۔ ایسی تعلیم جو فطرت، مزاج اور میلان کا جزو بن کر رہ گئی تھی۔ وہ تو دنیا ہی دوسری تھی۔ اُس دنیا کے لوگ ہی دوسرے تھے۔ اس کا رنگ، اس کی خوشبو ہی دوسری تھی۔ شاید اُس وقت دنیا چوکور ہوا کرتی تھی۔ اب تو دنیا بھی گول، عقل بھی گول، فعل بھی گول، تعلیم تہذیب سب گول! ہم سب ایک طرح سے سوچتے تھے، ہنستے تھے، روتے تھے، گاتے تھے۔ بے فکر رہ کر بھی دوسروں کی فکر کرتے تھے۔ شام کے انتظار میں، لمبی لمبی گرمی والی دوپہر، بے چین کرنے والی دوپہر، خوشی خوشی گزارتے تھے۔ سورج کی تپش کم ہوتے ہی در و دیوار، آنگن، اُساروں کو ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے بھگوتے۔ گھر میں کام کرنے والی بوا، جو ہمیشہ میری نظروں میں کسی بھی ماں کے درجے سے کم نہ ہوتی تھی، اُس کے ساتھ مل کر کام کرتے، جھاڑو لگاتے، چولہوں میں آگ کو تاڑ کے پنکھوں سے ہوا دے دے کر لہکاتے، اسے سرخ کر دیتے اور ساتھ ساتھ اُس کی باتوں سے معصومیت کا مزہ لے لے کر خوب ہنستے، کھلکھلاتے۔ آنگن اور اُساروں کو بھگوتے وقت پوتنی سے گرتی ہوئی پانی کی ٹھنڈی ٹھنڈی ننھی ننھی بوندیں موتی بن جاتیں۔ مجھے اُن موتیوں کو چُننے کا شعور پیدا ہوا۔ اُن موتیوں کی بے بہا دولت نے مجھے ساری دنیا کی دولت سے بے نیاز، مستغنی اور بے پروا کر دیا۔ موتیوں کی یہ بے بہا دولت حاصل کر کے میرا وجود خود موتی بن کر جگمگانے لگا۔ ان کرنوں کی چمک میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ بن جاتی۔ میری روح کا تبسم میری زندگی کا قہقہہ بن جاتی۔ اور وقتی فکر، لمحاتی درد اور دُکھ کا حال تو یہ ہوتا جیسے میری زندگی کی لغت میں کسی صفحے پر کسی سطر میں بھی ان کا ذکر نہیں ہے۔ یہ میری زندگی میں قریب رہ کر بھی اجنبی رہے۔ یہ مجھ پر اثر انداز ہونے سے محروم رہے۔

دکھ درد اور خوشیوں کا ریلا تو قریب قریب ہر انسان کی زندگی میں آتا اور جاتا رہتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح زمین اپنے محور پر گھومتی چلی جا رہی ہے۔ فطرت کا نظام بھی اسی طرح، اسی گردش کے ساتھ ساتھ اپنا کام کیے جا رہا ہے۔ رات ہوتی ہے، پھر دن نکل آتا ہے۔ اسی طرح دکھ بھی زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ رخصت ہو جاتا ہے اور

سورج کی طرح پھر خوشیاں ناچتی ہوئی زندگی کو آراستہ کرنے لگتی ہے۔ لیکن انسان کی زندگی میں جب تلخیاں بھرنے لگتی ہیں یعنی کوئی افتاد پڑتی ہے تو وہ بکھرنے لگتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہی نہیں ہے کہ یہ اُس کے لیے متعین کر دیا گیا ہے۔ چاہے تو پیر جما کر کھڑے رہو یعنی گزرتی ہوئی زندگی کے ایک ایک لمحے سے فائدہ حاصل کرو یا پھر ہمت ہار کر پاش پاش ہو جاؤ۔

لیکن بکھر جانے میں کیا مزہ ہے۔ کیوں نہ انسان کسی چٹان کی صورت ایک جگہ پر مستقل کھڑا رہے۔ لہریں تڑپ تڑپ کر سر پٹکتی رہتی ہیں اور اپنا دم توڑتی رہتی ہیں، مگر چٹان اپنی جگہ پر ساکت کھڑی رہتی ہے۔ وہ یہی سوچتی ہے کہ مجھے ڈٹے رہنا ہے اور آخر کار آہستہ آہستہ پانی کی لہروں کا مزاج بدلنے لگتا ہے۔ اُس میں نرمی آنے لگتی ہے اور پھر وہ اپنی دھیمی دھیمی لہروں سے اس چٹان کو تھپکنے لگتا ہے۔ جتنی بھی مصیبت پڑے تلخیوں کو اپنے اندر بسانا نہیں چاہیے۔ ہر حالت میں اُسے خوشگوار ہی رہنا چاہیے۔ انجام تو سب کو پتہ ہے۔ کیوں نہ زندگی کو زندگی کی طرح جیئیں۔ گھٹ گھٹ کر جینے میں کیا مزہ۔

روم کا شہنشاہ Marcus Aurilius جو ایک فلسفی تھا، اس کی ایک سادہ سی کہی ہوئی بات:

''دنیا میں جتنی چیز خوبصورت ہے وہ اپنی ذات سے۔ اسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔
تعریف کسی کی زندگی کا جزو نہیں ہے۔ کوئی چیز نہ تعریف سے اچھی ہوتی ہے نہ خراب۔''

مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے بزرگ جو گزر چکے، وہ اپنی جگہ پر میری نظر میں میرے دل کے لیے ایسی ہستیاں تھیں جو مجھے سکون بخشتی تھیں۔ وہ اپنی اپنی جگہ پر خوبصورت ہستیاں تھیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتی ہوں کہ ان کے اندر کوئی خامی تھی ہی نہیں، لیکن ہم لوگ ان کی خامیوں کو جان کر بھی ان سے محبت کرتے تھے۔ ان کی خامیوں کو نظر انداز کر کے ان کے گرویدہ تھے۔ ہمارے تعریف کر دینے سے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کی تعریف کر دینے سے کوئی اچھا نہیں بن جاتا ہے۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی اچھے لگتے تھے۔ ہم ان کی خامیوں کو گنوانے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ میرے ذہن میں، خدا کا شکر ہے کہ اُن بزرگوں کی ساری اچھی باتیں ہی گردش کرتی رہتی ہیں۔ یوں بھی مجھے آج تک کسی کی نہ کوئی خامی یاد ہے اور نہ ہی میں نے کسی میں کوئی خامی دیکھی تھی۔ خامی کیا؟...... اگر خامیوں پر غور بھی کروں تو یہی خامی تھی کہ بڑی اماں یا نانی اماں کسی پر خفا ہوتیں تو بہت بہت دیر تک اس شخص پر خفا ہوتی رہتیں۔ لیکن اس کا ردِ عمل ہم پر یہ ہوتا تھا کہ ہم ہنسنے لگتے تھے اور سوچتے تھے کہ اللہ یہ کس قدر بولے جا رہی ہیں، ''اجی نانی اماں، اب چپ بھی ہو جائیے۔'' یہی خامی تھی اور کچھ بھی

نہیں۔

سعدی شیرازی کے شعر کا مصرعہ:

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

ہم اگر بزرگوں کی خطاؤں کو گنوانے لگیں تو خود ہی خطاؤں کے جال میں پھنس جائیں گے۔

میں نے جو محسوس کیا، میں نے ان میں جو خوبیاں دیکھی ہیں وہ میں بیان کرنے جارہی ہوں۔ جن خوبیوں کو اور جس حُسن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ چاہے میرے اپنوں میں ہوں یا غیروں میں ہوں، ان کی خوبیوں کو اور ان کے حُسن کو بیان کرنے کی ایک معمولی سی کوشش کی ہے۔

آج میں اس وسیع نئی دنیا کے دریچے میں کھڑی ہو کر باہر دور تک پھیلی ہوئی پُر فریب سفیدی میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتی ہوں سفیدی کے سامنے کھڑے رہنا میرا مقدر ہے اور نہ جانے مجھ جیسے کتنوں کا مقدر رہے۔

ایسے وقت میں میرے ماضی کا غیر فانی مقدر میرے سامنے مسکراتا ہوا آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس مقدر کے کبھی نہ غروب ہونے والے سورج کی کرنیں میرے قریب، میرے ارد گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ اپنے اندر کی قوسِ قزح کو برف کی سفیدی پر بکھیر دیتی ہوں اور ان سے دل نشیں، دل آویز، دلربا نقش و نگار کی تخلیق کرتی ہیں۔ پھر سامنے کا منظر فراموش ہو جاتا ہے۔ میری پچھلی توانائی واپس آ جاتی ہے۔ اس کا سرور مجھے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ میں حال کی بے چینیوں اور تلخیوں کو بھول جاتی ہوں۔ مجھے جینے کا نیا سلیقہ مل جاتا ہے۔ میں برش اٹھاتی ہوں اور نئے کینوس پر اپنے نئے تجربات کو منتقل کرنے لگتی ہوں یا قلم اُٹھا کر الفاظ کی لڑیوں سے رنگینیاں پرونے لگتی ہوں۔ پھر یہ برفیلی، بے جان، بے روح دنیا مجھے کہاں پاتی ہے؟ میں تخیل کے پَر لگا کر اُڑ جاتی ہوں۔ چڑیوں کے ساتھ چہکارنے لگتی ہوں۔ بلبلوں کے ساتھ گانے لگتی ہوں۔ بیلا چمبیلی کے پھولوں کے ساتھ مسکرانے لگتی ہوں۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے، خوشبوؤں کی موجیں اُٹھنے لگتی ہیں۔ میں تخلیق کے سمندر میں غوطے لگانے لگتی ہوں۔ سیپیوں میں موتی چُننے لگتی ہوں۔

ان عمیق گہرائیوں سے لعل و گہر برآمد ہونے لگتے ہیں، عمارتیں بننی شروع ہو جاتی ہیں۔ باغات کھلنے لگتے ہیں، گلزار لہلہانے لگتے ہیں۔ ان گلزاروں میں میرے ماضی کے مکان کے لوگ...... لوگوں کی پیار بھری باتیں، ان کے اشارے کنائے ایک بار پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔ تخیل کے اس گلزار میں ایک نیا گلزار اُبھرنے لگتا ہے، ایک جنت میں ہی دوسری

جنت تعمیر ہونے لگتی ہے۔ مٹی کی دیواریں، سونے کی دیواریں بن جاتی ہیں۔ سُرخ اینٹیں عقیق اور یاقوت بن جاتی ہیں۔ دروازے پر کچی زمین کی کچی مٹی افشاں بن جاتی ہے۔ میں قہقہہ لگاتی ہوئی اس میں کود پڑتی ہوں۔ سنہری افشاں میرے سر پر، میرے بدن پر، بکھرنے لگتی ہے۔ میں ایک سراپا سنہری پری بن جاتی ہوں۔ میں خود ہی اپنی تخلیق بن جاتی ہوں۔ میں خود ہی اپنا شاہکار بن جاتی ہوں۔

میں خود ہی اپنی غزل بن جاتی ہوں اور خود ہی گنگنانے لگتی ہوں:

خوں سے گل کا سنگار کرتی ہوں
میں خزاں کو بہار کرتی ہوں
پیار کا اک ذخیرہ ہے میرے پاس
میں یہی کاروبار کرتی ہوں

یہ ہے میری شاعری، میری نثر نگاری، میری مصوری کا خلاصہ اور اس کی روح! مجھے میرے پڑھنے والے اور کہیں تلاش نہ کریں، میں ان ہی سطروں میں ملوں گی۔ ان ہی سطروں کی بھٹی سے نکلی ہوئی غزلوں میں، نظموں میں، نثر پاروں میں ملوں گی۔ میری داخلی زندگی ان کے سوا اور کچھ نہیں! میری خارجی زندگی میں امریکہ ہے۔ امریکہ کی سجی سجائی زندگی ہے، گاڑیاں ہیں، مکان ہیں...... لیکن باطن میں، اپنے خمیر میں، اپنی اساس میں مجھے پانا ہو تو کوئی امریکہ کی زندگی میں نہ پا سکے گا!

میں اپنے ماضی کی خاک ہوں، اپنی ڈیوڑھی کی دھول ہوں۔ اپنے ماضی کے گزرے ہوئے لوگوں کی یادگار ہوں۔ اس نئے عہد کے لوگ، نئے دور کی آنکھوں سے، نئے زمانے کی عینک لگا کر مجھے ڈھونڈنا چاہیں گے تو......

"ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم۔"

☆☆☆

(۱)

پٹنہ سے شیخپورہ کی دوری تیس پینتیس میل سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ میرے گاؤں شیخپورہ (میرا ننھیال) جانے کے لیے پٹنہ سے بذریعہ ٹرین پہلے جہان آباد جانا ہوتا تھا۔ پھر وہاں سے شیخپورہ پانچ میل کی مسافت پر واقع ہے۔ لیکن وہ راستہ طے کرنا کارے دارد والا معاملہ تھا۔ یعنی وہ پانچ میل کا راستہ کچا ہوا کرتا تھا۔ وہ دھول اُڑاتی ہوئی کچی سڑک اب بھی مجھے یاد ہے۔ تھوڑی تھوڑی دوری پر چھوٹے چھوٹے گاؤں اور گاؤں میں بنی ہوئی جھونپڑیاں، سادگی میں غربت اور غربت میں سادگی کے نمونے۔ وہ سڑک اب بھی کچی ہے۔ اس مسافت کی دشواری اب بھی باقی ہے اور سادگی میں غربت اور غربت میں سادگی کے نمونے اب بھی جوں کے توں ہیں۔

جس طرح جنگل کے کسی خوبصورت پھول تک پہنچنے کے لیے پہلے کانٹوں اور جھاڑیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، بعین اسی طرح شیخپورہ پہنچنے کے لیے وہ راستہ! اُس وقت وہ راستہ طے کرنا بہت مشکل تھا، مگر تصور میں جب اُس پانچ میل کے سفر کو لاتی ہوں تو اُس راستے کی جھاڑیاں لعل بدخشاں کی طرح چمکنے لگتی ہیں اور اُس کچی سڑک کی ایک ایک ٹھیکری کو چوم لینے کو بے اختیار دل چاہنے لگتا ہے۔

اب سوچتی ہوں کہ یادوں کا ذخیرہ اس بیش بہا خزانے کی طرح ہے جسے جتنا خرچ کریں، اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یعنی یادوں کو بار بار مجتمع کر کے ان سے بچپن کی سہیلیوں کی طرح شوخ وشنگ لہجے میں گفتگو کرنا، چھیڑ چھاڑ کرنا، ان کو ذہن کے کونوں کھدروں سے نکال کر انھیں بانہوں میں بھر لینا...... اس خزانے کو ماضی کے ہیرے جواہرات سے بھر دیتا ہے۔

وہاں جانے کے لیے نہ کوئی ٹرین تھی نہ بس اور نہ رکشا۔ سوائے ٹم ٹم یا بیل گاڑی کے کوئی اور سواری جا ہی نہیں سکتی تھی۔ شاید ہی کبھی کسی کی جیپ نظر آ جاتی۔ اور اگر برسات کا موسم ہوتا تو وہ بھی نہیں۔ اس ٹم ٹم کی ہوش باش اور بیل گاڑی کی چوں چاں کے نغمے فضا میں کچھ اس طرح لہراتے کہ اسی دھن پر ہم لوگ بیل گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے جھومتے رہتے اور آنے والی منزل کی خوشیوں سے سرشار ہو جاتے۔

جہان آباد اسٹیشن سے قریب قریب بارہ ایک بجے دن میں ہم لوگ شیخپورہ جانے کے لیے بیل گاڑی پر سوار ہوتے تھے۔ اس لیے کہ صبح سات بجے والی ٹرین پٹنہ سے جہان آباد گیارہ بجے پہنچتی تھی۔ اور اس وقت اسٹیشن پر ایسا نفسا نفسی کا عالم ہوتا تھا کہ میں بوکھلا ہی جاتی تھی۔

اس وقت مجھے سوائے لوگوں کی پیٹھ کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ساتھ میں ایسی شدید گرمی، کہ خدا کی پناہ۔ اور شیخپورہ جانے کا موقع ملتا بھی تھا تو صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں۔ لیکن ایک بار ہم لوگ جب اس بیل گاڑی پر سوار ہو جاتے اور اس کچی سڑک پر اُتر جاتے تو بس ایک دوسری ہی دنیا دیکھنے کو ملتی تھی۔ کبھی کوئل کی کوکو، چڑیوں کی چہچہاہٹ، کبوتروں کی غٹرغوں میں پوری فضا کچھ اس طرح تحلیل ہو کر دل و دماغ کو سکون بخشتی کہ شہر کی گہما گہمی، بھاگ دوڑ اور گندگی کا جو دماغ پر اثر ہوتا وہ فوراً زائل ہو جاتا اور سکون کا ایک جادو بھرا نغمہ آبشار کی طرح بہہ کر دل و دماغ کو تر و تازہ کر دیتا۔ بس ایک دو مسافر پورے راستے میں اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے نظر آ جاتے۔ یا کبھی کوئی کسان اپنی لاٹھی پر ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا اور شہر والوں کی جدا ڈھب کو اپنی اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتا ہی رہتا۔ اور ہم لوگوں کی سواری کے آگے بڑھتے ہی اپنے کام میں لگ جاتا۔ جیسے جیسے گاؤں نزدیک آنے لگتا، کچھ جانی پہچانی شکلیں، گوالن یا پاسن نظر آتی تھیں اور وہ کچھ نہ کچھ بولتی ہوئی آگے نکل جاتیں...... ''اے ہو پٹنہ کا سواری ہے؟'' اور دھوپ کی شدت سے آنکھوں کو مچکا کر دیر تک دیکھتی رہتیں۔

بیل گاڑی اپنی دھیمی دھیمی خراماں خراماں شاہانی چال سے چوں چوں کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف گامزن رہتی۔ ہم لوگوں کے گھر پہنچنے کی بے چینی اور بیل گاڑی سے بے ساختہ کود جانے کی خواہش تیز سے تیز تر ہو جاتی۔ شیخپورہ پہنچنے سے پہلے ایک چھوٹا گاؤں پینجورہ آتا، اس کے بعد شیخپورہ آتا۔

اپنے گاؤں شیخپورہ کی پیچ دار گلیوں میں داخل ہوتے ہی ہم لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا تھا۔ دل تو اندر سے یہی چاہتا تھا کہ بیل گاڑی سے چھلانگ لگا کر کود جائیں اور سڑک پر ابا اور بھیا لوگوں کے ساتھ چلنے لگیں، مگر نہ تو امی اور ابا کی

اجازت ہوتی تھی، نہ خود ہی اتنی ہمت تھی کہ ایسا کر سکتی۔ اس لیے امی اور اپنی منجھلی بہن کے ساتھ بیل گاڑی ہی پر صبر کر کے بیٹھی رہتی۔ کسی کسی زمانے میں جب بڑی باجی پاکستان سے آتیں تو ساتھ میں وہ بھی ہوتیں۔ اور یہ سب میری بے قراری اور بے چینی کا مذاق اڑاتیں اور خوب ہنستیں۔ اور میں بیٹھی بیٹھی کروٹ پر کروٹ لیتی جاتی۔ ابا اور تینوں بھائی ہاتھ میں بندوق لیے کچی سڑک پر گاڑی بان سے گپ کرتے ہوئے سڑک پر چلتے رہتے۔ کبھی کبھی ابا تھک جاتے تو چلتے چلتے بیل گاڑی کو روک کر اس کے اگلے حصے پر بیٹھ جاتے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے کی جدید سہولیات کہاں میسر تھیں اُن دنوں؟ کوئی لاری، کوئی بس، کوئی کار، کوئی موٹر سائیکل تک نہیں تھی۔ گاؤں کے لوگوں نے تو صرف ان چیزوں کے نام ہی سُنے تھے، انھیں دیکھا نہیں تھا۔ اب سوچتی ہوں کہ آخر یہ سب سہولیات کس کے لیے ہیں؟ وقت کی بچت کے لیے؟ وقت کی بچت کس کے لیے ہے؟ اور پیسہ کمانے کے لیے؟ اور پیسہ کس لیے کمایا جاتا ہے؟ زیادہ عیش و عشرت کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے؟ وقت، وقت، وقت؟ آخر اس کا مصرف کیا ہے؟ ابا اور بھائیوں کا کچی سڑک پر بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنا، باتیں کرنا، موسم کی، فصل کی، قبیل داری کی...... کیا یہ وقت گزارنے کا طریقہ نہیں تھا؟ یقیناً تھا، اور ایک اچھا طریقہ تھا!

ہر سال ہی گرمی کی چھٹیوں میں ایک ماہ کے لیے ہم لوگ شخپورہ جاتے۔ میرے نانا نے بہت بڑا مکان بنوایا تھا۔ ایک باہر کا بنگلہ تھا، جہاں زیادہ تر ٹھکانہ مردوں کا ہوتا تھا۔ بنگلے کے باہر دو چوکی ہمیشہ لگی رہتی اور اس پر چاندنی بچھی رہتی اور گاؤ تکیہ لگے رہتے تھے جہاں ابا اور بھیا لوگوں کی شطرنج کی بازی ہمیشہ جمی رہتی، اور گاؤں کے سارے تماشہ بین اس چوکی کو چاروں طرف سے گھیرے رہتے تھے۔ پھر ایک زنان خانہ تھا جہاں ہم عورتیں اور ان کا گھریلو کاروبار تھا، دو یا تین عورتیں گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر مسلسل یا تو چاول یا گیہوں پھٹکتی رہتی تھیں یا جانتے پر تلخہ یا ستو پیستی رہتی تھیں۔ تین درا کی دیوار سے لگ کر ڈھیکی بنی ہوتی جہاں تین عورتیں مل کر دھان کوٹتیں۔ ڈھیکی کی ایک خاص آواز ہوتی اور پھر اسی ڈھیکی کی تال پر ان عورتوں کے گائے ہوئے گیت کے میٹھے میٹھے بول سے ایک ایسا سماں بندھ جاتا کہ ہر شخص کے چہرے پر مسکراہٹ کھِلنے لگتی۔

میرے نانا ایک بہت ہی شوقین آدمی مانے جاتے تھے۔ شخپورہ ہی میں گھر سے سو گز پر ایک بہت ہی بڑا آم کا باغ

لگوایا تھا جس میں قلمی آم کے ستر اسّی درخت تھے۔ زیادہ تر دودھیا مالدہ آم۔ لیکن اور بھی دوسری قسم کے آم، سیندور وا (سیندور)، لنگڑا، بیجو، سپیا وغیرہ وغیرہ سے پورا باغ بھرا ہوتا تھا۔ جہان آباد، اور دوسرے گاؤں میں کچھ لوگ شیخپورہ کا آم کہہ کر دوسری جگہ کا آم بیچتے تھے۔

بنگلے کے سامنے ایک چھوٹا سا تالاب بھی بنوایا گیا تھا جس میں ہر سال مچھلی کا زیرہ ڈالا جاتا تھا اور ہم لوگ تالاب سے لائی ہوئی تازہ مچھلیوں کو تل کر دیر تک کھاتے رہتے تھے۔ اسی تالاب کے ایک طرف چورما آم جو کہ پچھم کی طرف پڑتا تھا اور دوسری طرف کالا پہڑوا (کالا پہاڑ) آم، دکھن کی طرف جمنیا آم (جامن کے درخت کے پاس والا آم) ہوتا تھا اور وہیں پر ایک راستے پر والا آم بھی کہلاتا تھا۔

پٹنہ سے شیخپورہ یعنی ۳۵ میل جانے کی ایسی شاندار تیاری ہم لوگوں کے گھر میں ہوتی تھی کہ سب لوگ دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ قریب پندرہ بیس دن قبل ہی سے ابا اپنا Holdall کمرے کے ایک کنارے میں بچھا دیتے تھے اور ہم بھائی بہنوں کو فلاں فلاں سامان رکھنے کی ہدایت ملتی رہتی تھی۔ جس دن ہم لوگ پٹنہ سے روانہ ہونے لگتے تھے سارے رشتہ دار اور امی کی ملنے والیاں سب ملنے کو آتیں۔ ہم لوگ ساتھ میں شہری کھانے پینے کی بہت ساری چیزیں لے جاتے۔ امی کی دوست لوگ کچھ ساتھ کرنے کو سوغاتیں بھی لاتیں اور خدا حافظ کہہ کر لپٹ کر رو بھی لیتیں۔ صرف ایک ماہ کی جدائی ایسی کھلتی تھی۔ ساتھ میں نوکر، دائی سب گھریلو کام کار جاتے، یہاں تک کہ السیشین کتا، جس کا نام Tiger تھا، وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ جاتا۔ بس ایک ہنگامہ رہتا اور اسی ہنگامے میں اسی قافلے کے ساتھ اچھلتے کودتے ہوئے ہم بھی پہنچ جاتے۔ ہمیں تو ان دنوں کسی چیز کی جیسے خبر ہی نہیں رہتی تھی۔ ایک بہاؤ رہتا اور اسی بہاؤ میں، میں بھی بہتی چلی جاتی۔ اپنا نہ کوئی ارادہ نہ پلاننگ۔

ابا اپنی گرمی والی شیروانی اور ہاتھ میں لکڑی کی نہایت ہی نفیس چمکیلی چھڑی لے کر سفر کا آغاز کرتے۔ شیخپورہ کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں پہنچتے ہی وہاں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں نظر آتیں۔ ہر کوئی ابا کو "سلام بابو" "سلام بابو" کہتا۔ ابا اور بھیا سب لوگوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے۔ شیخپورہ میں محبوب عالم صاحب کی کوٹھی جب نظر آتی تو امی بیل گاڑی ہی میں بیٹھی بیٹھی اس لق و دق حویلی کے سارے لوگوں کو یاد کرتیں۔ ان لوگوں کی باتوں، عادتوں اور حرکتوں کا تذکرہ کرتی جاتیں۔ ان کے یک بیک اٹھ اٹھا کر پاکستان چلے جانے کا افسردہ قصہ سناتیں اور ہم سبھی بھائی بہن اس حویلی کی کائی سے بھری روتی ہوئی دیوار کو دیکھتے دیکھتے آگے بڑھتے رہتے۔ ایسے لگتا کہ لق و دق حویلی کی افسردہ دیواریں اور

محرابیں کسی کرب کی شدت سے نیلی پڑ گئی تھیں اور ہم لوگوں کی آوازوں اور پکاروں کو حسرت سے محسوس کرتی تھیں اور اسی اونچی نیچی خستہ دیواروں کے سائے سائے ہم لوگوں کی بیل گاڑی چوں چاں کرتی ہوئی خراماں خراماں چلتی رہتی۔ اسی حویلی کے سامنے سے ایک راستہ مڑ کر شیخوپورہ کی طرف جاتا۔ اس راستے کے دونوں طرف سرسوں کے پیلے پیلے پھول ایسے لہلہاتے تھے کہ ان کے جھومنے کی سرسراہٹ کی دھن اور فضا میں زرد پریوں کا رقص اب تک میری نظروں میں سمایا ہوا ہے۔

یہ وہی راستہ تھا جہاں سے نانا ابا کا بنوایا ہوا شاندار لال کھپرے سے بنی چھت والا بنگلہ ٹھیک سامنے نظر آتا تھا۔ ایک آم کے درخت کی شاخ ٹھیک اس سڑک پر خود کو محراب کی شکل میں ڈھال کر بنگلے کی شان کو اور بھی بڑھا دیتی تھی۔ اس جگہ پر پہنچ کر تو بس ایسا لگتا تھا کہ منزل آ گئی ہے۔ دونوں طرف سے سبز جھاڑیاں اور سرسوں کے کھیت کی زرد پریاں لہک لہک کر نغمہ سرا ہوتیں، اور دور سے ہی لال چھت والا بنگلہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا ہوا ہم لوگوں کا استقبال کرنے کو جیسے آگے بڑھ رہا ہوتا۔

ان لمحوں میں، جسم و جان میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی جیسے یہ بیل گاڑی اب چل ہی نہیں رہی ہو اور یہ چند قدموں کا راستہ ختم ہونے میں ہی نہ آ رہا ہو۔ جب بھی شیخوپورہ جاتی بالکل اسی طرح سے جاتی۔ سب کچھ ویسا ہی ہوتا، جیسے گزشتہ برس تھا۔ بالکل ویسے ہی احساسات اور جذبات سے دوچار ہوتی جن سے گزشتہ برس ہوئی تھی۔

یہ اس دوری کی کہانی ہے جسے میں کتنے برسوں سے بھوگ رہی ہوں۔ جب قریب تھی تو اس کی وہ قدر نہ تھی۔ انسان کے پاس جب دولت موجود رہتی ہے تو دل غنی رہتا ہے، عافیت رہتی ہے۔ جب دولت چھن جاتی ہے تو اس کی تلاش میں دیوانہ رہتا ہے۔ میں بھی دیوانی ہوں۔ پھولوں میں اب بھی خوشبو ہے لیکن اس خوشبو سے وہ زمین وابستہ نہیں ہے اس لیے اس خوشبو میں جو کیفیت تھی وہ اب نہیں ملتی۔ اب سو میل کی رفتار سے موٹروں میں ہم سفر کرتے ہیں، ہزار کیلومیٹر کی رفتار سے ہوائی جہاز پر تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن بیل گاڑی تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین پر کھسکتی رہتی۔ زمین کی خاک دھول جس سے ہمارا وجود تیار ہوا تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ وہ رشتہ اب نہ رہا۔ اس رشتہ کی پیاس اُس لذت کی طرف دوڑنا چاہتی ہے لیکن وہ تو بہت دور چلی گئی۔ فطرت جہاں سے چلی ہے اسی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ تو بدل چکی۔ اب کسی قیمت پر ہمیں نہیں مل سکتی۔ ناکامی کا یہ کرب آرٹ بنتا ہے۔ میں فن کی تعمیر کر رہی ہوں۔ تشنگی فن ہے۔ سیرابی فن نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ حقیقت ......اس حقیقت کو فنکار ہی محسوس کر سکتا ہے۔ غیر فنکار نہیں۔ زمین وہی

ہے، لیکن اب زمین اور ہمارے درمیان کنکریٹ سیمنٹ کولتار وغیرہ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ہم اس کے پس پردہ حسن کی تلاش کر رہے ہیں۔ وہ نہیں مل سکتا اس کے نہ ملنے ہی سے آرٹ کا سرچشمہ پھوٹنے لگتا ہے، اگر آسانی سے اس تک رسائی ہو جائے تو آرٹ وجود میں نہیں آ سکتا۔ جدائی فن پیدا کرتی ہے۔ قریب ہوتے ہی فن کا وجود ختم ہو جاتا ہے:

عالمِ سوز و ساز میں اصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

لیکن جب ۱۹۸۶ء میں پندرہ برس کے بعد اس راستے پر پہنچی جہاں سے بنگلہ نظر آنے لگتا تو آنکھوں میں ایک ایسا سیلاب اُمنڈ آیا کہ ہر چیز دھندلی ہو گئی۔ سامنے کھڑا بنگلہ بھی دھندلا ہو گیا اور ان در و دیوار سے وابستہ ساری کہانیاں، ساری یادیں، ساری حکایتیں یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگیں۔

سفید ساری میں لپٹا ہوا نانی اماں کا سراپا، ان کی مسکراہٹ، ان کی چیخ پکار، ڈانٹ ڈپٹ، سب یکے بعد دیگرے جیسے سامنے پردے پر آتے گئے۔ گاؤں کا ایک ایک فرد، جو کہ سگے سمبندھیوں سے بھی بڑھ کر ہوتا تھا، وہ سب نہ جانے اس بھری دنیا میں کہاں کہاں ہوں گے، سب یاد آنے لگے۔ میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو تو جیسے اپنے قابو ہی میں نہیں تھے، بہتے ہی رہے۔

ان ہی یادوں پر تو میری شاعری کا انحصار ہے۔ ان ہی دھاگوں کو پرو کر تو میں اپنے ماضی کی چادر ایسے ہی بُنتی رہتی ہوں، جیسے ایک ماہر جولاہا کھڈی پر کپڑا بُنتا ہے۔ میرے اشعار کی رگوں میں ان ہی مناظر کا خون دوڑ رہا ہے۔

وہ گھر کے لوگ، وہ معصوم سیدھے سادے لوگ
وہ ہنستے کھیلتے، شرماتے، مسکراتے لوگ
وہ صاف لوگ، وہ بے لوث لوگ، سچے لوگ
کہاں گئے وہ چمن کے بہار والے لوگ؟

نہ جانے کب ملیں، کس گھر میں، کس بچھونے میں
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں کونے کونے میں

امی اور ابا کے ساتھ جب شخپورہ جاتی تھی تو سفر کی تھکان جیسے ہوتی ہی نہیں تھی۔ وہ راستہ جس کے دونوں طرف کھیت ہوتے وہ پہلے تو چوڑا چکلا ہوتا مگر پھر آگے جا کر بالکل تنگ ہو جاتا۔ اتنا تنگ کہ بس بیل گاڑی کی ہی چوڑائی کے برابر، اور اس جگہ پر پہنچتے ہی میں کانپ جاتی۔ داہنی طرف نظیر بھیا (رشتے کے بھائی) کا بنگلہ تھا اور بائیں طرف ایک عورت کی مٹی کی جھونپڑی، جو ہر آنے والے کا استقبال کرنے کو جیسے کھڑی رہتی۔ پورے گاؤں میں اس کو بونگرا بہو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی جو ہم لوگوں کی ہم عمر تھی۔ بیل گاڑی کی چوں چاں کی آواز کو سن کر سب سے پہلے وہی اپنی جھونپڑی سے باہر نکل کر آتی اور مسکرانے لگتی۔ پھر تو محلے کے نہ جانے کتنے بچے ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ گاڑی کے پیچھے پیچھے چلتے، جب تک کہ ہم لوگوں کے گھر کی ڈیوڑھی نہ آ جاتی۔

ہم لوگ پھر خوشی خوشی اندر داخل ہوتے۔ ہمارے آنے کے لیے گھر کو کوئی پہلے سے ہی کھول کر رکھتا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے تو پورا گاؤں گھر کے اندر موجود ہوتا۔ پہنچتے ہی کچے آم کا امجھورا پینے کو ملتا جو ٹھنڈا اور مزے دار ہوتا تھا اور جس کو پیتے ہی جیسے ساری تکان دور ہو جاتی۔ طبیعت بالکل بشاش ہو جاتی۔ آم کا امجھورا اور پکا پکایا سارا کھانا لوگوں کے گھروں سے آ کر ہم سب کی ضیافت کے لیے موجود ہوتا۔ ہم سبھی بھائی بہن ہر کمرے اور برآمدے میں چہکتے پھرتے۔ گاؤں کے سارے لوگ اور رشتہ دار شام پڑنے تک گھر میں ہی رہتے اور ان کی معصوم اور پیاری پیاری باتوں سے ہم لوگ محظوظ ہوتے رہتے۔ ان کی باتوں اور نگاہوں سے اُبلتے ہوئے پیار محبت اور شفقت کے دھاروں سے شرابور گرمیوں کی چھٹیاں ایسے گزر جاتیں جیسے رنگین پھولوں اور اس ماحول کی خوشبوؤں میں رنگ برنگی اُڑتی ہوئی تتلیاں۔

آنکھ، کان، ناک، زبان، انگلیاں سب اس لذت سے محروم ہو گئیں۔ اب نہ تتلیاں ہیں نہ قوسِ قزح، نہ ست رنگ نہ ان سب سے پیدا ہونے والا ابہام، نہ دھوپ چھاؤں۔ اس یک رنگی میں وہ ابہام اور دھوپ چھاؤں کا تصورفن کا سرور پیدا کرتا ہے۔ اب زندگی سرور سے خالی ہے۔ وہ سرور فن کی تخلیق ہی میں میسر آ سکتا ہے۔ ہم اپنے پیمانہ تخیل ہی میں اس سرور کو حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ سرور بقدر پیمانۂ تخیل میں حاصل ہو سکتا ہے۔ جس کا پیمانہ جتنا بڑا، جتنا وسیع، اُتنا ہی سرور۔ میر تقی میرؔ اپنے وسیع پیمانۂ تخیل سے ایسا فن تخلیق کر گئے جو ان کی طرح ان کے پڑھنے والوں کو بھی اس شعر کی کیفیت میں ڈھال دیتا ہے:

دلِ پُر خوں کی ایک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

۱۹۸۶ء میں ہم شیخوپورہ گئے تھے تو چھوٹے بھائی جان، چھوٹی بھابی، باجی، امی اور میری ایک رشتے کی چچی سب ساتھ تھیں۔ گھر کے سامنے بیل گاڑی رُکی اور اس گاڑی سے اترتے ہی آنسوؤں کا ایک نہ تھمنے والا سیلاب تھا جو رواں دواں ہوتا۔ مراسنیں جو باہر کھڑی ہو کر ڈھول بجا بجا کر گیت گا رہی تھیں اور ہم لوگوں کا شاندار استقبال کر رہی تھیں۔ انھوں نے کچھ ایسا سماں باندھا ہوا تھا اور محبت کی ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں کہ میں اس کے نشے میں ڈوبتی ہی چلی گئی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی ساری عورتوں نے ہم لوگوں کو گھیر لیا۔ کوئی کھانا لا رہا ہے، کوئی پانی لا رہا ہے اور کوئی اپنے جسم کو لہرا لہرا کر کنوئیں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہم لوگوں کے ہاتھ منہ دھونے کو بھر رہا ہے۔ کس قدر سب کی سب خوش تھیں...... ہنس رہی تھیں اور جیسے کبھی نہ ختم ہونے والی کہانیاں سنا رہی تھیں! اپنے ایک ایک پل کا حساب دینے کی کوشش کر رہی تھیں اور میں...... میں تو بے بسی سے ان لوگوں کی طرف بس دیکھے ہی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی سکتے میں آجائے۔ جذبات کے ریلے میں جکڑا رہے، مگر زبان سے کچھ ادا نہ کر سکے۔ بس پچھلی یادوں کے سطحِ آب پر خود کو تیرتی ہوئی محسوس کرتی رہی۔ یہ جدائی، یہ نقل مکانی، جو کہ بہ ذاتِ خود ایک بہت مشکل کام ہے، انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ کتنی ساری نعمتوں سے دور کر دیتی ہیں۔ بے پناہ لذتوں سے محروم کر دیتی ہے۔

نانی اماں جو کہ اس گھر سے پہلے کراچی کے لیے روانہ ہوئیں، پھر اس دنیا سے چلی گئیں۔ ان کی سفید براق ساری کی کڑک اور اس پر ابرق کی چمک، جیسے کبھی تین دراسے جھلکیاں دکھاتیں، کبھی برآمدے اور کبھی تختی سے۔ ایسے لگتا کہ جیسے وہ اب کہیں سے نکل کر، آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے سامنے آجانے والی ہیں۔ رات میں جب آنگن کے بستر پر سونے کو لیٹی تو وہ سفید براق بچھی ہوئی چادر والی پلنگ اور سرہانے کی جوہی اور بیلے کی خوشبو نے مجھے تڑپا دیا۔ ساری باتیں یکے بعد دیگرے یاد آتی چلی گئیں۔ میں ان یادوں کے جالے میں پھنستی ہی چلی گئی اور میری آنکھوں سے نہ تھمنے والا آنسوؤں کا دریا بہتا رہا۔ نانی اماں کے بغیر تو اس گھر کو تصور میں لانا ہی نامکمل تھا اس لیے دل و دماغ میں ایک بے چینی پیدا ہونے لگی اور میں بے قرار ہو گئی۔ میری ایک نظم ''وہ میرے لوگ'' انھیں احساسات کی ترجمانی کرتی ہے:

وہ میرے لوگ

میری نگاہ کو بھاتی نہیں ہے اب کوئی شئے
نہ کوئی بزم نہ محفل نہ کوئی جام نہ مئے
نہ کوئی گیت نہ نغمہ نہ کوئی راگ نہ لَے
گزار دوں گی یہ دن دل نے کر لیا ہے طے

انھیں کی یادوں میں جو نور چہرے والے ہیں
وہ لوگ جو مرے گھر بار کے اجالے ہیں

وہ گھر کے لوگ وہ معصوم سیدھے سادے لوگ
وہ ہنستے کھیلتے شرماتے مسکراتے لوگ
وہ صاف لوگ وہ بے لوث لوگ سچے لوگ
کہاں گئے وہ چمن کے بہار والے لوگ

نہ جانے کب ملیں کس گھر میں کس بچھونے میں
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں کونے کونے میں

اُسارے طاق وہ بلی کی بانس کی وہ مہک
وہ چھپر اس پہ وہ کھپرے کی کھنکھناتی کھڑک
وہ چوکی اس پہ سیل پائی کی دیہاتی لہک
وہ لالٹین کی کمرے میں دھیمی دھیمی چمک

وہ گھر کے وضع کے پابند لوگ رہتے تھے
وہ لوگ کر کے دکھا دیتے تھے جو کہتے تھے

وہ پیاری دلہنیں گھٹنوں میں سر جھکائے ہوئے
وہ نوشے ہونٹوں کو رومال سے چھپائے ہوئے
میراثنوں کے دہن لونگ پان کھائے ہوئے
وہ بول گیت کے گرمائے لہلہائے ہوئے

ہر ایک بول میں گرمی کی بھاپ کیا کہنا
وہ تالی اور وہ ڈھولک کی تھاپ کیا کہنا

کسی طرف سے وہ آواز وہ پکار نہیں
کہیں بھی تیر محبت کا دل سے پار نہیں
کسی کا ہاتھ کسی کے گلے کا ہار نہیں
زباں پہ پیار کی باتیں ہیں دل میں پیار نہیں

کوئی بتاؤ وہ کھویا سکون پاؤں کہاں
کھڑی ہوں جانے کو کب سے بتاؤ جاؤں کہاں

کہاں سے دل کے لیے وہ سرورِ جاں لاؤں
وہ گفتگو وہ محبت بھری زباں لاؤں
وہ شبنمی لب و لہجہ کے رازداں لاؤں
کہاں سے چاند کہاں سے وہ کہکشاں لاؤں

میں اپنی شاعری سے کچھ تو کام کر جاؤں
بدل سکوں تو بدل دوں نہیں تو مر جاؤں

وہ زمانہ جب میں چھوٹی تھی اور امی ابا کا ساتھ ہوتا تھا تو گھر میں داخل ہوتے ہی گھر کا کونا کونا پانچ منٹ میں دیکھ لیتی ۔ایسے لگتا تھا جیسے گھر کی ہر ایک چیز بس ایک سال سے میرا ہی تو انتظار کر رہی تھی ۔ میں آ گئی اور گھر کا کونا کونا چہک اٹھا۔ جو گھر سال بھر سے بند تھا اور اداس تھا، ہم لوگوں کے آتے ہی جیسے خوش وخرم ہو گیا۔ آنگن کے پیڑ کی شاخیں خوشی کے مارے جھومنے لگتیں۔ بیلے کا درخت پانی ملتے ہی شاداب ہو جاتا۔ایک دو دن کے اندر ہی جیسے سفید پھولوں کی چھتری سی بن جاتی اور خوشبوؤں کا ریلا پیلا کونے کونے میں پھیل جاتا۔خودرو جنگلی جھاڑیوں کو، ہم بھائی بہن منٹوں میں ہی صاف کر دیتے اور آنگن کی سرخ اینٹیں چمکتی ہوئی نکل آتیں جسے کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے دھویا جاتا۔چوکیاں اور پلنگ جو سال بھر سے کمرے میں رکھ دی جاتی تھیں، انھیں آنگن میں نکال کر ٹھنڈے پانی سے دھویا جاتا۔ ہر چیز سے سوندھی مٹی کی خوشبو آتی اور تین چار گھنٹوں میں پورا گھر بس ایسا ہو جاتا کہ جیسے برسوں سے یہاں کوئی رہ رہا ہے۔نانی اماں کے پاکستان جانے سے پہلے تو اور بھی آسانی تھی۔بس اپنے آنے کی خبر دے دی اور وہ دروازے پر بیٹھی بیٹھی ہم لوگوں کا انتظار کرتی رہتیں۔کھانا پکا تیار، نہانے کا پانی تیار، سفید چادر پر سفید ہی تکیہ کے غلاف ہوتے اور تکیہ کے غلاف پر کشیدہ کاری کے ساتھ ساتھ شعر بھی ہوتا:

نرم یہ تکیہ سرہانے باعثِ عشرت رہے
سونے والا سو رہا ہو، جاگتی قسمت رہے

ان دنوں مجھے تکیے پر شعر لکھنا یا لکھوانا بہت بُرا لگتا تھا۔ بالکل گنوار پن لگتا تھا۔لیکن اب...... اب تو میں ان شعروں کی دیوانی ہوں اور اپنے تکیہ کے غلافوں پر قسم قسم کے اشعار لکھوانا پسند کرتی ہوں۔اب گنوار لوگ ہی مجھے پسند ہیں۔

جیسے جیسے شام سے رات ہوتی جاتی، اُن بستروں پر خنکی چھا جاتی۔نیند کے غلبے سے ذرا سا قبل بستر کے سرہانے ایک ہلکی سی آہٹ اور پھر ایک سرہانے میں جنبش ہوتی تو دیکھتے کہ ابا ہم لوگوں کے تکیے کے قریب بیلے کا پھول رکھ رہے ہیں۔اس آہٹ کو، اس بیلے کی خوشبو کو اور اس بستر کی سفید خنکی کو میں کیسے بھولوں؟

تصور میں جب ان خوشبوؤں کو محسوس کرتی ہوں تو اپنی آنکھوں کو دانستہ بند کر لیتی ہوں اور پھر چند لمحوں کے لیے ان ہی اُساروں، آنگنوں اور وہاں کی مٹی کی خوشبو، بیلے کی خوشبو، نانی اماں کی ہدایتوں، شفقتوں اور لہجوں کی شبنمی خنکی میں خود کو بھیگتا ہوا محسوس کرتی ہوں۔

یہ سب میں کرتی ہوں۔ کوئی ضروری نہیں کہ دوسرے لوگ بھی کریں۔ اگر لوگ اُس پیاس سے محروم ہیں تو یہ سیرابی اُن تک نہیں پہنچ سکتی۔ مگر میں امید کرتی ہوں کہ زمانہ جیسے مادی ترقی کے ارتقا کی طرف تیزی سے مائل پرواز ہے۔ یہ تیزی اس کو تھکا دیتی ہے اور تھکا رہی ہے۔ وہ آرام اور آسودگی کا آہستہ آہستہ خواہش مند ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی نا محسوس طریقے پر پھر جلدی ہی احساس کی چنگاری بھڑکنے لگے گی۔ بیتابی میں اضافہ ہونے لگے گا۔ اور وہ خواہش مند ہوگا کہ اپنی اصل خمیر کی طرف لوٹے، پھر آرٹ کی طلب اس میں آہستہ آہستہ انگڑائیاں لینے لگیں گی۔ پیاس بڑھنے لگے گی۔ اور یہ سطریں اس کی تسلی کا سامان بہم پہنچائیں گی۔ انسان اچھی خمیر سے بنا ہے اسے دور کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ کشش بہت دنوں تک مردہ نہ رہ سکے گی۔

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
مسافر یہ خلش دل سے بہ آسانی نہیں جاتی

اُس سفید چادر والے بستر پر، جس کے تکیے کے نیچے سے بیلے کے پھول رات بھر فضا میں لہراتی ہوئی خوشبوؤں کو بکھیرتے رہتے تھے۔ اُس بستر پر ایسی بے خبری کی نیند آتی تھی کہ اس کے بعد ویسی نیند کہیں کبھی نہیں آئی۔ اسی بستر پر سوتے سوتے صبح کی دھوپ کی ہلکی تپش پریشان کرتی تو ایک بار بس بستر سے اُچک کر کھڑی ہو جاتی۔

نانی اماں اگر کسی سے محبت کرتیں تو ہم لوگ انھیں مسکرا کر دیکھتے اور اگر نفرت کرتیں اور بگڑ کر بات کرتیں تب بھی ہم لوگ ہنس ہنس کر مزہ لیتے۔ نانی اماں کے چمکیلے پیتل کے بدھنے کو اگر ہم لوگ چھو بھی لیتے تو کہتیں، ''ہائے میرا بدھنا جل گیا۔'' اور پھر گھر کا ہر شخص ہنسنے لگتا تو کہتیں، ''ہائے ہنسو کا ہو (ہنستے کیا ہو)۔'' ایک کہانی سناتیں، ''سنو ایک مائے (ماں) تھیں اور ان کے بیٹا۔ تو بیٹا ماں سے بولے:

لال ٹٹو ہی ساری جھلکے
ٹھٹھا کریں اماں (مذاق کریں اماں)
کرو بیٹا......

ساگ میں شیروا (شوربا) اے خالہ

ان لمحوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی مجھے کراچی کا وہ سفر بھی یاد آنے لگتا تھا جب میں لندن سے نانی اماں اور اپنی

نانی اماں کی تصویر جو پاکستان جانے کے لیے پاسپورٹ بنوانے کے لیے کھنچوائی تھی

نانی اماں کراچی میں ہوش و حواس کھونے کے بعد

دونوں بہنوں سے ملنے کے لیے گئی تھی۔ وہاں ایک تو میری بڑی باجی تھیں جن کے شوہر شادی کے فوراً ہی بعد ان کو ہندوستان سے لے کر پاکستان چلے گئے اور پھر وہیں رہنے کا ارادہ کرلیا اور دوسرے میری خلیری بہن تھیں جن کو میں چھوٹی باجی کہتی ہوں۔ چھوٹی باجی کے پیدا ہوتے ہی میری خالہ دیہات میں ہیضے کی ایک دن کی بیماری میں بس آناً فاناً ختم ہوگئیں۔ میری امی پر تو بس ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن آخرکار خود ہی ہمت پیدا کر کے چھوٹی باجی کو پالا پوسا اور پھر شادی بیاہ کیا۔

نانی اماں بھی چھوٹی باجی کی ظاہری اور باطنی محبت میں جکڑ گئیں اور ساری زندگی ان پر جان چھڑکتی رہیں۔ مجھے وہ سفر یاد آنے لگا۔ نانی اماں کی ساری مجبوریاں، ان کی باتیں، مجھے شیخوپورہ کے اس اجڑے گھر میں تڑپاتی رہیں۔

میں وہیں پلنگ پر لیٹی رہی اور در و دیوار کی خستگی کو دیکھتی رہی جو مدت سے کسی لمس کی آرزو میں مضمحل اور اُداس اُداس سے تھے۔ آنگن میں نانی اماں کے لگائے ہوئے بیلے کا مضبوط درخت جو کبھی برآمدے کے ستون کو مضبوطی سے پکڑے رہتا تھا اور اپنی خوشبوؤں سے پورے گھر کو بسائے رکھتا تھا، وہ اب تک وہاں پر کچھ ہرے پتوں کو لیے کھڑا تو تھا، مگر اس کی وہ شادابی نہ جانے کہاں کھوگئی تھی۔ بیلے کی مہکتی شاداب کلیاں روز صبح و شام خود بہ خود جیسے شاخوں سے اُتر کر نانی اماں کے کانوں میں کھلنے لگتی تھیں۔ میں ان ہی یادوں سے الجھتی الجھتی اپنے خیالوں میں کراچی شہر چلی گئی جہاں نانی اماں ہجرت کرگئی تھیں۔ لیکن ان کی روح تو اسی سرزمین، اسی گھر اور اسی مکان میں موجود تھی۔ ان کے قدموں کی آہٹ ہر تھوڑی دیر پر مجھے جیسے چونکا دیتی، پھر مجھے احساس ہوتا کہ اس بار میں شیخوپورہ نانی اماں کی غیر موجودگی میں آئی ہوں۔

کراچی ایرپورٹ سے باجی کے گھر تک کا راستہ گرچہ صرف پانچ ہی میل تھا، مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ٹیکسی میں نہ جانے کتنے گھنٹوں سے بیٹھی ہوئی ہوں۔ یہ راستہ تو جیسے کٹتا ہی نہ تھا۔ گاڑی شوں شاں پوں پاں کرتی ہوئی بھاگتی ہی جا رہی تھی۔ چھوٹی باجی اور بڑی باجی کے بچے مجھ سے کرید کرید کر سوال کرتے جاتے اور میں...... میں تو اس وقت اپنے آپ کے لیے بھی ایک انجان سی شخصیت تھی۔ بھلا میں ان کے معصوم سوالوں کا جواب کیوں کر دے سکتی تھی! ان سوالوں کے جواب میں میرے پاس بس چند چھلکتے ہوئے قطرے آنسوؤں کے تھے اور کچھ بھی نہیں۔ اپنی ہی آواز جب حلق میں پھنس جاتی تو اپنے ہاتھوں سے چھوٹی باجی کی لڑکی مسرت کے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیتی۔ اور وہ سولہ سال کی مسرّت ان ہاتھوں کے دباؤ کو جیسے سمجھ بھی جاتی۔

خوشی کے آنسوؤں نے آج جان بوجھ کر اپنا باندھ توڑ ڈالا تھا اور اپنے ساتھ ساتھ میرے دل کی بچی بچائی طاقت کو بھی بہائے لیے جا رہے تھے۔ مسرت نے تو بھلا مجھے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ تین چار سال کی تھی جب چھوٹی باجی اسے اپنے ساتھ ہندوستان سے پاکستان لائیں اور اب تو یہ ماشاء اللہ جوان ہوگئی تھی۔ بڑی باجی کے سارے بچے پاکستان ہی میں پیدا ہوئے۔

مسرت مجھے مُنّی خالہ جان کہہ کہہ کر مجھ سے اس طرح چپکی ہوئی تھی جیسے نہ جانے مجھے کب سے جانتی ہو۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور بے ساختہ ہنسی کی پھوار اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ میرا غائبانہ تعارف کچھ اس انداز سے ہوا ہے کہ وہ میری ہر ادا کو جانتی ہو۔ مجھے اندر سے پہچانتی ہو۔ میں بھی تو اس سے بے حساب سوالات کرنا چاہتی تھی، مگر...... جذبات کی شدّت نے میری زبان کو گونگا کر دیا تھا۔ بڑی باجی کے بچوں میں بڑی باجی کی شباہت اور مسرّت کی شکل میں مجھے چھوٹی باجی کی جھلک ملی جسے میں خاموشی سے محسوس کر کے لطف لیتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ چھوٹی باجی کا چہرہ ابھرتا چلا گیا۔

کنوئیں پر بیٹھی ہوئی مارگو صابن سے منہ دھوتی ہوئی چھوٹی باجی مجھے کتنی پیاری لگتی تھیں۔ میں اکثر ان کے قریب جا کر کھڑی ہو جاتی اور انھیں غور سے دیکھتی رہتی۔ سوچتی رہتی کہ اللہ تعالیٰ نے چھوٹی باجی کو اتنا خوبصورت کیوں بنایا ہے۔ وہاں سے بھاگتی اس وقت جب وہ میرے منہ پر پانی کا چھینٹا مارتیں۔ بصد مشکل میں یہ پوچھ سکی، ''نانی اماں کیسی ہیں مسرت؟''

''مُنّی خالہ جان (میں اپنی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اس لیے مجھے مُنّی خالہ جان کہتی)، نانی اماں بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ مگر پہلے سے بہتر ہیں۔''

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ تو میں سمجھ ہی گئی تھی کہ چھوٹی باجی اپنے گھر گرہستی میں کافی مشغول رہتی ہوں گی اور اس کے بعد جو وقت ملتا ہوگا اس میں نانی اماں کی خدمت کرتی ہوں گی۔ نانی اماں کو یاد کر کے میری آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہوگئے۔ گرچہ وہ میری سوتیلی نانی تھیں مگر ہم سبھوں کو بے حد پیار کرتی تھیں۔ ہاں، جس انتہا تک وہ چھوٹی باجی کو مانتی تھیں اور ان کے بچوں کو، اتنا تو وہ دنیا میں کسی کو چاہ ہی نہیں سکتی تھیں۔ ایک اتھاہ پیار کا سمندر، نرالی چاہ...... بے غرض محبت...... میں کچھ سوچ کر مسکرانے

لگی تو مسرت نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا، ''منی خالہ جان، بس کچھ ہی دیر میں تو آپ ممی اور نانی اماں سے ملنے والی ہیں۔ اتنی بے چین نہ ہوں منی خالہ جان!'' اس نے تقریباً گا کر ہی کہا۔

ان ہی چند لمحوں میں مسرت نے جیسے میرے جذبات اور احساسات پر اچھی خاصی ریسرچ کر لی ہو۔ میں کوئی جواب نہ دے سکی اور سڑک کے ہنگاموں کو دیکھتے دیکھتے کہیں گم ہوگئی۔ نانی اماں سفید براق ساری میں جس پر ایک بھی شکن نہ تھی، میری نظروں کے سامنے کھڑی تھیں۔ پُر وقار چہرہ، بھاری بھر کم جسم، سانولی رنگت، رعب دار آواز اور ان کے ساتھ ساتھ اس آواز میں گھر کا گونجتا ہوا کونا کونا تک میری نظروں کے سامنے تھا۔ کوئی آواز آتی:

''بڑی بی بی، دیکھیے جدّو آم کے درخت پر ڈھیلا مار رہا ہے۔''

اور پھر نانی اماں اپنے مخصوص انداز میں باہر کی بھاری بھر کم کواڑ کی اوٹ میں کھڑی ہو جاتیں۔

''ارے یہ کون بے شرم ہے ذرا ادھر تو آ۔ پسیا (پاسی) سے تو کو (تم کو) پٹوا نا دیا تو میرا نام رعوفہ نہیں۔'' اور جو بھی ہوتا جان لے کر ایسا بھاگتا کہ مڑ کر پیچھے بھی نہ دیکھتا۔

اور پھر جن جن گھروں تک نانی اماں کی چیخ پکار جاتی وہ سب بھی اپنے اپنے گھروں سے نکل کر نانی اماں کے ساتھ ساتھ ویسے ہی چیختے، ''ارے کون ہے رے۔ پکڑو تو۔'' سب کی چیخ و پکار سن کر جب نانی اماں کو اطمینان ہوتا تو پھر واپس صحن کو طے کرتی ہوئی تین درا کے سامنے والی چارپائی پر، جو کہ ان کے بیٹھنے کی مخصوص جگہ تھی، بیٹھ کر جدّو کو دیر تک بُرا بھلا کہتیں۔

دوپہر کو جب میں باہر سے کھیل کر گھر میں داخل ہوتی تو نانی ماں اپنی خاص آواز میں ایک کے بعد دوسرے سوالوں کی بوچھار کر دیتیں، ''اس بھری دوپہر میں کہاں گیو (گئی) تھی جی؟''، ''یہ سر کے بال بھیگے کاہے ہیں؟''، ''اچھا تو آج پھر چندیا (چندہ) کے گھر سے جا کر نہا آئی۔ خدا جانے اُس جولاہن کے چاپے کے نل میں کیا خاص بات ہے کہ گھر کا کنواں چھوڑ کر وہاں نہانے کو جاتی ہے...... ٹھیک ہے، شام میں اپنے باوا جان کو بنگلے پر سے آنے دو۔ ہم انھیں کو تمرا (تمھارا) سارا قصہ سناویں گے۔''

میں سر جھکا کر ان کی ساری باتوں کو سنتی جاتی اور دعا کرتی کہ خدایا ان کے سوالات جلد ختم بھی ہوں اور میں یہاں سے بھاگوں۔ مگر نہ ان کے سوالات ختم ہوتے اور نہ میں وہاں کھڑی رہتی۔ جیسے جیسے ان سے دور بھاگتی، ان کی آواز بھی ہلکی

(کرسی پر) نانی اماں (بی رءوف) علی حسن بھیا کی بیگم پٹنہ میں

چھوٹی باجی (حمیدہ تمنا) شیخو روم میں اپنے بڑے لڑکے اظفر تمنا کے ساتھ

بڑی باجی (عاصمہ سراج)

ہوتی جاتی۔ میں وہاں سے بھاگی بھاگی چور کی طرح چھوٹی باجی کی پشت میں چھپ کر بیٹھ جاتی جو کشیدہ کاری میں مشغول تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائیں اور بڑی نرمی سے میری طرف مخاطب ہوئیں۔

''تم آج پھر وہاں کیوں گئی تھیں جبکہ اماں تمھیں منع کرتی ہیں؟'' اور میں جواب میں خاموش ہی رہی۔ نانی اماں کو چھوٹی باجی ''اماں'' کہتی تھیں۔ اس لیے کہ خالہ اماں کے فوت ہوتے ہی نانی اماں نے چھوٹی باجی کو اپنا بنالیا۔ ایسا اپنا بنایا کہ کوئی سگا بھی شاید اتنی محبت نہ کرتا جتنی نانی اماں نے چھوٹی باجی سے محبت کی۔ نانا ابا سے بیٹی کا غم برداشت نہ ہوا اور وہ خالہ اماں کو یاد کرتے کرتے اس دنیا سے چلے گئے۔

امی بتاتی ہیں کہ خالہ اماں تین درے کے پاس بچھی ہوئی پلنگ پر امی سے کہہ رہی تھیں کہ ان کے شوہر یعنی خالو ابا اب الگ مکان میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر خالہ اماں رونے لگیں اور امی سے بولیں، ''بو۔ بو، اگر ایسا میری زندگی میں ہوا تو اللہ مجھے اس کے بدلے موت دے دے۔'' اسی کے دوسرے روز خالہ اماں بہت بیمار ہوگئیں۔ دو چار قے ہوئی اور اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ نانی اماں اور امی کی زندگی جیسے ساکت ہوگئی۔ نانی اماں رات دن آنسو بہاتی رہیں۔ امی کی تو زندگی ہی جیسے ان سے روٹھ گئی۔ پیدا ہونے کے کچھ ہی دنوں کے بعد ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور اب صرف ایک بہن تھی جو بھری پُری دنیا میں تن تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ ساری زندگی گنگنانا چھوڑ دیا۔ گیت گانا بھول گئیں۔ زمانے کے بعد کسی کسی طرح سے بول یاد کر لیتی تھیں مگر سُر کھو گئے تھے۔ آواز بھاری ہوگئی تھی۔ جب کوشش کر کے بھی نہیں گا پاتیں تو فوراً بولتیں، ''بس بو بو کیا گئیں میرا گانا بجانا سب چلا گیا'' اور آہیں بھرنے لگتیں۔ چھوٹی باجی بے ماں کی بچی پر سب لوگ جان چھڑکنے لگے، خاص کر امی اور نانی کی جان تو اس بچی میں بسنے لگی۔

نانی اماں کی خالی گود نے چھوٹی باجی کو بھرپور طرح سے اپنے اندر سمولیا۔ اس گود نے خود بھی تسکین پائی اور چھوٹی باجی کو کبھی اپنی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ ہر لمحہ، ہر پل، نانی اماں کی جان چھوٹی باجی کے لیے حاضر رہتی۔ ایک انوکھے پیار اور والہانہ محبت کے سائے میں چھوٹی باجی پروان چڑھیں۔

میں اپنے کیے پر بدستور پشیمان رہی اور کوئی جواب نہ دے سکی۔ چھوٹی باجی مسکرائیں اور مجھے بچانے کی ترکیبیں سوچنے لگیں۔ پھر نانی اماں بولتے بولتے اسی سمت کو آنے لگیں۔

''آج تو ہم اس لڑکی کے باوا کو ضرور بتاویں گے۔ بھلا لڑکیوں کے ایسے ڈھنگ...... اے میرا کیا ہے...... ماں جانیں باپ

جائیں۔"

چھوٹی باجی ڈھال بن کر میرے سامنے بیٹھی رہیں اور نانی اماں میری موجودگی سے بے خبر رہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر چھوٹی باجی پر پڑی، نگاہوں نے ایک ہزار بلائیں لیں۔ قریب آئی بھی نہ تھیں کہ ہونٹوں نے بڑھ کر ان کی پیشانی چوم لی۔ چہرے پر جو اس قدر خفگی کے آثار تھے، ایکدم سے کہیں غائب ہو گئے۔ میں چھوٹی باجی کی پشت سے نانی اماں کو جھانک کر دیکھ رہی تھی اور حیران و پریشان تھی۔ اس کم عمری میں بھی محبت کے اس انوکھے جلوے کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک بے نظیر، لاجواب اور انمول کرشمے کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں تو جیسے سکتے میں آ گئی۔ اپنی آنکھوں پر جیسے یقین ہی نہ آ رہا ہو۔ پتھر موم بنا سامنے کھڑا تھا۔ بادل جو گرج رہا تھا، کسی کے اشارے پر جیسے یک بیک خاموش ہو جائے۔ چھوٹی باجی کی آنکھوں سے جیسے کوئی شعاع سفر کرتی ہوئی نانی اماں کے اردگرد چلی گئی ہو اور انھیں اپنی گرفت میں کچھ اس طرح جکڑ لیا ہو کہ نانی اماں جیسے بہہ گئیں اور انھیں خود بھی اس کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ کیونکر موم کی طرح پگھلتی چلی گئیں۔

محبت سے سرشار اور ڈوبی ہوئی آواز نے یہ سوال کیا، "ناشتہ کیو بٹیا؟"

"نہیں اماں بس ابھی ابھی جاتے ہیں!"

"بغیر ناشتہ کیے ہوئے تم کشیدہ کاری میں کاہے کو لگ گئیں؟"

'اماں، مجھے یہ تکیہ غلاف تو آج ہی پورا کرنا ہے۔ زیتون کی بارات کو اب صرف دو دن رہ گئے ہیں۔"

نانی اماں ان کی یہ بات سن کر بس تڑپ جاتیں۔ "بٹیا میری، تم کاہے کو ساری دنیا کے درد کو اپنے سینے سے لگاؤ ہو۔ ارے ان کی اپنی مائیں ہیں، بہنیں ہیں۔ خالائیں ہیں۔ شادی کا نگوڑا یہ اتنا کام کیا خود نہیں کر سکتیں؟ وہ لوگ بھی اچھی ہیں کہ تیری بے وقوفی سے خوب فائدہ اٹھاویں ہیں اور تو کو (تم کو) تو سمجھ میں بھی نہ آوے ہے۔"

"اماں ایسے مت بولو۔ ہم نے خود ہی ان سے یہ کام کرنے کو مانگے تھے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے مگر ناشتہ تو کر لو بٹیا۔ دیکھو یہ دن کہاں سے کہاں چلا جائے ہے اور تم ہو کہ باسی منھ دیدہ ریزی کیے جا رہی ہو!"

"اماں ہم ابھی فوراً آ رہے ہیں، آپ جائیے بھی تو۔"

اور نانی اماں خود کو سنبھالتی ہوئی باورچی خانے کی طرف اٹھ کر جانے لگیں، تب کہیں جا کر میری جان میں جان آتی۔ چھوٹی باجی مجھے اپنی پشت سے کھینچتی ہوئی سامنے لائیں اور بولیں، ''اگلی بار تم نے کوئی شرارت کی تو میں پھر تمھیں نہیں بچاؤں گی۔ جاؤ اپنی کتابیں نکالو اور میں ناشتہ کر کے تمھیں سبق دوں گی۔''

چھوٹی باجی ہی سے سارے لوگ پڑھتے۔ کشیدہ کاری سیکھتے۔ سلائی سیکھتے۔ کروشیہ سیکھتے۔ چھوٹی باجی ہی گھر کے سبھی بچوں کا نام رکھتیں۔ میرا نام انجم رکھا۔ خیر، میں تو بہت خوش ہوں کہ میرا نام چھوٹی باجی نے بہت اچھا رکھا۔ میری منجھلی بہن کا نام انھوں نے ''جھنا'' پیار سے رکھ دیا۔ امی کو، ابا کو، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا بلکہ امی تو فخر سے سب کو سناتیں کہ حمیدہ نے سب کا نام رکھا ہے۔ کون کس کو کیا پکارے گا۔ منّی خالہ جان، اچھی خالہ جان، دلہن نانی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب چھوٹی باجی ہی جانتیں۔ ان ہی کے فیصلے پر سب اپنا اپنا سر خم کر دیتے۔

اور ایک وہ دن بھی آیا جب چھوٹی باجی سرخ جوڑے میں بیلے اور چمبیلی کے پھولوں سے لدی پھندی دلہن بن کر نانی اماں کے سینے سے لپٹ کر روئیں۔ دولہا کے رومال، دلہن کے دوپٹے کے کونے سے باندھے گئے۔ رخصتی کا ہنگامہ ہوا۔ بستی کی عورتوں نے اور رشتہ داروں نے رو رو کے یہ گیت گائے:

بابل کا گھر چھوڑ کے گوری ہو گئی آج پرائی رے

ڈولا دیکھ کر جیرا ڈولے آنکھوں میں نیر بھر آئی رے

چھوٹی باجی کا وجود اپنوں کی جدائی کے تصور ہی سے کانپ اٹھا۔ ماں نے بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ اپنے لرزتے ہاتھوں سے بیٹی کے چہرے کو تھام کر پیشانی چومی۔ دعاؤں کے لیے لب ہلے مگر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی کہ آنکھوں سے بے ساختہ قطرے ڈھلکنے لگے اور سرخ جوڑے میں گم ہوتے گئے۔ بیتے ہوئے دنوں کی رنگینی، رعنائی، دلفریبی اور بے پایاں محبت اور ان کی حسین یادوں کو سنبھالے ہوئے چھوٹی باجی سسکتی ہوئی ڈولی پر سوار ہو گئیں۔

اب یہ منظر کہاں؟ یہ گرفت اب کہاں۔ یہ بندھن اب کہاں۔ چھوٹنے کا یہ خطرہ کہاں۔ جدائی کا یہ کرب کہاں۔ میں بھی کبھی کبھی اپنے وطن جاتی ہوں تو اپنے وطن کو اس شدت سے سینے سے لگانے کی خواہش کہاں ہوتی ہے؟ مادّے کی قوت نے ہمیں دبوچ رکھا ہے۔ اس کنکریٹ، سیمنٹ اور کولتار کی طرف ہم بھی جلد لوٹنا چاہتے ہیں۔ ہم مسحور ہیں۔ سحر زدہ

ہیں۔صیاد کی نگاہوں کا جادو ہمیں اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے، ہم بے بس ہو جاتے ہیں۔اب وہ رخصتی کا منظر کہاں۔آنسو کہاں اور قطروں کے جوڑے میں جذب ہونے کا منظر کہاں۔ہمیں وہ منظر یاد ہے اور اس کی لذت یاد ہے۔ان یادوں کو کسی نہ کسی اسلوب سے اظہار کرنے کی خواہش ہمیں قلم اور موقلم کو انگلیوں میں لینے کا موقع دیتا ہے تو بھولی ہوئی لذت سامنے آ جاتی ہے۔آنکھیں وہ منظر نہ پیش کر سکتی لیکن دل آہستہ آہستہ سسکیاں لینے لگتا ہے، اور تھوڑی دیر میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ہی دلہن ہیں اور ہم ہی امی جان سے اور آپا جان سے جدا ہو رہے ہیں۔کاغذ یا کینوس پر منتقل کرنے کے وقت ہم بھی وہ بن جاتے ہیں جو ہم اب نہیں ہیں۔آرٹ کا کام یہی ہے، شاعری کا کام یہی ہے، مصوری کا کام یہی ہے۔

چل اے ہمدم ذرا بزمِ طرب کی سیر بھی کر لیں
اگر امڈے گا دل چھپ کر کسی کونے میں رو لیں گے

تو ہم بھی اسی لیے لکھتے ہیں کہ دل اُمڈ آئے اور تھوڑی دیر کو رو کر دل ہلکا کر لیں۔

جن کے ایک اشارے پر آسمان سے کئی تارے توڑ لیے جاتے، جن کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ پر پھول برسنے لگتے، وہ اپنا گھر آنگن چھوڑ کر انجان لوگوں میں انجان در و دیوار کے بیچ زندگی بسر کرنے لگیں۔واجب، غیر واجب، سب دل کے اندر دفن تھے اور چہرے پر مسکراہٹ کی سجاوٹ تھی۔نانی اماں سے جدا ہونے کی تکلیف تو انھیں بہت تھی، مگر...... کسی نے نہ کبھی آنکھوں کی نمی، نہ چہرے کی افسردگی، نہ ماتھے کی شکن دیکھی۔سب نے چھوٹی باجی کا ہمیشہ مسکراتا یا خاموش سا چہرہ دیکھا۔مگر ان آنکھوں نے کسی کا راز کب پوشیدہ رکھا ہے؟ وہ آنکھیں، جنھوں نے دل آویز خواب دیکھے تھے، محبت اور شفقت کی شہہ پا کر آسمان میں اونچی اونچی اُڑانے لی تھیں، اسی اُڑان میں چمکیلے خنک بادلوں سے سرشار ہو کر اپنے اندر ایک ایسی چمک پیدا کی تھی کہ دیکھنے والا پلک جھپکائے بغیر تکتا ہی چلا جاتا تھا۔وہ روشن آنکھیں آج ایسی بجھی بجھی سی کیوں ہیں؟ تھکی تھکی سی کیوں ہیں؟ ان کی چمک کہاں چلی گئی؟ نانی اماں سے جدا ہو کر چھوٹی باجی کی وہ تازگی، آنکھوں کی چمک نہ جانے کہاں کھو گئی۔

زیادہ تر لوگوں کی طرح دولہا بھائی اور ان کے خاندان والوں نے بھی ہندوستان سے پاکستان جانے کا پکا ارادہ

کرلیا۔ چھوٹی باجی اپنے میکے والوں سے ملنے کو آئیں اور ایک بار پھر نانی اماں اور امّی کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ بیٹی کی جدائی کے تصور سے ہی نانی اماں کا کلیجہ منھ کو آنے لگا۔ ان کی تو دنیا ہی ان سے رخصت ہو رہی تھی۔ نقل مکانی تو یوں بھی کوئی آسان کام نہیں ہے مگر ہندوستان سے پاکستان چلے جانا اس وقت کچھ ایسا تھا جیسے سچ مچ کوئی ہمیشہ کے لیے ہی کسی سے جدا ہو رہا ہو۔ اور اب شاید کبھی نہ مل پائے گا۔

زندگی اور موت کا کیا بھروسہ! جانے اب میں اپنی لاڈلی کو دیکھ بھی پاؤں گی یا نہیں! ...... اور پھر نانی اماں نے بغیر چوں چرا کیے ہوئے مجبور ہو کر، ضبط سے کام لے کر، اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے دل کے قرار کو رخصت کیا۔ چھوٹی باجی کی دوسری لڑکی بہت ہی چھوٹی تھی۔ سب کو روتا دیکھ کر وہ بھی اپنی بوکھلائی نظروں سے کبھی سب کو دیکھتی اور کبھی مسکراتی اور کبھی ہاتھ مار مار کر چھوٹی باجی کی چوڑیوں سے کھیلنے لگتی۔

چھوٹی باجی کی روتی ہوئی آنکھوں کو تصور میں لا لا کر نانی اماں آنسو بہاتی رہتیں...... ہائے حمیدہ، پاکستان نا جانا چاہتی تھیں...... ہائے وہ بالکل خوش نا تھی ...... نانی اماں نے اور بھی بہت ساری باتوں سے اندازہ لگایا کہ چھوٹی باجی خوش نہیں تھیں۔ اور کیسے نہ اندازہ ہوتا؟ محبت کرنے والی آنکھیں تو دیواروں کے آر پار بھی دیکھ لیتی ہیں۔ بس کوئی اسی طرح کا خیال ستاتا تو ساری ساری رات نانی اماں بستر پر کروٹ بدلتیں اور آنسو بہاتیں۔

زندگی کے تقاضوں کو کب کون روک سکا ہے؟ رات سے سویرا بھی ہوا۔ شام بھیگ کر سرمئی بھی ہوئی۔ گھر کا کام ویسے ہی ہوتا رہا جیسے پہلے ہوتا تھا۔ نانی اماں نے مرچ کے اشٹو بھی پکائے۔ آم کے کچلے بھی بنائے۔ چھوٹی چھوٹی منتوں کو پورا ہونے پر رِحم اور ملیدہ بنوا کر درگاہ پر بھی گئیں۔ کئی منتیں بھی مانگیں مگر چہرہ مرجھا گیا۔ آنکھوں میں وہ چمک، آواز میں وہ کڑک باقی نہ رہی۔ چھوٹی باجی کو جانا ہی تھا سو وہ چلی گئیں۔ نانی اماں کھوئی کھوئی کچھ اس قدر رہنے لگیں کہ کہنا کچھ چاہتیں، کہہ جاتیں کچھ اور۔ جانا کہیں چاہتیں، چلی جاتیں کہیں اور۔

ہندوستان سے پاکستان جانے کے لیے پاسپورٹ بنا۔ ویزا لیا گیا اور نانی اماں اس نئے سفر کے لیے اپنے اندر پوری طاقت پیدا کر کے کھڑی ہو گئیں۔ چھوٹی باجی کے پاس جانے کے نام ہی سے آہستہ آہستہ ان میں نیا دم خم پیدا ہونے لگا۔ چہرے پر نئی تازگی، نئی شگفتگی کے رنگ آ گئے۔ اور آخر کار ایک دن، ہم سبھوں سے رخصت ہو کر نانی اماں پٹنہ سے دہلی اور دہلی سے کراچی کے لیے روانہ ہو گئیں۔ اپنا گھر بار، آم کا باغ، چوکی کی قالین، الماری پلنگ کرسیاں، گھڑا، بدھنا، لحاف،

چادریں...... نہ جانے کیا کیا کچھ چھوڑ کر چلی گئیں، جس کی ہر وقت حفاظت اور صفائی کے ہنگامے میں صبح سے شام کرتیں، کسی کی بے پناہ محبت کی تلاش میں بغیر سوچے ہوئے سب چھوڑ چھاڑ کر چل پڑیں۔ اسی کو سچی محبت کہتے ہیں۔ محبت میں ارادہ کس شے کا نام ہے۔ ارادہ تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا ہے۔ بس وہ اپنی دنیا، اپنی زندگی سے ملنے، پیچھے ساری چیزیں اور سارے لوگوں کو چھوڑ کر روانہ ہو گئیں۔

ٹیکسی جھٹکے کے ساتھ ایک مکان کے سامنے رُکی۔ مسرت بولی، ''منی خالہ جان، گھر آ گیا۔''

ہم بھی ٹیکسی سے اُتر کر گھر کی طرف جانے لگے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نظر چھوٹی باجی کی ساس پر پڑی۔ میں نے سلام کیا تو انھوں نے سر ہلا کر میرے سلام کا جواب دیا۔

مسرت زور سے چلائی، ''ممی ممی! منّی خالہ جان آ گئیں۔''

ایک کمرے سے چھوٹی باجی نکلتی ہوئی مجھے نظر آئیں۔ اپنی آنکھوں پر جیسے خود ہی یقین نہیں آیا۔ کیا یہ سچ مچ میری چھوٹی باجی ہیں؟ میں ان کی طرف بڑھی اور وہ میری طرف۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور پھر...... ساون بھادوں کی ایسی جھڑی لگی کہ اسے روکنا محال ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد چھوٹی باجی کی زبان سے یہ جملہ نکلا، ''دولہا نہیں آئے؟''

بغیر جواب دیے ہوئے میں نے پوچھا، ''نانی اماں کہاں ہیں؟''

مسرت شربت کا گلاس ٹرے پر لیے سامنے کھڑی تھی۔ چھوٹی باجی بولیں، ''پہلے شربت پی لو، اماں کے پاس ابھی لے چلتی ہوں۔'' لیکن میری نگاہیں چاروں طرف ان کو تلاش کرنے لگیں کہ میری پشت سے کسی کے کھسر پھسر، چپل گھسیٹ کر چلنے کی آواز سنائی دی۔ ایک نحیف آواز نے پوچھا، ''ارے کون آیا ہے رے؟''

مڑ کر دیکھا کہ ایک ہڈی کا ڈھانچہ، پکی زمین پر دونوں پیر موڑے بیٹھ کر چلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے میری سمت آ رہا ہے۔ میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ چھوٹی باجی کی جانب میری آنکھیں ایک سوال کرتی ہوئی اٹھیں اور انھوں نے اس کا جواب ہاں میں دے دیا۔

میرے قدم پتھر کے ہو گئے۔ ذہن جیسے مفلوج سا ہو گیا۔ اپنے جسم کی ساری طاقت صَرف کر کے وہاں سے اٹھی

اور اس ڈھانچے کو نانی اماں سمجھتے ہوئے لپٹ گئی۔ انھوں نے مجھے نہیں پہچانا اور کہنے لگیں، ''ارے کون ہو بابو؟''

''ارے یہ کون ہیں جی؟...... کہاں سے آئی ہو...... روؤ کا ہے ہو بابو (روتی کیوں ہو)؟''

چھوٹی باجی نے جلدی سے آکر مجھے سنبھالا اور بتایا کہ نانی اماں کے ایک پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور اسی کے بعد سے وہ اپنا ہوش و حواس بھی کھو بیٹھیں۔ میں رونے لگی۔

چھوٹی باجی کہنے لگیں، ''اماں آپ نے انجم کو پہچانا نہیں۔ انجم، خالہ اماں کی چھوٹی لڑکی، لندن سے آئی ہیں اماں۔ آپ سے ملنے کو!''

نانی اماں نے جواب دیا، ''مگر تم کون ہو بابو۔''

چھوٹی باجی لاجواب ہو گئیں۔ بے بس ہو کر وہ بھی بیٹھ گئیں اور نانی اماں بولتی رہیں۔

''مگر ہم کوئی انجم کو نا جانیں ہیں بابو۔'' پھر خود سے ہی اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو گھما گھما کر بات کرنے لگیں۔ ''ارے انجم کون؟ کون انجم؟ خالہ اماں کون؟'' اور پھر یہ شعر پڑھنے لگیں:

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا ہے یہی
دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

حال سے بالکل بے خبر، جیسے وہ آس پاس ہوں ہی نہیں اور ماضی کے سمندر میں کبھی غوطے لگا لیتیں، کبھی سمندر کی تہوں سے نکل کر اوپر آ جاتیں۔

اسی رات مسرت جو میرے ساتھ میرے بستر پر سونے جا رہی تھی، اس نے بتایا کہ نانی اماں کس طرح دالان سے آنگن میں گریں کہ ان کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ پہلے تو امی نے سمجھا کہ پیر میں موچ آ گئی ہے اور رات گئے تک تیل مالش کرنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن وہ درد نہیں گیا۔ ''امی اور ہم بھی بہت پریشان رہے منی خالہ جان! رات میں کسی طرح نانی اماں کو نیند آ گئی، مگر وہ اپنی تکلیف بتا نہیں سکیں اور اس کے بعد سے کبھی کھڑی نہیں ہو سکیں۔ اور پیر کو موڑ کر زمین میں کھسکتی رہیں اور نانی اماں کا یہ حال ہو گیا۔'' مسرت بلکنے لگی۔

میں نے اپنی گردن کو گھما کر اس کے چہرے کو دیکھا جس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں اور چہرہ چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ مسرت کو فوراً نیند آ گئی اور میری نیند کوسوں دور تھی۔ آج پہلی بار میں نے اپنے جسم میں اپنے خون کی

سرسراہٹ محسوس کی۔ کل رات یہی کائنات، جو متحرک ہو کر میری نظروں کے سامنے رقص کرتی پھرتی تھی، آج وہی کائنات ساکن اور منجمد تھی۔ صحن کی ہر شے بے جان اور بے معنی پتھر کی مانند کھڑی تھی۔ میں اپنی آنکھیں کھولے ہوئے آسمان کو تکتی رہی۔ ایک ستارہ جو کافی دیر سے ٹمٹمارہا تھا، ٹوٹ کر گرا۔ فضا میں ایک دردناک چیخ ابھری اور میرے کانوں سے ٹکرا کر کہیں غائب ہوگئی!

بیداری اور نیم بیداری کے اس عالم میں مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں بیک وقت تین الگ الگ دنیاؤں اور تین الگ الگ وقتوں میں جی رہی ہوں۔ اپنے بچپن اور لڑکپن کی دنیا...... چھٹ پن کا وہ وقت جب ننھیال ہمارے لیے مسرت اور شادمانی کا گہوارہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی امریکا جیسے ملک میں رہائش اور پھر وہاں سے واپس شیخوپورہ جا کر خستہ در و بام اور اُجڑے ہوئے کاشانوں کو دیکھ کر اشکبار ہو جانا، اور اب یہ تیسری دنیا اور تیسرے وقت کا ٹھہرا ہوا گدلا پانی جو میں نے کراچی میں آکر محسوس کیا۔ آخر ان تینوں دنیاؤں میں میری دنیا کون سی ہے؟ ان وقت کے تین دھاروں میں وہ دھارا کون سا ہے جس میں مجھے بہنا چاہیے۔ شاید یہ نظم میں نے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ہی لکھی تھی۔

اے ہم راز

یہ اجلی سی زمیں نظروں کی حد سے اور آگے تک
شجر پھیلے چلے جاتے ہیں اپنے قد سے آگے تک

میرے کمرے کی سب چنگاریاں شاخوں پہ چمکی ہیں
میرے بالوں پہ بکھری ہیں میرے آنچل سے کمٹی ہیں

سحر کی پھوٹتی کرنیں تڑپ آئیں دریچے سے
لپٹ کر کھیلتی ہیں میرے گھر کے فرش مخمل سے

تعیش کے ہر اک سامان پر ایک نور بکھرا ہے
یہ بے رنگی یہ ست رنگی دھنک کا جال پھیلا ہے

بہت آہستہ آہستہ میرے کانوں میں کہتی ہیں
بتا اب کیوں تیری آنکھیں مجھے بے جان لگتی ہیں

یہ کس کی فکر میں تم ہو یہ کس کی کھوج میں تم ہو
میں سمجھی اپنے ان گزرے دنوں کی سوچ ہی تم ہو

چلو ڈھونڈو انھیں اپنے خیالوں اپنے خوابوں میں
کہیں طاقوں پہ اب رکھی ہوئی پچھلی کتابوں میں

پیالی چائے کی ٹیبل پہ رکھ کر سر نگوں اٹھی
خیالوں اور خوابوں کی وہ دنیا ڈھونڈنے نکلی

وہ سوہا رنگ جس میں اماں میری ساری رنگتی تھیں
وہ افشاں ابرقوں کی جو ستاروں سی چمکتی تھیں

وہ مہندی جس کی سرخی سے کوئی سرخی نہ ملتی تھی
وہ مسّی جس سے بو بیلے چمیلی کی نکلتی تھی

میری ہم راز کرنیں تجھ کو میں اب کیسے سمجھاؤں
تیری آغوش کو ان خوشبوؤں سے کیسے مہکاؤں

یہ اجلی اور ٹھنڈی دھوپ میں پھیلی ہوئی شامیں
میں ان برفیلی شاخوں میں کہاں سے پھول لے آؤں

(۲)

گوری نانی کا میانہ قد، دبلی پتلی شباہت، چہرے پر مستقل کھیلتی ہوئی ایک مسکراہٹ، وہ ایک بے حد دلکش شخصیت کی مالک تھیں! گوری چٹی تو تھیں ہی، سفید ساری میں ملبوس رہتی تھیں۔ چشمے کی ایک سنہری کمانی ٹوٹ جانے کی وجہ سے دھاگا باندھا ہوا رہتا۔ میں نے درحقیقت اپنے ہوش سنبھالنے کے دنوں سے ہی ان کو ضعیف دیکھا اور پھر رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اور بھی ضعیف ہوتی گئیں۔

شیخپورہ ضلع جہان آباد، صوبہ بہار میں اپنے ننھیال کے آنگن میں کھڑی کھڑی میں جب گوری نانی کو اپنے گھر کی چھوٹی کھڑکی سے داخل ہوتے ہوئے دیکھتی تو بس دیکھتی ہی رہ جاتی۔ امّی سے کہتی، ''امی، یہ اپنے زمانے میں کس قدر حسین ہوں گی؟'' تو امی جواب دیتیں، ''یہ تو تھیں ہی حسین...... جو کہا جاتا ہے ایسی حسین تھیں کہ پان کھاتیں تو سرخ پان کی پیک گردن کے اوپر سے اُترتی نظر آتی۔''

ان کے لہجے کی نرمی، اپنے آپ کو وارتے ہوئے جذبے کے ساتھ ہم لوگوں کی طرف دیکھتی ہوئی آنکھیں کچھ ایسی ہوتیں کہ دل و دماغ، جذبات اور احساسات، سب کے سب پگھل جاتے اور سامنے کھڑا شخص نظر ہی نظر میں ان پر فدا ہو جاتا۔

ان جیسی حسین شخصیت تو مجھے جیسے پھر کبھی نظر ہی نہیں آئی۔ نہ تو میرے پاس اس وقت کوئی کیمرہ تھا اور نہ ہی میں

نے ان کا اس زمانے میں کوئی اسکیچ تیار کیا تھا۔ وہ تو بس میرے ذہن میں کچھ اس طرح سے بسی ہوئی ہیں کہ میں جب بھی چاہتی ہوں، آنکھیں بند کرکے ان کو دیکھ لیتی ہوں۔ ان کا گھر عین ہم لوگوں کے گھر کے پیچھے تھا۔ امی کی دور کے رشتے سے وہ چچی ہوتی تھیں۔ امی کے چچا کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں سال میں ایک ماہ کے لیے ایک بار ہم لوگ شہر پٹنہ سے شخپورہ جاتے تھے اور گوری نانی گیارہ مہینے اسی بستی میں، اسی مٹی اور لال کھپرے والے گھر میں رہ کر، ہم لوگوں کے شخپورہ آنے کا بے چینی سے انتظار کرتیں۔ جاڑے کی اندھیری راتوں میں گرمی کی لمبی لمبی دوپہروں کی ناقابل برداشت حدت اور طوالت کو کاٹ کر وہ بارہواں مہینہ آتا جب ہم لوگ شخپورہ جاتے۔ امی اور گوری نانی میں کچھ ایسی محبت تھی کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر ہم لوگوں کے پاس آجاتیں۔ ویسے بھی ان کے گھر میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اور بے چاری اتنی ساری مجبوریوں میں جکڑی ہوئی تھیں کہ وہ اپنے گھر میں ایک مجبور انسان کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔ ان کی صرف ایک اولاد تھی، بیٹا جن کا نام سید محمد قیوم تھا۔ بیٹے کو بہت ہی لاڈ اور پیار سے پالا تھا۔ ہم لوگ ان کو قیوم ماموں کہتے تھے۔ وہ جب چھوٹے ہی تھے تو گوری نانی بیوہ ہو گئی تھیں اور گھر میں اللہ کا دیا اتنا کچھ تھا کہ اسی میں انھوں نے بیٹے کو پال پوس لیا تھا۔ خدا کا فضل تھا کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑی۔

قیوم ماموں نے بس مذہبی تعلیم پائی تھی اور بستی کے لوگوں کا علاج دعا اور گنڈہ تعویذ کرتے تھے۔ کھیت کھلیان سے جو کچھ اناج آتا تھا اسی پر گزر بسر ہوتی تھی۔ کسی کے لیے دعا، تعویذ یا دیسی علاج کیا تو لوگ مرغا وغیرہ اکثر لاکر پہنچا دیتے تھے یا قیوم ماموں کہتے تھے کہ آج چیونٹیوں کو ایک سیر چینی کھلانا ہے تب ہی ٹھیک ہو سکو گے۔ یا کوئی مراد پوری ہو گئی تو چلو ایک یا دو سیر چینی پھر آ گئی۔ ان باتوں کی خبر کسی نہ کسی طرح ہم لوگوں کو مل ہی جاتی تھی۔

قیوم ماموں کی شادی کی عمر ہو گئی تو گوری نانی اپنے اُس فرض سے بھی سبک دوش ہو گئیں۔ بہو کے آنے کے بعد گوری نانی اور زیادہ مسکرانے لگیں۔ خوشی سے نہال و نہال رہنے لگیں۔ سرخ چھاپے کی ساری میں لپٹی ہوئی بہو کا پیکر دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سما رہی تھیں۔ مگر آہستہ آہستہ ان پر یہ بھی سچائی کھلتی گئی کہ بہو اپنا کچھ ایسا مزاج لے کر آئی ہیں جو کہ گوری نانی کے مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ بات بس بگڑتی چلی گئی اور آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک آ گئی کہ بوڑھی ساس کو کھانے یا ناشتے کے وقت بھی نہیں پکارا جانے لگا۔ اور گوری نانی نہ جانے کتنی راتیں بغیر کھانا کھائے ہوئے، بھوکی پیاسی سو جاتیں۔ کبھی کبھی بستی کے لوگ اپنے گھر بلا کر کھانا یا ناشتہ کھلا دیتے۔ اور کبھی کبھی پوتیوں کو رحم آتا تو کسی طرح کھانا لے جا کر رکھ

دیتیں۔ قیوم ماموں کی لڑکیاں بڑی تھیں اور اکلوتا لڑکا سب سے چھوٹا تھا۔ اس کا نام علاء الحق تھا۔ قیوم ماموں ہر وقت کسی نہ کسی کام کے لیے اس کو پکارتے رہتے تھے۔ ان کے پکارنے کا ایک خاص انداز تھا اور اس پکار کی آواز ہم لوگوں کے آنگن میں آتی رہتی تھی۔ آج تک یہ سوچ کر دل پاش پاش ہونے لگتا ہے کہ اس نازک سی ہستی گوری نانی پر کیسے کیسے ظلم ہوتے تھے۔ کیسی کیسی مجبوریوں کو گلے لگا کر، بیٹے کے رہتے ہوئے بھی وہ ننھی سی جان ظلم و ستم سہہ رہی تھیں۔ بستی کے لوگ بہو اور بیٹے کے رہتے ہوئے بیچ بچاؤ کیوں کرتے؟

گوری نانی میری امی کو رقّی (رابعہ) کہہ کہہ کر بڑے پیار سے بلاتیں۔ وہ جب بھی ہم لوگوں کے یہاں آتیں تو چھوٹی کھڑکی (چھوٹے دروازے) سے جھک جھک کر آتیں۔ دروازے کی کنڈی بھی اسی نزاکت سے آواز کرتی جیسی وہ خود نازک تھیں۔ پھر کنڈی کی ہلکی سی آواز کے بعد آہستہ آہستہ ان کے کھڑاؤں کی آواز آتی۔ ہم بھی دوڑتے، ''امی امی گوری نانی آگئیں۔'' گھر میں داخل ہوتے ہی کہتیں، ''ارے رقّی کہاں ہو بابو؟'' امی ہمیشہ ان سے پہلا سوال کرتیں کہ ''ناشتہ کھایو (کھایا) چچی؟'' کبھی یہ نہیں کہتیں کہ نہیں کھایا ہے۔ بس خاموش ہو جاتیں اور پھر آنسو کی ایسی لڑی بندھ جاتی کہ گوری نانی کے ساتھ ساتھ امی کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگتے۔ امی جلدی جلدی ناشتہ نکالتیں اور ان کے آنسوؤں کو اپنے آنچل میں جذب کر لیتیں۔

گوری نانی تقریباً ہر گھر میں بے آگ جلنے والی بڑی بوڑھیوں میں تھیں۔ ان کی تپتی تپاتی زندگی ایک انگیٹھی ہوتی جس سے سب کو حرارت ملتی۔ غیر محسوس طور پر ایسے کردار گھر کا چاند ہوتی تھیں۔ ہلکی روشنی حرارت، ٹھنڈک اور آسودگی پیدا کرنے والی ہر گھر کی نعمت، برکت اور رحمت، ان کا اٹھنا برکت کا اٹھ جانا ہوتا۔ گویا سر سے آنچل گر گیا۔ یا سایہ گزر گیا، ٹھنڈک چلی گئی۔ ایک ذات پورے گھر کو بھر دیتی۔ ایسا مرکز ہوتی جس کی طرف سب مرکوز ہوتے۔ ایسا کھونٹا ہوتی جس سے سب بندھے ہوتے۔ ایسی تسبیح ہوتے جس میں سینکڑوں دانے گندھے ہوتے بس:

ٹوٹی تسبیح بکھر گئے دانے

بس گھر بکھر جاتا۔ گوند ختم ہو جاتا اور زندگی ورق ورق الگ اور منتشر ہو جاتی۔ گوری نانی کی زندگی کا یہ آخری منظر مجھے اکثر تڑپاتا ہے۔ میں اپنی آنکھوں کو بند کر کے اپنی گوری نانی کو آنگن کے اس مٹی کے چولھے کے پاس مچیا پر بیٹھ کر مسالے کی مقدار پر تنقید کرتی ہوئی تصور میں لانے لگتی ہوں، ''ارے بابو، یہ اتنا سا مسالہ اور اتنی مچھلی؟''

ابا اور بھائیوں نے جس دن چار فٹ لمبی مچھلی (جسے سنور کہتے ہیں) کا شکار کیا اور اسے گھر کے اندر لاتے تو گھر میں ایسا واویلا مچتا اور گوری نانی ایسے مسکرا مسکرا کر مچھلی کی طرف دیکھتیں کہ جیسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ یہ مچھلی ابا اور بھیا نے ماری ہے۔ بھیا جب کہتے: ''گوری نانی مچھلی کو پانی میں بندوق سے مار کر لائے ہیں۔'' گوری نانی پھر مسکرانے لگتیں اور ادھر اُدھر دیکھ کر بات کو ٹالنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ مچھلی پر گولی کے نشان دکھا دکھا کر بھیا پریشان ہو جاتے مگر گوری نانی مسکرا کر رہ جاتیں اور یقین ہی نہ کرتیں کہ ''بھلا مچھلی کو کہیں بندوق سے مارا جائے ہے؟ کا (کیا) بابو بدھو بناؤ ہو؟ ہم تو کبھی نہ سنا کی مچھلی کو بندوق سے مارا جائے ہے!''

بڑی دیر تک تبصرہ ہوتا رہتا۔ بستی کے ار بھی کچھ لوگ آ جاتے کہ چلو سنور ابا بو لوگ مار کر لائے ہیں، چلو دیکھنے چلو۔ گھر میں ایسی چہل پہل ہو جاتی کہ جیسے کوئی تہوار ہو۔ اس دن مچھلی کا کباب، مچھلی کا قورمہ، مسالے دار سالن بنتا، اس کے قد وقامت کی باتیں ہوتیں اور سارے لوگ رات رات تک رہتے اور مچھلی کی ساری ڈشیز کھاتے رہتے۔

گوری نانی رات کو سونے کے لیے گھر چلی جاتیں۔ ان کے گھر جانے کے بعد ان پر کیا بیتتی تھی وہ تو اللہ جانے یا گوری نانی، اس لیے کہ وہ اپنی زبان سے کبھی کچھ بھی نہ کہتیں۔ ہم لوگوں کی اور امی کی صحبت ان کی زندگی میں سال میں صرف ایک بار ہی آتی۔ وہ کس طرح سے اور کیسے، خاص کر مرغی کے بچے کوئی ماہ سے امی کے لیے پالتیں، کسی کو پتہ نہ چلتا۔ جب گھر میں داخل ہوتیں تو ہاتھ میں ایک زندہ مرغا لیے رہتیں جو کہ ان کے تھرتھراتے ہوئے گورے گورے ہاتھوں میں مچلتا، تڑپتا اور چیختا رہتا۔ امی ان کو اور مرغے کو دیکھ کر کہتیں: ''پھر مرغا لے کر کیوں آ گئیں چچی؟''

''ہائے نارتی، دولہا کو مرغے کا قورمہ پکا کر کھلا دو گی، میری بابو۔ میری طرف سے رتی...... ہم تمری (تمھاری) جان پر سے قربان جائیں۔'' امی بہت خفا ہوتیں مگر وہ تو بس کہتی رہتیں کہ ''نا بابو لے لو۔ لے لو بابو۔ اللہ قسم لے لو...... ارے میری قسم لے لو۔'' ان کی حسین پرخمار آنکھوں سے چھلکتی ہوئی محبت کو دیکھے بغیر کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ ان کے اندر محبت کا کیسا خزانہ بھرا ہوا تھا اور ایسی حسین آنکھیں محبت کرتے وقت کیسی لگتی تھیں۔ ایسی مونس وغم گسار، امی کی ہم راز! جب ہم لوگوں کے آنگن میں آ کر پلنگ پر بیٹھ جاتیں تو بس ہر کام آسان ہو جاتا۔ ہر شخص کا لہجہ بدل جاتا۔ ان کے دل کی نرمی اور ٹھنڈک ہر چیز پر چھا جاتی۔ میں ان کے بہت قریب بیٹھ جاتی تھی۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہتیں اور مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھتی رہتیں۔

ہم لوگوں کے رخصت ہونے کے ایک ہفتہ قبل سے ہی گوری نانی کا منھ اُتر جاتا۔ ویسے تو ان سے امی کا بہت دور کا رشتہ تھا مگر یہ دل کا رشتہ کچھ اس قدر مضبوط تھا کہ شاید اتنی محبت اولاد سے بھی کوئی نہ کرے۔ جب ہم لوگ شیخپورہ جاتے تو دیکھتے ہی امی سے لپٹ جاتیں اور دیر تک امی کو گلے لگائے رکھتیں۔ اور جب شیخپورہ سے ہم لوگ واپس پٹنہ جانے لگتے تو پھر بے ساختہ ہو کر رونے لگتیں اور کہتیں، "ارے رقّی یہ دن کیسا جلدی جلدی گزر گیا، بیٹی ...... جاؤ بیٹا اللہ کی حفاظت ...... سہاگن رہو۔ اگلے سال پھر ایہو (آؤ گی)۔ میری تو اوہی (وہی) کوٹھری، اوہی (وہی) دنیا، اوہی (وہی) تماشا۔ یہ تیری چچی اللہ جانے اگلے سال تک بچے گی کہ نا، کس کو پتہ؟"

ہم سبھوں کی پیشانی چومتیں، گلے لگاتیں، دعائیں دیتیں۔ صرف تیس میل کے ہی سفر کے لیے بازو میں امام ضامن باندھتیں، "فقیر کو دے دیہو بابو، جاؤ اللہ کی حفاظت۔" بولتی جاتیں اور کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتی جاتیں۔ ہم لوگ بھی گوری نانی سے جدا ہوتے وقت پھوٹ پھوٹ کر روتے اور گوری نانی کی پیشانی پر ایک ایسی درد کی تحریر ابھرتی جسے پڑھتے ہی پھر ہم ان سے کبھی نظر نہیں ملاتے اور جلدی جلدی گھر سے باہر کی طرف چلے جاتے۔ اپنی تکلیف اور گوری نانی کی تکلیف! اس سے نظریں بچانے کے لیے ان سے دور ہو جاتے۔!!

جدائی! یہ لفظ اردو شاعروں کے لیے تو صرف عاشق اور معشوق کے مابین ہجر کا کلیشے بن گیا ہے، لیکن ذرا غور کریں تو یہ لفظ بے حد پُر اسرار معنی کا حامل ہے۔ ماں کے لیے بیٹے کی جدائی، والدین کے لیے گھر چھوڑ کر جانے والی اس بیٹی کی جدائی جسے ہزار ارمانوں سے ڈولی میں بٹھا کر رخصت کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جیل سے چھوٹنے والے قیدی کی ان دوستوں سے جدائی، جن کے ساتھ اس نے جیل خانے کی فضا میں دس بارہ برس کاٹے ہوں۔ یہی جدائی تھی، ہم لوگوں کی گوری نانی اور ان جیسے دیگر محبت کرنے والے لوگوں کے لیے!

میں کب سے ماضی کے تانے بانے ادھیڑتی اور بُن رہی ہوں
بتائے کوئی میں جانتی ہوں کہ کرچیں خوابوں کی چن رہی ہوں

شیخپورہ کے سبھی لوگوں سے اور گوری نانی سے جدا ہو کر ہم لوگ پٹنہ آ گئے۔ ہر کوئی پھر سے اپنے اپنے معمول کے کاموں میں الجھ گیا۔ یہاں پٹنہ شہر کی گہما گہمی اور مشغولیت۔ اسکول، کالج، ہائی کورٹ، کچہری میں سب لوگ مشغول ہو

گئے۔ اُدھر دیہاتی زندگی معمول پر منحصر ہے۔ کنوؤں سے پانی بھرنا، موسل چلانا، ڈھیکی چلانا، جانتا چلانا اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں وہاں بھی سب لوگ لگ ہی گئے ہوں گے۔ دن اسی طرح گزرتے چلے گئے۔

ٹھیک ایک ماہ کے بعد شخپورہ سے خبر آئی کہ گوری نانی کا انتقال ہو گیا۔ بستی کے سامنے والے قبرستان میں گوری نانی نے اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا اور اپنی آبلہ پائی کو کفن کی تہوں میں چھپا کر، لپیٹ کر اپنے بے گناہی کی صفائی دیے بغیر، دلگیر ہی سہی، مگر ایک پُرسکون وپُرنور شبستاں میں اپنے معبودِ حقیقی سے جاملیں۔

اگر وہ مجرم تھیں تو صرف اس لیے کہ پرسشِ حال پر انھوں نے چند قطرے آنسوؤں کے بہائے تھے۔ مگر حرفِ شکایت کے لیے کبھی لب وا نہیں کیے۔ روح کے نکل جانے کے بعد ہی ان کے جسم و جان کو راحت ملی۔ وہ صبح اور شام کی چیخ و پکار، پیٹ کی بھوک کو بجھانے کی فکر، اٹھنے بیٹھنے میں آرام و راحت کی فکر، رات رات تک جاگنے سے آنکھوں کی جلن کو آرام دینے یا ایک گلاس پانی کی خواہش، ان سارے مرحلوں سے وہ نجات پا گئیں۔ وہ نجات پا گئیں لیکن سب کو نجات کی مشقت میں ڈال گئیں۔

جو لوگ مر گئے اپنی بلا تو ٹال گئے
بچے ہوؤں کو بڑی کشمکش میں ڈال گئے

اب یہ نہیں ہوتا۔ تو ایسے لوگوں کے لیے یتیم خانے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا وجود جو رحمت تھا، زحمت کی طرح گھر سے باہر کر دیا گیا۔ رحمت گئی تو لعنت آ گئی۔ زندگی حسین مکانوں میں، حسین لباسوں میں، حسین سامانوں میں بے روح ہو گئی۔ جسم رہ گیا، جان نکل گئی۔ اب زندگی کچ پتریاں (کٹھ پتلیاں) ہیں جو دھاگے کے سہارے ناچتی ہیں، جو دنیا ان کے اشاروں پر ناچتی تھی، وہ دنیا اب انھیں نچانے لگی۔ زندگی کی اصل توانائی نکل گئی۔ اب برقی مشینوں کے ذریعہ حرارت اور توانائی پہنچانے کا کام شروع ہوا۔ ہوائی جہاز جو اپنے پیٹ کے اندر بھرے ہوئے پیٹرول سے چلتا تھا، اب اس میں بیل اور گھوڑے جوت کر چلانے کا سامان ہونے لگا۔

عشق کی وہ جست ختم ہو گئی جو ایک لمحے میں زمین و آسمان کی بے کرانی کو طے کر دیتی تھی۔ اب کروڑوں اربوں روپیوں کے بنے راکٹ میں اُڑانے کی محنت ہو رہی ہے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ زندگی بے مایہ ہو گئی۔ سانپ نکل گیا اب لکیر پیٹی جا رہی ہے۔

میری امی مہینوں پریشان رہیں۔ اٹھتے، بیٹھتے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھتی رہتیں۔ گوری نانی کو یاد کر کے ان کی کہی ہوئی ہزاروں باتیں ہم لوگوں کے سامنے دہراتی رہیں۔ آہیں بھرتی رہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ موت کے ساتھ ساتھ صبر بھی عطا کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ اوروں کی طرح امی کو بھی صبر آ گیا۔

میں اپنی شادی کے بعد لندن چلی گئی۔ وہاں سے چار سال کے بعد اپنے وطن ہندوستان واپس آئی۔ سبھی لوگوں سے ملنے کے لیے شیخپورہ کا بھی پروگرام بنایا گیا۔ پٹنہ سے شیخپورہ کا سفر کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن اگر اپنے گاؤں نہ جاتے تو ہندوستان کا سفر مکمل ہی نہ ہوتا۔ لہٰذا بہت ہمت کر کے امی کے ساتھ سبھی لوگوں سے ملنے شیخپورہ گئے۔ ہر چیز بالکل ویسی ہی تھی۔ سوائے اس کے کہ کسی کسی مکان کی چونا گردانی پھیکی پڑ گئی تھی، کہیں کہیں کسی کے گھر کا پایہ گرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میری یاد کے جو چمکتے اور صاف و سفید مکان تھے، ان کے کچھ پلاستر کے ٹوٹ جانے سے سرخ اینٹوں کی ڈھلکتی ہوئی سرخ دھاریاں ادھر اُدھر نمایاں تھیں۔ میں ہر چیز کو ایک حسرت بھری نظر سے بس دیکھے چلی جا رہی تھی۔ نانی اماں، گوری نانی اور نانی کی گونجتی ہوئی آواز مجھے بیل گاڑی پر بیٹھے ہی بیٹھے بے قرار کر رہی تھیں۔

بس ایک آنسو کی دھیمی سرسراہٹ کی صدا آئی
ہوئی اک جوئے خوں جاری حویلی کی دراڑوں میں

مرے اندر کی اک دنیا ہے جو سب سے الگ سی ہے
میں جیتی ہوں اسی اندر کی دنیا کی پکاروں میں

میں چونک اٹھتی ہوں اپنی نیند سے جب یاد آتی ہیں
وہ باتیں وضع دارانِ محبت کی اشاروں میں

ہر مکان اپنی جگہ پر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ پیڑ پودے سبھی بالکل اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے جیسے ہم لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ شاخیں کہیں کہیں پر سے ٹوٹ کر گر گئی تھیں۔ سرسوں کے کھیت جو بیچ بیچ رامیں تھے، وہ لہلہا رہے تھے مگر اس کی کشش میں جیسے کچھ کمی آ گئی ہو۔

ہوئے وہ حادثے اب کے برس اگلے بہاروں میں
کہ بچھڑی صورتیں کچھ اور دھندلی ہیں نظاروں میں

اب آؤ گرمیٔ فصلِ خزاں کی گفتگو چھیڑیں
کہ یادیں توڑ دیتی ہیں مجھے ٹھنڈی پھواروں میں

ہم لوگوں کے جانے سے ہر شخص خوشی سے جیسے جھوم رہا تھا۔ کوئی کھلکھلا رہا تھا، کوئی لہک لہک کر باتیں کر رہا تھا اور کمر لچکا لچکا کر ہم لوگوں کے لیے کنوئیں سے ڈول میں بھر بھر کے ٹھنڈا پانی نکال رہا تھا۔

یہ سب گزرے ہوئے دور کی حقیقت کو اصلیت کو نقل کے ذریعہ سامنے لانے کی کوشش تھی۔ جیسے مرجھائے ہوئے فاقہ زدہ چہروں پر پاؤڈر اور کریم لگایا جائے۔ گرتی ہوئی دیوار کو تختوں سے سہارا دیا جائے۔ زخم آلودہ اور کوڑھ چھوٹے ہوئے جسموں پر پھاہا سجایا جائے۔ اندر کی توانائی ختم ہوگئی یا خون صالح کی روانی ختم ہوگئی تو صاف پانی پی کر اس کی آلائش کو دور کرنے کی کوشش، جو زندگی اپنے اندرون کی شگفتگی سے مسکراتی تھی اس کی کو کھسیانی ہنسی کیا پوری کر سکتی۔ دیہاتوں میں خیر یہ تکلیف بھی ہے۔ دنیا سے تو یہ تکلیف بھی ختم ہوگئی۔ پردہ اٹھا دیا گیا۔ اب جو سامنے ہے وہی ہے۔ اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش حماقت کی علامت ہے۔

درحقیقت میں تو جیسے سکتے میں تھی۔ میری نظروں کے سامنے بیتے ہوئے ایک ایک پل آتے جا رہے تھے اور مجھے تڑپا رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوئے تو چھوٹی کھڑکی کی طرف نظر گئی اور گوری نانی کے کھڑاون کی دھیمی دھیمی مترنم آواز جیسے آتی ہی گئی اور جیسے میرے، بہت قریب آ کر رک گئی۔ مجھے لگا کہ جیسے کوئی میرے سر پر ہاتھ پھیرے جا رہا ہو اور میں شفقت اور محبت کی بوچھار میں سرشار ہوتی ہی چلی گئی۔ میں سبھی لوگوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور ہر بات کا وقت بے وقت جواب بھی دے رہی تھی۔ مگر میرا ذہن ان ہی پرانی یادوں والی فضا میں تیر رہا تھا۔

کبھی کبھی اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ ''چھوٹی بُنّی بڑی بدل گئی ہیں...... کا ہے بُنّی کا (کیا) سوچ ہو؟'' میں چونک کر جواب دیتی، ''نہیں نہیں کچھ بھی تو نہیں۔ میں بالکل نہیں بدلی، میں وہی انجم ہوں جو میں پہلے تھی!'' یہ سچ تھا کہ مجھے گوری نانی بہت یاد آ رہی تھیں۔ کاش، کاش، وہ زندہ ہوتیں! اللہ وہ اس وقت کس قدر خوش ہوتیں!

امی کا تو وہ گھر ہی تھا، جہاں وہ اپنا بچپن گزار چکی تھیں۔ ان ہی اُساروں اور آنگن میں کھیل چکی تھیں۔ اسی گھر سے بیاہی گئیں، اسی گھر سے رخصت ہوئی تھیں۔ اس گھر کی وہ مالکن تھیں۔ بستی کے وہ سارے لوگ ان کے لوگ تھے۔ وہ سبھی سے گلے مل رہی تھیں۔ ایک ایک بات ہر آنے والے سے تفصیل سے پوچھ رہی تھیں۔ میں خاموشی سے اپنی ماں کے جذبات کو ایک پلنگ پر بیٹھی بیٹھی محسوس کر رہی تھی۔ میں امی کی خوشی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ دنیا میں بس یہی سب کچھ ہے۔ جہاں خوشیاں ملیں، جہاں رہنے کا مزہ ملے، جہاں پیار، محبت، شفقت اور عزت ملے، اس جگہ کو اپنا سب کچھ سمجھنا چاہیے اور میری ماں نے اپنے پورے گاؤں والوں کی دیکھ ریکھ کی، ان سے محبت کی۔ بہتوں کو پٹنہ میں رکھ کر پڑھایا، پرورش کی، شادی بیاہ سب کچھ کیا، اور آج تک لوگ ان کو یاد کر کے روتے ہیں۔

دوسرا دن آ گیا تو امی نے کہا کہ چلو گاؤں کے سب لوگوں سے مل لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم لوگ قیوم ماموں (گوری نانی کے بیٹا) کے گھر گئے۔ یوں بھی ان کا گھر ہم لوگوں کے گھر کے فوراً بعد آتا تھا۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے داہنی طرف ایک برآمدہ اور دو کمرے تھے جو مردوں کا علاقہ تھا قریب قریب ہر گھر میں ایسی ایک جگہ ہوتی تھی۔ بنگلہ یا باہر مردوں کی محفلوں کے لیے ایک برآمدہ۔ قیوم ماموں اسی باہر والے برآمدے میں حسب عادت کوئی مذہبی کتاب لے کر زمین پر کے فرش پر بیٹھ کر مطالعہ کر رہے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ گئے اور امی کو سلام کیا، ''سلام بوبو!'' امی کو بوبو کہتے تھے۔ امی بے ساختہ رونے لگیں۔ بہت قریب آ گئے اور کہنے لگے، ''کاہے کو روؤ ہو (روتی ہو)، بوبو اُو تو جنت میں آرام سے ہیں! چلو چلو بوبو گھر کے اندر چلو نے!'' پھر ہم سبھی لوگ گھر کے اندر داخل ہونے لگے۔ اندر آنگن میں پلنگ پر لحاف اور دوہر دھوپ میں سوکھ رہی تھی۔ برآمدے کے ایک طرف ایک کرسی اور اس پر کچھ کپڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کرسی کے پیچھے مٹی کی دیوار پر چونے کا چھاپ تھا۔ شاید علاء الحق (قیوم ماموں کا لڑکا) کی شادی ہوئی ہو گی۔ میں نے دل میں سوچا۔ کسی سے آہستہ سے پوچھا تو پتہ چلا کہ علاء الحق کی شادی ہو گئی ہے۔ داہنی طرف ایک پلنگ بچھی ہوئی تھی جس پر توشک اور ایک دھنسا ہوا تکیہ، جو کافی دنوں سے جیسے دھویا نہ گیا ہو۔ اس پر ایک مریضہ، ہڈی اور چمڑے کی صورت لیٹی ہوئی تھیں۔

امّی چونکہ گھر میں ہم سے پہلے داخل ہوئی تھیں اس لیے وہ اس ضعیفہ سے گلے مل کر سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگر امی وہاں پر بیٹھی ہوئی نظر نہیں آتیں تو وہ ضعیفہ، اس خستہ توشک میں لیٹی ہوئی مجھے کبھی نظر بھی نہیں آتیں۔

میں نے سلام کیا۔ جواب خدا جانے وہ دے سکیں کہ نہیں، مجھے یاد نہیں ہے۔ امی سے میں نے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ امی بولیں کہ "ارے تم نے پہچانا نہیں۔ یہ گوری نانی کی بہو ہیں۔" میں تو ان کو پہچان بھی نہیں سکی۔ چھوٹے قد کی تھیں مگر اچھی خاصی تندرست تھیں۔ تھوڑا رک رک کر بولتی تھیں مگر گھر کا سارا کام کاج، بچوں کی دیکھ ریکھ، پھر پورا گھر، باہر کے لوگوں کا آنا جانا سب کچھ سنبھالا ہوا تھا۔ مگر ان چند برسوں میں بے چاری کو کیا ہو گیا؟ میں خاموشی سے دل ہی دل میں یہ سوچتی رہی۔ پھر میں ان کے قریب گئی اور پوچھا، "آپ ایسی کمزور کیسے ہو گئیں؟" پہلے تو گوری نانی کی طرح میری پیشانی پر بوسہ دیا، پھر رونے لگیں اور اپنے آنچل میں آنسوؤں کو جذب کرتی رہیں۔ اللہ جانے بے چاری کیا کیا سوچ رہی تھیں، مگر امی کے سامنے مجھے وہ نادم سی لگ رہی تھیں۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ یہ میرا گمان ہو۔ کافی دیر تک روتی رہیں۔ پھر جب روتے روتے چپ ہوئیں تو تھوڑا تھوڑا بولنے کی کوشش کرنے لگیں۔ "تین لڑکیاں ہیں بوبو، مگر اب تو سب کی سب اپنے اپنے سسرال چلی گئیں۔ ایک بیٹا ہے علاء الحق، جس کی شادی تو بڑے ارمان سے کیا مگر کا (کیا) بتائیں، بہو ایسی آئی ہے کہ دن بھر میں کسی وقت بس ایک بار تھوڑا سا ماڑ اور چاول دے دیتی ہے۔"

اس کے بعد ایسا لگا کہ آگے مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا ہو۔ میں کانپ رہی تھی۔ مجھے میری گوری نانی اس قدر یاد آنے لگیں کہ میں تقریباً رونے ہی لگی...... یا اللہ کبھی کبھی تو بدلہ اس قدر جلدی دے دیتا ہے......!

اور میں سوچنے لگی، یہی خداوند کا نظام ہے۔ اسی کا انصاف ہے اور زیادہ تر اس دنیا میں انسان کو اس کے کیے کا بدلہ برحق دے دیتا ہے۔ سزا و جزا! کیا مسئلہ ہے جس پر فلسفیوں، عالموں اور گیانیوں نے لاکھوں صفحے لکھ لکھ کر سیاہ کیے ہیں۔ تحقیق و تدقیق سے پرانے گرنتھوں کو پڑھ پڑھ کر اپنے حکیمانہ افکار سے لوگوں کو گناہوں سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ گناہوں کی سزا تو برحق ملتی ہی ہے، سب مذاہب اسے مانتے ہیں لیکن کب ملتی ہے؟ کیا گناہ و ثواب کا لکھا جوکھا دھرم راج کی کچہری میں ہوتا ہے، جیسے کہ ہندو مانتے ہیں۔ یا حشر کے روز اس کا حساب کتاب صاف اور صریحاً ہر فرد کے سامنے ہوگا، جیسے کہ اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے۔ یا یہ سزا و جزا ایک جنم میں کیے گئے گناہوں کے کفارے کے طور پر دوسرے جنم میں ملتی ہے، جیسے کے بودھ لوگوں اور ساتن دھرمی ہندوؤں کا خیال ہے...... میں یعنی ایک معمولی پڑھی لکھی، سیدھی سادی، ہندوستانی مسلم عورت اس عین فلسفے کی شہادت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس سچائی کو جاننے کے لیے مجھے مراقبے میں جانے کی ضرورت نہیں تھی کہ جنت اور جہنم، دونوں ان ذہنی اور جسمانی کیفیتوں کے نام ہیں جو ہمیں یہاں، اسی دنیا میں، اللہ کی طرف

سے ودیعت کردی جاتی ہیں۔ اب آپ اسے کچھ بھی سمجھیں ہم نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا، وہ یہ تھا کہ گوری نانی کو ان کی زندگی میں ہی ان کی چہیتی بہو نے جس جہنم میں دھکیلا تھا، اسی میں بیس بائیس برسوں کے بعد وہ خود دھکیل دی گئیں۔ اللہ تیری رضا! تو قہار بھی ہے، اور جبار بھی!

یہ سوچ ہی رہی تھی کہ پھر گوری نانی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آ گیا۔ ویسا ہی نورانی چہرہ۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ۔ سفید ساری، کھڑاؤں کی وہی مترنم آواز، آنچل سنوارتی ہوئی شگفتہ، شاداب اور پوری توانائی کے ساتھ میرے قریب آ گئیں۔ ان کے نرم نرم اور ٹھنڈے سے آنچل نے میرے چہرے کو چھولیا۔ ایک سیکنڈ کو میری آنکھیں بند ہو گئیں اور آنکھ کھلی تو میری نظر آنگن کی لہلہاتی ہوئی چمبیلی سے اٹک گئی۔ ایک ٹھنڈی سی ہوا چلی اور میں گوری نانی کے بارے میں دانستہ آنکھ بند کر کے سوچنے لگی۔ اور پھر نہ جانے کون کیا بول رہا تھا، میں تو اس منظر سے بہت دور کہیں اور تھی۔ اور پھر گوری نانی جیسے میرے اور قریب آتی چلی گئیں۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں اور میں ان کے ہاتھ کے لمس سے سرشار ہوتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔ میں بیتے دنوں میں گم ہو گئی......

مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر دو روحیں بستی ہوں۔ ایک وہ جو بچپن کی حسین یادوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی آج تک اسی زمانے میں رہ رہی ہے، جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ دوسری وہ جو عصر حاضر کی بالغ عورت ہے، جس نے زندگی کے نشیب و فراز کو قدم بقدم چل کر طے کیا ہے۔ یہ دونوں روحیں آپس میں پرانی سہیلیوں کی طرح کئی باریوں گلے ملتی ہیں کہ یہ قیاس کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ بچپن کی معصوم اور کھلنڈری روح کون سی ہے اور آج کی تعلیم یافتہ، زمانہ شناس بالغ روح کون سی ہے۔ میری غزل کے چند اشعار:

میرے ماضی کی حسیں یادیں بہاریں لاتی ہیں
رات دن میرے لیے، شام و سحر میرے لیے
کھلکھلاتی لڑکیوں کی چوڑیوں کی کھن کھنن
ہیں وہی نغمے ابھی تک معتبر میرے لیے
میرے گھر کے ماہتابی لوگ رخصت ہو گئے
ہیں اندھیرے گھر کے سب دیوار و در میرے لیے

سنِ بلوغ پر پہنچ نے بچپن کے دنوں میں میری شخصیت کیا تھی، اس کا تجزیہ کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی اب، جب میں اپنے ان دنوں کو یاد کرتی ہوں تو لگتا ہے کہ میں ایک حساس طبیعت والی لڑکی تھی۔ لیکن برعکس ان بچوں کے جو چپ چاپ اپنے آپ میں مگن، خاموش رہتے ہیں اور بے حد جھینپو ہوتے ہیں۔ میں ملنسار، باتونی اور خوش رہنے والی لڑکی تھی۔ میں امی کے ساتھ ہر رات بستر پر لیٹ کر دن بھر کا قصہ سناتی اور طرح طرح کے سوالات کرتی اور کہانی سنتی۔ ایک رات نہ جانے کہاں سے میں نے یہ سوال کر دیا، ''امی، یہ بنی داوا کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اماں اس قدر اسے کیوں مانتی ہیں؟'' امی نے جیسے ایک کہانی بنا کر یہ سچا واقعہ سنانا شروع کیا......

''سنو یہ کون ہے اور کیسے آیا...... '' ایک دن اماں کی ایک رعب دار آواز آئی۔ ''یہ جو باہر ایک فقیر کھڑا آواز لگا رہا ہے اسے تم لوگ بھگانا نہیں۔'' اماں اپنا بھاری بھرکم جسم اٹھائے ہوئے اس فقیر کے پاس گئیں۔ اس فقیر سے کھسر پھسر نہ جانے کیا کیا باتیں کیں۔ اسے چائے ناشتہ بھجوانے کا حکم ہوا۔ گھر کا نوکر سکھوا (خدا جانے بیچارے کا اصل نام کیا تھا) جا کر اس فقیر کو صبح کا ناشتہ اور چائے دے آیا اور وہ فقیر آرام سے وہیں زمین پر ہی بیٹھ کر صبح کا ناشتہ کرنے لگے۔ پھر دوسرے دن بھی آ کر براجمان ہو گئے اور ویسے ہی اماں نے ناشتہ چائے سے پھر ان کو نوازا۔ کئی دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر اک دن وہ فقیر اپنے ساتھ دس بارہ برس کی عمر کا ایک دبلا پتلا لڑکا بھی لے کر آیا۔ اماں کو پتہ چلا کہ فقیر آج پھر آئے ہیں تو جلدی جلدی دروازے کی اوٹ سے ہی کھڑی اس لڑکے کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ اس فقیر نے بڑی خوش دلی سے اپنے لڑکے کو اماں کے سپرد کر دیا۔ اس کے حال کا جائزہ لینے لگیں اور پوچھا، ''اے لڑکے تیرا نام کیا ہے؟'' وہ اپنی دھیمی آواز میں بولا، ''ابراہیم۔'' جب وہ فقیر چلے گئے اور وہ لڑکا گھر کے اندر آ گیا تو آنگن کے ایک کونے میں اماں اسے سمجھا کر بتا رہی تھیں کہ آج سے تیرا نام ابراہیم نہیں، بنی داوا ہے۔ اور اس لڑکے نے بھی اپنے اس نئے نام کو بڑی ہی آسانی سے قبول کر لیا۔ میں نے جب اماں کو ٹوکا کہ ''اماں اس بے چارے کا نام آپ نے کیوں بدل دیا، اچھا نا صا تو اس کا نام تھا'' تو اماں نے جواب دیا کہ ''کیا دن بھر میں اپنے باوا کا نام لے کر اس چھوکرے کو پکارتی رہوں گی؟'' وہ دن ہے اور آج کا دن کہ بنی آج تک یہاں موجود ہیں

نانی اماں کا نوکر یعنی دادا کی گود میں میری منجھلی بہن کا لڑکا (عرفان جعفری)
اور کالی ٹوپی میں ان کا بڑا لڑکا رضوان جعفری پٹنہ میں

اوران کے منوں نخرے ہم بھی سہہ رہے ہیں۔“

بنی داوا اور ربانی، نانی اماں کے دو نوکر تھے۔ دنیا انھیں نوکر سمجھتی تھی، مگر سچ پوچھیے تو وہ دونوں نانی اماں کے پوس پالک بیٹے تھے، بلکہ سگے بیٹے سے بڑھ کر تھے۔ ان دونوں پر نانی اماں جان چھڑکتی تھیں۔ چھوٹی باجی کے پاکستان چلے جانے کے بعد تو ان دونوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان دونوں کو بُرا بھلا کہہ دے۔ وہ خود ہی ان دونوں پر بگڑتی تھیں۔ پھر فوراً ہی ٹھیک بھی ہو جایا کرتی تھیں زیادہ تر وہ صرف دکھاوے کے لیے ہی کوستیں اور وہ دونوں بھی یہ خوب جانتے تھے کہ یہ جو اس وقت بگڑ رہی ہیں اور کوس رہی ہیں، یہ صرف ان کا سچا پیار ہے۔ ہم بھائی بہن آئے دن یہ تماشہ دیکھتے رہتے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ بنی داوا کے والد گیروا رنگ کے کپڑوں میں ملبوس اکثر عدالت گنج کے کوارٹر کی بیرونی دہلیز پر آیا کرتے تھے۔ امی ہم لوگوں کے ہاتھ آٹا یا چاول بھجوا دیا کرتی تھیں۔ خدا جانے یہ سارا قصہ کیسے ہوا اور کیسے یہ بنی داوا، نانی اماں کے ہاتھ آ گیا اور کیوں انھوں نے اس بوڑھے فقیر سے لے کر بنی داوا کو اپنا لیا اور ان ہی کے زیر سایہ پل کر وہ بارہ سال کا بچہ جوان ہو گیا۔

بنی داوا ایک بہت ہی اچھا انسان تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک ایسی کشش تھی جو ہر شخص کو لبھا لیتی تھی۔ خاص کر بچے تو اس پر فدا ہی رہتے تھے۔ بچوں کے لیے کسی نہ کسی قسم کی مٹھائی وہ ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا۔ بے چارہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اگر وہ واقعی پڑھ لکھ لیتا تو کوئی بڑا فلسفی ضرور بن جاتا، اکثر کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور ہندی میں طرح طرح سے اپنا نام لکھتا۔ ہندی کا اخبار خرید کر ضرور لاتا اور جاڑے کی دھوپ میں بیٹھ کر گھنٹوں پڑھتا رہتا۔ لمبا قد، چہرے پر پتلی سی مونچھ، سانولی رنگت اور ہونٹوں پر مستقل ایک مسکراہٹ جیسے جامد ہو گئی ہو، بہت ہی آہستہ آہستہ بولتا، اتنا آہستہ کہ دم گھٹنے لگتا۔ دونوں ہاتھوں کو پیچھے کی طرف کر کے آہستگی سے گھر میں داخل ہوتا اور بڑی احتیاط سے چکو مکو زمین پر بیٹھ جاتا۔ کوئی اگر اس سے کچھ پوچھتا یا بولتا تو ایک یا دو منٹ کے بعد کافی سوچ کر جواب دیتا۔ دماغ بہت اعلیٰ تھا اس لیے کسی بھی معاملے میں جلد بازی میں تصفیہ کرنے پر راضی نہ ہوتا۔ ایک بار چھوٹے ابا (چھوٹے چچا) نے اس سے پوچھا، ”بنی! کامرس کالج میں دربان کی نوکری کرو گے؟“، تو جواب دیا، ”اتنی چھوٹی سی نوکری میں میرا کام کیسے چلے گا۔ ہم پچاس ساٹھ روپیہ تو صرف فقیر کو دے دیتے ہیں“، جب کہ اسی نوکری میں چار پانچ بچوں کے ساتھ لوگ گزارا کر رہے تھے۔ لیکن بنی کا نظریہ تو عام انسانوں سے بے حد جدا گانہ تھا۔

مشرقی زندگی میں ابھی صدی پہلے تک خدا کا تعلق تعمیر وجود کا بنیادی پتھر تھا۔ اس زندگی میں تن بدن اپنے تقاضے بھول جاتے تھے۔ روح کا شباب اور توانائی جسم کی تمام کمی اور نقص کو ہنر بنا دیتی۔ جسم کا بدرنگ، خوش رنگ بن جاتا۔ چہرہ کی بدہیئتی، حسن بن جاتی۔ زبان کا پھوہڑپن کشش اور خوشگواری کا مرکز بن جاتا۔ بولی پر پیار آجاتا۔ قدرت اس کی در پردہ تعمیر کرتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک راستے سے گزر رہے تھے۔ ایک ان پڑھ بنی اسرائیل راستے کے ایک طرف بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہ آسمان پر تھی۔ وہ کہہ رہا تھا، اے خدا تو کہاں ہے، تو مجھ سے کیوں دور ہے، تو میرے پاس ہوتا تو میں تیرے ہاتھ پاؤں دباتا، تیرے سر میں تیل دیتا، تجھ سے شکایت بھی کرتا اور تجھ سے پیار بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈانٹا، کیا بکتا ہے خدا کیا آدمی ہے؟ تیرا بھائی باپ ہے؟ تو اس کا ہاتھ پاؤں دباتا۔ وہ دیہاتی ایک آہ کر کے خاموش ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی ڈانٹ پڑ گئی۔ موسیٰ تم لوگوں کو ہم سے جوڑنے آئے ہو یا ہم سے توڑنے آئے ہو!

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اس کا دل تم نے دکھایا۔ گویا میرا دل دکھا دیا۔ اللہ اللہ۔ تو سیدھی سادی صاف معصوم زندگی میں خدا سمایا رہتا ہے۔ اس قسم کے انسانوں کا ایک ادنیٰ نمونہ بنی داوا کی زندگی تھی۔ وہ لوگ خدا کے قریب ہوتے تھے۔ وہ عابد و زاہد، عالم فاضل نہیں ہوتے تھے، لیکن خدا سے قریب ہوتے تھے۔ سادگی خاکساری ان کا جوہر، کم بختی، کم خوردنی انھیں آلودگی سے بچا لیتی تھی۔

وہ نانی اماں کا سارا کام کرتا۔ رات کے وقت پابندی سے نانی اماں کا سر دبا دیتا اور جب ان کے پاؤں کی ایڑی میں درد ہوتا تو گھنٹوں دباتا رہتا۔ کام کرنے کے سلسلے میں بنی بڑے موڈی تھے۔ اگر ا کا موڈ نہیں ہے تو مجال نہیں کہ آپ ان سے کام کروالیں۔ سارے لوگ یہی کہتے کہ نانی اماں نے دلار میں اس کو بگاڑ دیا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا بنی داوا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے بے حد مانتا تھا۔ میری ہر خواہش کو پوری کرتا۔

مجھے یاد ہے، میں جب بہت چھوٹی تھی تو اس زمانے میں میری ذکیہ خالہ اور سجاد خالو پاکستان سے عدالت گنج پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ ایک شام وہ لوگ میری دونوں بڑی بہنوں کو لے کر سینما دیکھنے چلے گئے جس کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔ اس

لیے کہ میں سو چکی تھی۔ مغرب کے بعد جب میری نیند ٹوٹی تو میں رونے لگی کہ مجھے بھی سنیما جانا ہے۔ بنی دادا کو مجھ پر بے حد ترس آیا اور امی سے اجازت لے کر وہ مجھے بھی سنیما لے گیا۔ مگر بے چارے کے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے، اس لیے چھ آنے والی دو ٹکٹیں خرید کر خود بھی ٹھاٹھ سے سنیما دیکھا اور مجھے بھی دکھایا۔ میں پوری فلم بڑے شوق سے دیکھتی رہی۔ بالکونی کی سیٹ پر ذکیہ خالہ، سجاد خالو اور میری دونوں بہنیں فلم دیکھ رہی تھیں اور اسی سنیما ہال کی چھ آنے والی سیٹ پر میں اور بنی دادا بڑے اطمینان سے سنیما دیکھ رہے تھے۔ دلیپ کمار کی فلم ''آزاد'' تھی۔ پوری فلم دیکھنے کے بعد سب لوگ گھر واپس آگئے۔ رات بہت ہو چکی تھی اس لیے میں گھر پہنچتے ہی سو گئی۔ صبح سویرے جب سو کر اٹھی تو بڑی باجی کو بتانے لگی، ''کل میں نے بھی سنیما دیکھا تھا باجی!'' اس فلم میں تو بندر بھی تھا، شیر بھی تھا اور ایک لڑکی بہت اچھا ڈانس بھی کر رہی تھی۔'' باجی حیران ہو گئیں کہ آخر یہ فلم کی ساری تفصیل کیسے جانتی ہے۔ تب میں نے بتایا کہ ''آزاد'' فلم دکھانے مجھے بھی بنی دادا لے گیا تھا۔ وہ فلم میری زندگی کی سب سے پہلی فلم تھی۔ یہ تو سچ ہے کہ بچپن میں جب کوئی بھی خوشی کسی کو دیتا ہے تو ایسی خوشیاں زندگی بھر یاد رہتی ہیں جیسے کسی کورے کاغذ پر کوئی روشنائی سے لکھ دیتا ہے اور وہ لکھاوٹ ساری زندگی کے لیے اپنا نشان چھوڑ دیتی ہے۔ بنی دادا نے ایسی ایسی نہ جانے کتنی خوشیوں سے میرے بچپن کے سنہرے دنوں کو اور بھی سنہرا کر دیا تھا۔ اور میں ان ساری معصوم خوشیوں کو سنبھالے آج تک چل رہی ہوں۔

وہ فلم کی کہانی گھنٹوں سناتا رہتا۔ کبھی میں خوب ہنستی اور کبھی آنسو بہانے لگتی۔ مگر بڑے غور سے اس کی باتیں سنتی رہتی۔ اسی بیچ میں کبھی نانی اماں آجاتیں تو کہتیں، ''ارے منہ جھونسا! تو یہاں باتیں بنا رہا ہے اور کھانے کی کوئی فکر تجھ کو نہیں ہے؟'' نانی اماں کی ہر بات سے ان دونوں نوکروں کے لیے پیار کی خوشبو جھلکتی جس کی خبر ان دونوں کو خوب تھی۔

میں اکثر بنی دادا سے پوچھتی، ''اے بنی! یہ آنگن میں نانی اماں سفید سفید کپڑے بار بار کیوں سکھاتی ہیں؟ یہ کیا ہے بنی؟'' جواب میں کہتا، ''کچھ نہیں بٹی! یہ بس کپڑا ہے۔ ارے بڑی بی بی کی چادر ہوگی۔'' مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی لمبی چادر بھی کہیں ہوتی ہے۔ پھر میں بنی کی باتوں کا کسی حد تک یقین کر کے چپ ہو جاتی۔ اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ ملنے کے بعد کچھ وقت گزر جاتا، لیکن میں اپنے اندر ہی اندر تجسس کے ساتھ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک ماہ کے بعد پھر نانی اماں نے آنگن میں وہ سفید چادر سکھائی اور میں نے پھر بنی سے وہی سوال کیا اور اس نے پھر وہی جواب دیا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ایک بار میں شیخوپورہ گئی ہوئی تھی، وہاں برآمدے میں کھڑی تھی تو بنی دادا کو نانی اماں

سے کہتے ہوئے سنا، ''کیا بڑی بی بی، اس مہینے اپنا کفن نا سُکھیو (سکھاؤ گی)؟'' تو نانی اماں نے اس کو ڈانٹ کر کہا، ''تو کاہے کو فکر کر رہا ہے منہ جھونسا؟'' میں رونے لگی اور دوڑ کر امی کے پاس چلی گئی۔ امی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی، ''تمھاری نانی اماں اپنا کفن حج کے بعد سعودی عرب سے خرید کر لائی ہیں اور اسی کفن کو دھوپ میں اکثر سکھاتی ہیں، اس میں رونے کی کیا بات ہے؟'' جب میں نے بنی دادا سے پوچھا، ''تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں کہا تھا؟'' تو بولا، ''بٹی ہم جانتے تھے کہ تم گھبرا جاؤ گی، اسی لیے بڑی بی بی کے کفن کو چادر بتایا تھا...... سمجھی؟''

نانی اماں بنی دادا کو اس حد تک مانتی تھیں کہ دوسرے لوگوں کو اس پر رشک ہونے لگتا تھا۔ بنی یہ جانتا تھا کہ نانی اماں اس پر کس قدر جان چھڑکتی ہیں۔ اکثر اس کی شادی کی تیاری کی بات بھی کرتیں۔ دل ہی دل میں پلان بناتیں، مگر اوپر سے اسے پیار سے ''منہ جھونسا'' یا ''کوڑھی'' کہہ دیتیں۔

شخبورہ کے مکان میں ایک کشادہ صحن تھا جس کے ایک کونے میں ایک کنواں تھا، دوسرے کونے میں امرود کا درخت اور تیسرے کونے میں مٹی کا چولھا۔ جہاں زیادہ گرمی پڑتی تھی تو نانی اماں آنگن کے چولھے پر کھانا پکواتی تھیں۔ چوتھا کونا خالی تھا جو خلوت کی طرف پڑتا تھا۔ اسی طرف بیلے کی بیل برآمدے کے ستون کا سہارا لیے کھڑی رہتی تھی۔ اس بیل میں پتوں سے زیادہ پھول ہوتے۔ صحن کے چاروں طرف برآمدہ اور پھر کمرے۔ کسی طرف تین کمرے کسی طرف دو کمرے۔ جس کو لوگ ''تین درا'' اور ''دو درا'' کہتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں تین درا میں بالکل کونے میں بچھی ہوئی ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور جون کی سخت گرمی سے تنگ آکر خود کو تاڑ کے پنکھے سے جھل رہی تھی۔ اتنے میں آہٹ ہوئی کہ کوئی کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو نانی اماں اپنے مخصوص انداز میں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ میری موجودگی سے بے خبر وہ نیچے زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئیں۔ پھر انھوں نے ایک ٹین کے بکس کو آہستہ آہستہ کھولا۔ اس ٹین کے بکس کو پیٹی کہا جاتا تھا۔ پیٹی کو کھول کر اس کے اندر رکھے ہوئے کپڑوں کو خوب مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگیں۔ پھر بڑی احتیاط سے ایک سرخ دوپٹے کو نکال کر اس کی تہہ کھولنے لگیں جس پر چاندی کے طبق کا چھاپ تھا۔ اس ڈیزائن کو مکڑے کی چھاپ کہتے ہیں۔ نانی اماں اس مکڑے کی چھاپ والے دوپٹے کو اپنی پُر اشتیاق نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس میں عطر بسانے لگیں۔ پورے کمرے میں دیوانوں کی طرح خوشبو پھیلنے لگی۔ ساتھ ساتھ میرا اشتیاق بھی بڑھنے لگا۔ میں بغیر کوئی حرکت کیے ہوئے اب پلنگ پر سیدھی

لیٹ گئی۔ پھر نانی اماں نے سرخ ساٹن کا جمپر نکالا جس پر طبق ہی سے جال نکڑی چھپا ہوا تھا۔ اس جمپر کی سرخی اور طبق کی روشنی سے نانی اماں کا پورا چہرہ سرخ نظر آ رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان کے چہرے پر ایک حسین مسکراہٹ تھی۔ ہرا ساٹن کا پائجامہ جس پر جامے دار کی چھاپ تھی۔ اور سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ اس پر چاندی کی چمکی کی چمک نے ایک عجب دلربا منظر پیش کر دیا تھا۔ اس تین درے کے چھپر کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی نے اس شاہانہ کپڑے کو جیسے چاندی کی چمک میں شرابور کر دیا تھا۔

میں چپ چاپ اپنی پلنگ پر لیٹی لیٹی یہ سب دیکھتی رہی۔ خوشبوؤں میں تیرتی رہی اور سوچتی رہی کہ آخر یہ کس دلہن کی تیاری ہے؟ کس کے لیے نانی اماں نے ایسا شاندار انتظام کیا ہے؟ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ پھر انھوں نے سارے کپڑوں کو بڑے ہی احتیاط اور پیار سے تہہ کر کے واپس پیٹی میں رکھ دیا۔

جیسے کہ میری عادت تھی کہ کوئی بھی بات دیر تک اپنے سینے میں دبائے ہوئے نہیں رکھ سکتی تھی، میں نے شام کے وقت امی کو سارا آنکھوں دیکھا حال سنایا۔ امی مسکرانے لگیں اور بولیں، ''اے اور کون؟ وہی بنی داوا کی آنے والی دلہن کے لیے!'' لیکن نانی اماں نے کبھی بھی خود اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ وہ بنی داوا کی شادی کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں، بنی داوا جوانی کی دہلیز کب سے پھلانگ چکے تھے لیکن شادی اب تک نہیں ہوئی تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ بچپن میں ایک شادی ہوئی تو تھی مگر وہ کون تھی، کہاں کی تھی، کچھ پتہ نہ چلا اور شادی رخصتی کے قبل ہی ختم ہوگئی۔ اب بنی داوا ایک کنوارے ہی کی حیثیت سے تھے اور لوگوں کا اصرار تھا کہ بنی کسی سے شادی کر لیں۔ میرے چھوٹے چچا (سیّد عبدالمجید) کے گھر میں ایک لڑکی کام کرنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ سانولی رنگت، ذرا تندرست اور خوب چھل بل۔ ایک بات ختم بھی نہ کرتی کہ دوسری شروع کر دیتی اور ساتھ ساتھ کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔ چھوٹے ابا کے گھر کا کام ختم کر لیتی تو ہم لوگوں کے یہاں آ جاتی اور پایہ پکڑ کر کھڑی ہو جاتی اور بات بے بات ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔ خاص طور پر بنی کو چھیڑتی اور ہنستی جاتی۔ بنی بھی بے ساختگی سے ہنس ہنس کر کہتے کہ اس کی تو بتیسی کبھی بند ہی نہیں ہوتی ہے۔ اور کہتے، ''دیکھتی ہیں بُجی! کام کے ڈر سے یہاں بھاگ کر آ جاتی ہے!'' یہ سب سن کر بس وہ ہنستی ہی جاتی اور ساڑی کے پلّو سے اپنا منھ چھپا لیتی۔ ان دونوں گھروں میں اس کی اچھل کود جاری رہتی۔ کبھی ہم لوگوں کے گھر آتی اور کبھی چھوٹے ابا کے گھر۔

جب سب لوگوں کا کھانا پک جاتا تو بنی داوا اپنا کھانا بڑے اطمینان اور سکون سے بیٹھ کر پکاتے۔ عائشہ بھی اس

وقت کے انتظار میں رہتی کہ اب بنی اپنی روٹی پکا رہے ہوں گے، اس لیے وہ دوڑ کر آ جاتی اور کھڑی کھڑی بنی کو روٹی پکاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ بنی ہمیشہ آدھ سیر آٹے کی دو روٹیاں پکاتے اور عائشہ اس کو دیکھ دیکھ کر خوب ہنستی۔ بنی کبھی کبھی پکار کر کہتا، ''دیکھتی ہیں بنّی! یہ بے کار کا ناہنستی ہے۔ ارے موئی روٹی ہم کھائیں گے نا اس کا کیا جاتا ہے؟'' آہستہ آہستہ دونوں میں انسیت بڑھتی گئی اور ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے دونوں کو ایک دوسرے سے پیار ہو گیا۔ اب بنی عائشہ کی محبت میں ایسے گرفتار ہو گئے کہ کچھ زیادہ ہی خاموش ہو گئے۔ عائشہ کی بھی حالت کچھ اسی طرح کی ہو گئی۔ اب ذرا کم آنے لگی تھی، کم بولنے لگی تھی، کم ہنسنے لگی تھی۔ صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر نظر آتی۔ اور ہم لوگوں کے یہاں آتی بھی تو بنی سے جیسے دھیمے لہجے میں گفتگو کرتی۔ چھوٹی اماں عائشہ سے کافی تنگ ہو چکی تھیں اور اس کو جلد از جلد وہیں واپس بھیجنے والی تھیں جہاں سے وہ آئی تھی۔ بنی کو جب یہ خبر ملی تو بڑے پریشان ہو گئے۔ ایک دن آہستہ آہستہ چل کر چھوٹے ابا کے یہاں ان کے کمرے تک اپنے دونوں ہاتھوں کو پیچھے باندھ کر گئے اور بولے، ''چھوٹے صاحب ابھی عائشہ کو ایک ہفتہ روک لیجیے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ عائشہ سے شادی کر لیں۔ مگر فیصلہ کرنے میں ایک ہفتہ اور لگے گا۔'' خیر، بنی داوا سے کہا گیا کہ وہ ذرا جلد ہی فیصلہ کریں۔ اس ایک ہفتے کے دوران بھی بنی داوا اسی رفتار سے لوگوں کا کھانا پکاتے اور اپنی آدھ سیر کی روٹی پکاتے جاتے اور عائشہ کے بارے میں سوچتے رہتے۔

ان دنوں عائشہ نے چھوٹے ابا کے گھر سے ادھر آنا بند کر دیا تھا اور اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرتی رہتی۔ دو ہی باتیں تو ہونی تھیں، یا تو بنی کے ساتھ زندگی گزارنے کے دن آنے والے تھے، یا پھر واپس اسی تاجر کے اندھیرے آنگن میں جانا تھا جہاں رات دن گھٹنا پڑتا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ بنی اسے ضرور اپنا لے گا۔ اور وہی ہوا بھی، بنی نے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد چھوٹے ابا سے کہہ دیا، ''ہاں، ہم عائشہ سے شادی کریں گے۔'' پھر کیا تھا! سب لوگ شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا کہ بنی اور عائشہ کی شادی ہے۔ میری منجھلی بہن جن کو ان چیزوں سے بہت ہی دلچسپی تھی، عائشہ کے شادی کے کپڑوں کی خریداری کرنے لگیں۔ عائشہ کے لیے کچھ زیور بھی بنوائے گئے۔ بنی داوا اپنی دھیمی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کام میں لگے رہتے اور یہ سارے انتظامات دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی زور زور سے ہنس بھی دیتے۔ بارات ہم لوگوں کے گھر سے چھوٹے ابا کے گھر جانی تھی جو کہ صرف دس گز کے فاصلے پر تھا۔ ایک ہی کمپاؤنڈ میں دونوں گھر تھے۔ قاضی جی آئے۔ دلہا دلہن کو بٹھایا گیا۔ نکاح پڑھوایا گیا۔ دونوں اب میاں بیوی ہو گئے۔ گھر کے کنارے ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی،

جس کے سامنے ایک چھوٹا سا آنگن بھی تھا۔ اسی جگہ کو خوب سجایا گیا۔ لال اور ہرے کاغذ سے بیلیں تراش کر لگائی گئیں۔ مٹی کی دیوار پر چونے کا چھاپ بھی ڈالا گیا۔ نانی اماں نے جتنے جوڑے بنی کی دلہن کے لیے جمع کیے تھے، وہ سب بھی اس کے حوالے کیا گیا۔ اسی کوٹھری میں دونوں رہنے لگے۔ ہم لوگوں کے لیے یہ شادی گڈے گڑیا کی شادی سے کم نہیں تھی۔ عائشہ کی تو دن عید گزر رہی تھی اور رات شب برات۔ ہر روز نئے نئے کپڑے پہن کر آتی۔ پھر مانگ میں سیندور لگاتی اور بات بے بات آنچل سے منھ چھپا چھپا کر کھلکھلانے لگتی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد بنی داوا اپنی بیگم کو لے کر شیخپورہ چلے گئے۔ ان دنوں نانی اماں وہاں اکیلی ہی رہ رہی تھیں۔ ویسے گاؤں میں کوئی اکیلا کب رہتا ہے۔ نانی اماں اپنے گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے بنی کی شادی میں شریک نہیں ہو سکی تھیں۔ ہر وقت بستی کے لوگ نانی اماں کے ارد گرد موجود رہتے تھے۔ یہاں تک کہ رات میں اس لق ودق مکان کے صحن میں نانی اماں کے ساتھ والی پلنگ پر ان کی حفاظت کے لیے کوئی نہ کوئی سو جاتا۔ نانی اماں کا رعب لوگوں پر بہت تھا۔ مگر لوگ انھیں بے حد پیار بھی کرتے تھے۔ عائشہ جو پٹنہ سے شیخپورہ گئیں تو وہ صرف عائشہ ہی نہیں رہیں، وہ تو نانی اماں کی باضابطہ بہو بن گئیں۔ نانی اماں نے بھی خوب خاطر مدارات کی۔ مدت سے دل کے اندر دبی ہوئی ممتا کو بنی اور عائشہ کے آگے انڈیل کر رکھ دیا۔ نتیجے کے طور پر عائشہ کے نخرے اور بھی بڑھ گئے۔ نانی اماں بھی اس کے ناز اٹھانے کے لیے بالکل تیار تھیں۔ ہم لوگ بھی اسی زمانے میں یعنی گرمیوں میں شیخپورہ گئے۔ عائشہ تو وہاں پہچانی ہی نہیں جاتی تھیں۔ نانی اماں کا کام تو دوسرے لوگ کرتے تھے اور نانی اماں ہر کام آگے آگے کر کے عائشہ کو دیتیں۔ دن کے بارہ بجے عائشہ سو کر اٹھتیں۔ نانی اماں جو ہر بات میں دوسروں کو ٹوک دیتی تھیں، وہ عائشہ کے معاملے میں بالکل خاموش تھیں۔ ایک شام وہ عائشہ کے لیے ایک ڈبری (دیا) جلا کر اٹھائے ہوئے اس کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں اور کہتی جا رہی تھیں کہ عائشہ کو بغیر روشنی کے نیند نہیں آتی ہے۔ ہم لوگ یہ سب تماشہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ گرمی کی چھٹیوں کے بعد ہم لوگ واپس پٹنہ آگئے اور پھر نہ جانے کیسے کیسے عائشہ بی بی اپنے نخرے نانی اماں سے اٹھواتی رہیں اور نانی ماں بھی کیسے کیسے اسے برداشت کرتی رہیں۔ یہ تو خدا ہی جانے۔

کچھ دنوں کے بعد پتہ چلا کہ عائشہ کی چھل بل والی شخصیت اور بنی کا خاموش مزاج میل نہ کھا سکا اور پھر دونوں نے طلاق لے لی۔ دونوں الگ الگ ہو گئے۔ عائشہ نہ جانے اس بھری دنیا میں کہاں گم ہو گئی۔ بنی داوا بھی مایوس اور پریشان

پٹنہ واپس چلے آئے۔ ہم نے بنّی سے جب پوچھا کہ آخر ایسا کیوں ہوا تو کہنے لگا، ''نہیں بُنّی، ناک میں دم کر دی تھی۔ ورنہ ہم اسے چھوڑنے والے نہیں تھے۔'' اس کی بات پر مجھے پورا پورا یقین تھا۔ بنّی ایسے نفاست پسند انسان تھے، ان کے ساتھ ایسی بجلی کی مانند لڑکی کا رہنا محال تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ عائشہ نے کسی ڈاکو سے شادی کر لی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ڈاکو پھر جیل میں ہے اور عائشہ اس کے مکان میں رہ رہی ہے۔ بنّی یہ سب سن کر پریشان ہو جاتے۔ اس کے ایک سال کے بعد بنّی قمر مجید (میری چچازاد بہن) کے یہاں کلکتہ میں ان کے گھر کام کرنے چلے گئے۔ لیکن کلکتہ میں ان کا دل نہیں لگا اور ایک دو ماہ میں ہی واپس اپنی اسی پرانی جگہ پر، جانی پہچانی گلی کوچوں میں پٹنہ واپس آ گئے۔ اس کے بعد ان سے جب ملاقات ہوئی تو کہنے لگے، ''ہواں (وہاں) جی نہیں لگا بُنّی۔ جانتی ہیں بُنّی ایک روز کلکتہ میں سبزی لاوے (لانے) کو ٹرام میں بیٹھے تھے کہ پیچھے جو مڑ کے دیکھا تو...... دیکھا کہ پیچھے والی سیٹ پر کمبھت (کمبخت) عائشہ بیٹھی ہوئی ہے۔ پھر تو اس کے بعد سے جی بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا اور چلتی ٹرام سے ہم کود کے بھاگے۔'' یہ سن کر مجھے بھی بنّی کی حالت پر بہت افسوس ہوا۔ بے چارا بنّی جس نے زندگی کو سجانے کے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے وہ سب چکنا چور ہو کر اس کے آگے بکھرے تھے۔ اب تو عرصہ گزر گیا ہے۔ ہم لوگوں کے گھر کے سبھی لوگ ہجرت کر کے انگلینڈ اور امریکہ چلے آئے۔ وہاں نہ تو میری امی تھیں اور نہ ہم سب بھائی بہن۔ نانی اماں بھی چھوٹی باجی کی محبت میں بہت پہلے ہی ویزا، پاسپورٹ بنوا کر پاکستان روانہ ہو گئی تھیں۔ بنّی داوا وہیں سلطان گنج پٹنہ کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔

وقت گزرتا گیا۔ بنّی ظاہراً تو اپنی زندگی کافی پرسکون گزار رہے تھے۔ عائشہ جیسی پراسرار شخصیت سے چھٹکارا پا کر کسی حد تک مطمئن سے تھے۔ دل میں کیا تھا وہ تو بنّی ہی جانتے تھے۔ اور کوئی کیسے جانتا؟ اس لیے کہ بنّی بہت خاموش رہتے تھے۔ میں اسی زمانے میں لندن چلی گئی تھی اور دو سال کے بعد واپس ہندوستان گئی تو پتہ چلا کہ بنّی کی دوسری شادی ہو گئی۔ جیسا بنّی کا سانولا رنگ تھا، اسی رنگت کی ان کی دوسری دلہن بھی تھیں۔ نام حسینہ تھا۔ ہم سے ملوانے کے لیے بنّی اپنی بیگم کو ساتھ لے کر ہم لوگوں کے گھر آئے۔ آگے آگے بنّی تھے اور پیچھے پیچھے ان کی بیگم۔ بہت ہی شرما کر بولے، ''دیکھو بُنّی! یہی میری بیوی ہے۔'' ساتھ میں ایک چار پانچ سال کی لڑکی بھی تھی جو ان کی بیگم کے پہلے گھر کی تھی۔ بنّی کی بیگم بہت شرما رہی تھی اور جتنی دیر تک رہی ساری کے پلّو سے آدھا منہ چھپا کر کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جھونپڑی میں چلی گئی۔ چھوٹے ابا نے اپنے باغ کے پچھلے حصے میں بنّی کو ایک جھونپڑی بنانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد بنّی

بڑے رازدارانہ انداز میں میرے قریب آئے اور بولے، ''بٹی! آپ نہیں جانتی ہیں میرے ساتھ اس شادی میں تھوڑا سا دھوکا کیا گیا ہے۔'' میں نے پوچھا، ''کیسا دھوکا بنی؟'' کہنے لگے، ''ارے ہم اپنے سسرال جب لڑکی دیکھنے گئے تھے تو ایک چوکی پر ہم کو بٹھا دیا گیا اور لڑکی والوں نے ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی کو میرے سامنے سے گزار دیا۔ ہم بڑے خوش ہوئے کہ ارے باپ، یہ تو بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ لڑکی دیکھتے ہی وہیں بیٹھے بیٹھے ہاں کر دی۔ شادی تو ہو گئی مگر بٹی کمرہ میں جاتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہ کمبخت (کمبخت) بیٹھی ہوئی ہے۔'' ان کی یہ بات سن کر مجھے بہت برا لگا۔ میں نے کہا، ''ایسے مت کہو بنی! یہ تو بہت ہی خراب بات ہے۔ تمھاری بیوی تو اچھی خاصی ہے۔'' پھر کہنے لگا، ''ہاں چلیے اب کیا کر سکتے ہیں۔ جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا۔''

خیر یہ تو گفتگو بنی کے ساتھ ہوئی۔ دوسرے دن صبح صبح میں بنی داوا کے جھونپڑے کی طرف گئی تو دیکھا کہ بنی کی بیگم اپنی جھونپڑی کے سامنے ہانڈی میں کچھ پکا رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ایک مچیا لا کر مجھے بیٹھنے کو دیا۔ تھوڑی سی ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگی، ''کا کہیں (کیا کہیں) بٹی ہمرے (میرے) ساتھ تو بڑا دھوکا ہوا۔'' میں سوچنے لگی کہ یا خدا اب ان کے ساتھ کیا دھوکا ہوا۔ ''میرا باپ تو بہت پہلے مر گیا تھا تو ہم چچا کے ساتھ رہتے تھے۔ میرے چچا کو پتہ چلا کہ لڑکے کے پاس بہت دولت ہے۔ پورا گاؤں ہے۔ تالاب ہے۔ کھیت ہے۔ آم کا باگ (باغ) ہے۔ مکان ہے اور جانے کا کا (کیا کیا)۔ جب یہاں آئے تو کا دیکھیں (کیا دیکھیں) ہیں کہ یہاں تو پھکیری (فقیری) ہے۔'' اس قصے کو سن کر مجھے یہ تو یقین آ ہی گیا کہ کسی نے شخبورہ کی زمین مکان اور باغ کا حوالہ ضرور دیا ہوگا تب ہی تو...... بے چاری کی شادی بنی سے ہو گئی۔ لیکن ساتھ ساتھ ہنسی بھی آئی کہ شکایت دونوں ہی طرف ہے۔ دنیا میں کوئی شاکر نہیں۔

میرے اس قیام کے دوران بنی کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی۔ شاید فلو ہو گیا تھا۔ لوگوں کو پتہ چلا کہ بخار ہے تو دوا بھجوا دی۔ اس کی بیوی دوا لے کر جھونپڑی میں داخل ہوئی، بولی، ''لو دوا کھا لو بخار اُتر جیہے (جائے گا)۔'' فوراً ہی بنی داوا کہنے لگے، ''ارے تجھ کو اتنا بھی خبر نہیں ہے کہ یہ دوا پھل کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔'' کھانے کو ایک پیسہ بھی نہیں ہے اور پھل کے انتظار میں بنی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سن کر مجھے بھی بے حد ہنسی آئی۔

بنی کی دوسری بیگم کے پہلے گھر سے ایک لڑکی تھی جو بنی اور اپنی ماں کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ تھی تو وہ بنی کی سوتیلی بٹی، مگر اسے وہ بے حد پیار کرتا تھا۔ بچوں کو وہ ہمیشہ سے ہی حد سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق اُس کو خوب لاڈ

اور پیار دیتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ لڑکی بھی بڑی ہوگئی۔ ماں باپ کو اب لڑکی کی شادی کی فکر ہوئی۔ بنی کو بہت زیادہ ہی فکر تھی۔ پتہ چلا کہ ایک لڑکا ہے جو کافی اچھا ہے۔ محنتی ہے اور رکشا چلاتا ہے۔ بنی ایک دن ذرا صاف ستھری قمیض پائجامہ پہن کر لڑکے کو دیکھنے گئے۔ وہاں ان کی خوب خاطر ہوئی۔ واپس آئے تو لوگوں نے پوچھا کہ کیسا گھر ہے، کیسا لڑکا ہے بنی۔ تو بنی نے جواب دیا، ''ارے وہاں کیا نہیں تھا۔'' لوگوں کا تجسس جب بڑھا تو پھر بنی سے پوچھا گیا کہ ''بنی ذرا اور تفصیل سے بتاؤ بھئی آخر تم نے وہاں کیا کیا دیکھا۔'' تو بنی نے جواب دیا، ''ارے ہم کا کا (کیا کیا) بتائیں کہ وہاں کیا تھا۔ چلو جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ دیکھو وہاں بڑا بڑا لٹو کرا تھا۔ موٹی موٹی رسی تھی۔ کونڑ تھا، بالٹی تھی، ایک او سارے میں گوئیٹھا ہی گوئیٹھا بھرا ہوا تھا۔''

اب جو لوگوں نے سنا تو سب کا پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ جب لوگ ہنستے تھے تو بنی نہیں ہنستے تھے۔ بلکہ اور سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اور ہاتھ گھما گھما کر کہتے کہ آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ اب بنی کی ایک ایک بات یاد کرتی ہوں تو نہ تو ہنسی آتی ہے اور نہ رونا ہی آتا ہے۔ کچھ عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔

ایک روز بنی بیٹھے بیٹھے بالکل سیدھے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے، ''اب اس دنیا سے دل بہت گھبرا گیا ہے۔ ہم اب یہاں نہیں رہ سکتے ہیں۔ یہ دنیا بیکار ہے۔ یہاں کے لوگ بہت خود غرض ہیں۔ ہم اب یہاں سے کہیں بہت دور، بہت دور چلے جانا چاہتے ہیں۔'' پوچھا گیا، ''آخر کہاں جاؤ گے؟'' بولے، ''چلے جائیں گے کسی جنگل میں۔ وہیں ایک کٹیا بنائیں گے اور اسی کٹیا میں اب ساری زندگی کاٹ دینی ہے۔''

لوگوں نے پہلے تو اسے مذاق والی بات سمجھ کر درگزر کیا لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کو یقین آ گیا کہ سچ مچ اب بنی اس معاملے میں کافی سنجیدہ ہیں۔ اور ایک دن پتہ چلا کہ آج بنی کی روانگی ہے۔ محلے کے سارے دوست اور رکشے والے سب بنی کے ساتھ ریلوے اسٹیشن تک گئے، کوئی لپٹ کر رویا، کسی نے بس آنسو بہائے کہ بنی کو اب تو آخری بار ہی دیکھ رہے ہیں۔ اور بنی بھی کافی سنجیدہ تھے۔ بیوی اور سوتیلی بیٹی دونوں ہی خاموش کھڑی تھیں۔ بنی کا اپنا ایک لڑکا جو اس نئی بیوی سے ہوا تھا، اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ بچے کو سینے سے لگا کر خاموش بیٹھی ہوئی بے چاری عورت۔ انسان یوں بھی اپنے مستقبل کے بارے میں خاموش رہ کر ہی سوچتا ہے۔ صبح سے شام، بے ارادہ زندگی کا ہر کام ہوتا جاتا ہے۔ بنی کے رہتے ہوئے بھی اِدھر اُدھر کام کر کے کما لیتی تھی۔ اور اب بنی کے چلے جانے کے بعد بھی کچھ کر ہی لے گی۔ ہزاروں لاکھوں غریب لوگوں کا

پیٹ کسی طرح بھر جاتا ہے، اسی طرح وہ بھی اپنا وقت کاٹ ہی لے گی۔ وہ خاموش بھی اسی لیے ہوگئی تھی کہ وہ کچھ اپنے واسطے سوچ چکی تھی۔ اسے شاید صبر ہی آچکا تھا کہ وہ بنی کے بغیر بھی زندگی کے دن کاٹ لے گی۔ اور بس۔ خاموشی سے کھڑی کھڑی بنی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

بنی پٹنہ سے ٹرین سے پہلے دہلی گئے۔ وہاں ایک دو لوگوں کے پاس جن کو وہ جانتے تھے، گئے کہ کچھ پیسہ دیجیے تو یہاں سے آگے جو ہمالیہ پہاڑ کے قریب جنگل ہے وہاں جانا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اتنا فالتو پیسہ نہیں ہے۔ جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ۔ دلّی میں سارا دن بنی بھوکے ادھر اُدھر مارے پھرے اور کافی پریشان رہے۔ گھر سے باہر دلّی جیسے بڑے شہر میں کون کس کو پوچھتا ہے؟ اللہ ہی جانے اور ان پر کیا کیا گزری۔ بس ایک جنون تھا کہ دور کے جنگل چلے جائیں گے جہاں ان کو کوئی تلاش نہ کر سکے۔ بنی داوا اگر پڑھے لکھے ہوتے تو کوئی بہت بڑے فلسفی ہو جاتے، یا کوئی بڑے شاعر بن جاتے۔

دلّی جا کر وہاں کی مصیبتوں کو سہہ سہہ کر بنی کافی پریشان ہو گئے اور آخر کار ایک دن کسی ٹرین سے واپس پٹنہ چلے آئے۔ پھر سے سارے لوگ اِرد گرد جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے: ''ارے بنی تم واپس کیوں چلے آئے؟'' تو جواب میں بولے: ''ہم ایک کتاب لکھنے جا رہے ہیں جس کا نام ہوگا ''ٹھوکر''، یہ دنیا بڑی بے رحم ہے، یہاں کوئی کسی کا نہیں ہے۔ سارے لوگ دولت کے پجاری ہیں۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ سچ نہیں ہے۔ سچ کو کھوجتے رہو مگر تم کو سچ نہیں ملے گا۔ یہ ساری کی ساری دنیا بیکار ہے۔ اس سے کسی کو کچھ نہیں ملنے والا ہے۔''

بنی داوا کی داستان میرے بچپن کی یادوں کا ایک حصہ ہے۔ بے حد پیارا، نفیس، سیانا، سنجیدہ انسان، جسکے ساتھ زندگی نے ایک بڑا مذاق کیا، یعنی اسے ایک ایسے غریب گھرانے میں پیدا کر دیا جہاں اس کی ذہنی صلاحیتوں کے نکھرنے کے لیے کوئی موقع نہیں تھا۔ جب ایک فقیر اسے ہمارے گھر چھوڑ گیا تو اسنے اسی نئی جگہ کو اپنا گھر سمجھا۔ یہی سوچا کہ اب بقایا زندگی یہیں کاٹنی ہے۔ نانی اماں کا پیار ملا، تو نانی اماں کو ہی اپنا خدا مان لیا۔ گھر کے سب لوگوں پر جان نچھاور کرتا رہا۔ اپنا گھر بسانے کی فکر کبھی نہیں ہوئی، تو بھی نانی اماں کی امید آخر تکمیل تک پہنچی اور ایک کم عقل، باتونی، چلبلی لڑکی سے شادی بھی ہو گئی۔ یہ شادی نہ نبھ سکی تو اپنے پرانے ڈھرّے پر لوٹ آیا۔ دوسری شادی ہوئی۔ گھر گرہستی جیسا کہ ہو سکتا تھا، ایک بار پھر شروع ہوا لیکن بنی داوا کے دل میں جو فقیری تھی، جو بیراگ تھا، جو درویشانہ صفت تھی وہ اسے چین سے نہ رہنے دے رہی

تھی۔ جوگ لینے کے لیے بھی تو جنگل تک جانا پڑتا ہے۔ بن باس دھارن کرنا پڑتا ہے۔ ہر کوئی رام یا گوتم بدھ نہیں بن سکتا۔ سو بنی داوا اس کاوش میں بھی ناکام ہوا۔

وائے ری زندگی! تیرے رنگ نیارے ہیں!!

☆☆☆

(۳)

میری امی کے ایک بہت ہی دور کے چچا تھے، جن کا نام ناظر تھا۔ ان کے تین لڑکے تھے، مقدوم ماموں، مقصود ماموں اور صمد ماموں۔ ان کی ایک لڑکی بھی تھی جو فاطو کہلاتی تھی۔ مقصود ماموں اور صمد ماموں کا انتقال تو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہوگیا تھا۔ لیکن مقدوم ماموں اور ان کی بیگم اور ان کے بچوں سے ہم لوگوں کی ملاقات ہر سال شچورہ میں ہوتی تھی۔

فاطو پھوپھی کے بارے میں امّی بتاتی ہیں کہ وہ ایک بہت ہی باوقار اور نیک شخصیت کی مالک تھیں۔ شادی وقت پر ہوگئی تھی اور میاں بیوی خوشی خوشی رہنے لگے۔ نہ کبھی لڑائی ہوئی نہ جھگڑا۔ سکون سے زندگی گزر رہی تھی۔ لیکن یک بیک نہ جانے ان کے شوہر کے دل میں کیا سمایا کہ ایک دن کسی کو کسی بھی طرح کی اطلاع دیے بغیر گھر سے روانہ ہو گئے۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی کہاں جاتا؟ بس دعا اور انتظار کا سہارا لے کر فاطو پھوپھی زندگی کے دن کاٹتی رہیں۔ دو دن، چار دن، ہفتوں مہینوں اور سالوں تک انتظار کیا مگر وہ واپس نہ آئے اور فاطو پھوپھی کا یہ عالم تھا کہ ٹھیک مغرب کے وقت دروازے پر لالٹین لے کر بیٹھ جاتیں اور آنسو بہاتیں۔ زندگی کے دن اسی ڈھب سے گزارتی رہیں اور یہ ایک معمول بن گیا۔ ایک دن ٹھیک دس برسوں کے بعد، کسی نے دروازے کی کنڈی ہلائی۔ فاطو پھوپھی حسب عادت لالٹین لے کر دروازے پر گئیں تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ دروازے پر میاں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ فاطو پھوپھی کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ مگر اس بار خوشی کے آنسوؤں کی باری تھی۔ پھوپھا سے کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ کیوں گئے تھے؟ کہاں گئے تھے؟ جہاں گئے تھے وہاں کیا کیا؟ کہاں رہے؟ کیسے رہے؟ فاطو پھوپھی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ ان کے بارے میں سوچا بھی کہ نہیں۔ جس طرح

سے بھی واپس آئے ان کو قبول کرلیا، اور پھر گھر میں ایسی بہار آئی کہ فاطو پھوپھی کو اپنی قسمت پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اُسارے کے کونے میں اناج ہی اناج۔ خوب قسم قسم کے کھانے پکنے لگے۔ دو دو دائیاں گھر میں کام کرنے کو رکھی گئیں۔ بھنڈار جو خالی پڑا تھا، کھانے پینے کی چیزوں سے بھر گیا۔ دونوں ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کنگن، ساریاں اور جانے کیا کچھ نہیں۔ فاطو پھوپھی رات بھر سوتیں، صبح کو ہشاش بشاش اٹھتیں۔ دس سال تک اللہ تعالیٰ سے مانگی ہوئی دعائیں ایسی کام آئیں کہ دنیا دیکھتی ہی رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ایسا دن پھیرا کہ فاطو پھوپھی کی روٹھی ہوئی قسمت، اور مسکراہٹ واپس آگئی۔

مرد ہو یا عورت، اللہ کی رحمت سب کو ڈھانک لیتی ہے۔ ان کی چال ڈھال، رفتار گفتار، عادات واطوار، کشش اور پیار کا سبب بن جاتے۔ وہ انسانیت کے گلے کا ہار بن جاتے۔ ہوائیں آنکھیں بچھاتیں۔ روشنی کا سایہ بن جاتی۔ برکت ان کی لونڈی بن جاتی۔ وہ قدرت کی آنکھ سے دیکھتے تھے، اسی کے کان سے سنتے تھے، اسی پاؤں سے چلتے تھے۔ یہ سب یوں ہوتا تھا کہ ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ نہ قدم نہ حشم نہ دھوم نہ دھام نہ پس خیمہ نہ پیش خیمہ، نہ بول نہ چال، نہ چیخ نہ پکار نہ شور وشر۔ دھیمی سرسراہٹ بھی نہیں۔ تھا سب لیکن کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اب حشم قدم بہت ہے مگر اس کے پیچھے کچھ نہیں۔ خالی ڈبے، رنگین نقش ونگار سے بھرپور چمک دمک سے آراستہ سنوار، سنوار، بناؤ وپیراستہ سب کچھ باہر ہے، تو اندر کیا رہے؟

پہلے اندر سب تھا۔ باہر کچھ نہیں۔ لیکن زبان کہہ دیتی وہ ہو جاتا۔ وہ بے کھائے آسودہ رہتے، بے پیئے سیراب رہتے اور بے پہنے باوقار اور کامیاب۔

یہ تو بہن تھیں۔ بھائی میں مقدوم ماموں، پچکوڑی نانا اور جمال نانا۔ تینوں کے گھر ایک ہی قطار میں تھے۔ پچکوڑی نانا اور جمال نانا دونوں سگے بھائی تھے۔ ہم نے جب ہوش سنبھالا تو دونوں خاندان کو ایک ساتھ رہتے ہوئے دیکھا۔

جمال نانا نے مولوی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے لڑکے ضیا الدین، خیر الدین اور لڑکیاں نمو، زیتون اور خورشیدہ تھیں۔ اب ضیاء الدین ماموں تو کیلی فورنیا میں اپنے لڑکے کے ساتھ رہتے ہیں۔ نمو خالہ اور زیتون خالہ کا انتقال بھری جوانی میں ہی ہو گیا تھا۔ زیتون خالہ کا انتقال تو ان ہی دنوں ہوا تھا جب ہم لوگ شیخپورہ میں موجود تھے۔ اور پوری بستی پر ایک غمگین اور بوجھل فضا سی جو مسلط ہوئی تھی، اسے میں آج بھی محسوس کرنے لگتی ہوں۔ یہ وہی زیتون خالہ تھیں جو بے طرح گوری چٹی اور حسین تھیں اور میری خلیری بہن، یعنی چھوٹی باجی کے پاس کشیدہ کاری اور سلائی سیکھنے کے لیے آتی تھیں۔ یہ

وہی زیتون خالہ تھیں جن کا گاؤں کے آخری کنارے پر بنا ہوا گھر کسی کینوس پر ایک حسین پینٹنگ کی طرح ٹنگا ہوا لگتا تھا۔ صبح سویرے، خاص کر املی کے درخت کے نیچے بیٹھ کر میں اس مکان کو دیکھا کرتی تھی، تو ایسا لگتا تھا کہ مکان کے پائے سے کُہاسے لپٹے ہوئے ہوں، مٹی سے پوتے ہوئے پائے، ان کے پیچھے سے دھندلا درخت اور دھندلا کھیت کسی حسین منظر سے کم نہیں تھے۔ اور اسی دوران اگر کوئی اس برآمدے پر آ کر بیٹھ جاتا تو ایسا لگتا کہ فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ اس کیف میں ڈوبے ہوئے شام وسحر کو چھوڑ کر یک بیک سارے لوگ پاکستان اٹھ کر چلے گئے۔ اسی مکان کے سامنے سے قبرستان بھی نظر آتا تھا۔ زیتون خالہ کی قبر کو میں پہچانتی تھی۔ جب بھی املی کے درخت کے نیچے سے ہو کر پچکوڑی نانا کے یہاں جاتی تو وہ قبر نظر آتی جسے میں کنکھیوں سے دیکھتی اور رونے لگتی تھی۔ میں نے دسویں کلاس میں پروفیسر محسن صاحب جو کہ سائیکولوجی کے پٹنہ میں ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ تھے۔ ان کا افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' پڑھا تھا، تو بس بے ساختہ وہی گھر، وہی کہاسے سے لپٹا ہوا ستون، اور سامنے کے قبرستان کی فضا ذہن میں تیرنے لگتی تھی۔

میرے تصور میں اس افسانے کی ہیروئن جمال چچا کے اسی مٹی کے مکان کے پائے سے لپٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ جب اس کا باپ کسی بھی لاش کو دفن کر کے آتا تھا، تو وہ مسکرانے لگتی تھی۔ اس لیے کہ وہی اس کا ذریعۂ معاش تھا۔ آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کی اپنی بچی مرگئی۔ جب اس کا باپ اس کو دفنا کر آیا تو وہ اسی پائے کو پکڑ کر کھڑی تھی اور اس دن بھی مسکراتی ہی ہوئی نظر آئی۔ آج بھی اگر صرف کوئی اس افسانے ''انوکھی مسکراہٹ'' کا نام بھی لے لیتا ہے تو مجھے جمال نانا کا وہی گھر اور اسمیں داخل ہونے کا واحد دروازہ اور وہ ستون نظر آنے لگتے ہیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد پچکوڑی نانا کے سارے بچے اس میں رہنے لگے اور نانی [illegible] انی کہلاتی تھیں وہ ہر سال گیارہ مہینوں تک ہم لوگوں کا مستقل انتظار کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت یہ رواج نہیں [illegible]ت تھی کہ ادھر کسی کو یاد کیا اور اُدھر اس کے پاس پہنچ گئے۔ جو یاد کرتا تھا، اسکو ایسا لگتا تھا کہ وہ شخص اس کے پاس آگیا ہے۔ اس کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سال میں صرف ایک ماہ نانی اور دیگر سب لوگوں سے ملتی تھی، مگر آج تک ایسا محسوس کرتی ہوں کہ پوری زندگی ہی ان لوگوں کے ساتھ گزاری ہے۔ اسی پیار محبت اور شفقت نے کچھ ایسا کرشمہ کیا ہے کہ تنہائی میں جب آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور شیخپورہ کی فضا، سماں، ہوا، دھوپ اور چاندنی کو ذہن میں لاتی ہوں تو طبیعت بشاش ہو جاتی ہے اور پھر نئے سرے سے گنگنانے لگتی ہوں۔ من ہی من میں گیت گانے لگتی ہوں۔ میری ایک غزل کا مصرعہ اس

صورت حال کا نقشہ کھینچتا ہے:

جو ہیں زندگی کی حقیقتیں، وہی بن گئی ہیں کہانیاں

یہ صحیح ہے کہ ذی حس انسان اپنی زندگی کے تجربات و حادثات کے علاوہ روزمرہ کی معمولی معمولی اور غیر اہم یادوں کے تانے بانے بنتا ہوا اس زندگی کو اپنے خوابوں میں بسا لیتا ہے۔ اور یہ خواب اسے سوتے جاگتے ستاتے رہتے ہیں۔

مقدوم ماموں کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑے لڑکے کا نام صادق اور چھوٹے کا نام ذاکر تھا۔ مقدوم ماموں ہمیشہ گاؤں میں ہی رہے۔ خود بھی گاؤں کی ہی تعلیم حاصل کی اور بچوں کو بھی نماز، قرآن اور بس تھوڑی سی اردو لکھنا پڑھنا سکھائی۔ مقدوم ماموں کے گھر میں داخل ہونے کے لیے تنگ و تاریک گلیوں سے گزر کر، مٹی کی دو سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا تھا۔ پھر ان دو سیڑھیوں پر چڑھ کر دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی جاتی۔ اس کے کافی دیر کے بعد ذاکر کی امی اندر سے بجھی بجھی سی آواز میں سوال کرتیں، ''ارے کون ہے رے؟'' پھر دروازہ کھلنے کی آواز آتی۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر مسکرانے لگتیں اور کہتیں، ''اندر آؤ، اندر آؤ بابو۔'' ہم لوگ کسی پلنگ یا چوکی پر بیٹھ جاتے۔ وہ زیادہ تر کام ہی کرتی رہتی تھیں۔ جب بھی میں ان کے گھر گئی، میں نے یہی دیکھا کہ وہ تین منھ والے مٹی کے چولھے پر کھانا پکا رہی ہیں۔ سوکھے پتوں کو چولھے کے منھ میں ڈال ڈال کر چولھے کی آگ جلاتیں، پھر اسی سے گھر کے سارے لوگوں کے لیے کھانا پکاتیں۔ وہ اسی انداز سے کھانا پکانے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اور انھیں یہ کام کبھی مشکل نہیں لگا۔ گرمی کی شدت سے ان کے جسم اور چہرے پر ہمیشہ گھموری (چھوٹے چھوٹے دانے) نکل آتے۔ کم آمدنی میں سارے بچوں کی دیکھ ریکھ کرتیں۔ ہر وقت مشغول رہتیں۔ آنگن سے اُسارا اور اُسارے سے آنگن تک چکر کاٹتی رہتیں۔ کبھی کبھی دروازے سے منھ نکال کر ذاکر کو پکار لیتیں۔

مقدوم ماموں کے دیگر سب بچے تو ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہی تھے لیکن چھوٹا لڑکا ذاکر جو ذرا کمزور تھا وہ گلی کے لونڈوں کی ہنگامہ خیز شرارتوں اور شور و غل سے جیسے بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اس کی زندگی میں دھوپ اور چھاؤں اس کا اس تیزی سے پیچھا کرتی کہ اسے ستانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس کے دماغ میں الجھے ہوئے دھاگوں کی طرح ایک بے بسی تھی اور اسی بے بس ماحول میں ان دھاگوں کے الجھاؤ کو اس طرح سلجھاتا کہ وہ اور بھی الجھنے لگتے۔ اس کی یہ جد و جہد اسے کہیں نہیں پہنچا رہی تھی۔ وہ دن بہ دن کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا۔ نفسیاتی علاج تو دور کی بات تھی، وہ جسمانی علاج سے بھی محروم تھا۔

ذاکر ذرا کمزور پیدا بھی ہوا تھا اور اسی طرح سے نامناسب ماحول نے اسے اور بھی کمزور بنا دیا تھا۔ بولتا اتنا آہستہ کہ قریب قریب الفاظ کو رگھانے لگتا۔ اور آواز نکلتی تو بالکل پھنسی پھنسی سی۔ اور یہی وجہ تھی کہ محلے کے دوسرے چالاک اور مضبوط بچے اسے رات دن کسی نہ کسی بات پر چڑھاتے رہتے۔ بات صرف چڑھانے تک ہی نہیں رہتی، بلکہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے دوسرے بچے اکثر اسے دھکیل بھی دیتے تھے۔ وہ خفا بھی ہوتا تو اس کا انصاف کرنے والا جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک کمزور سی ماں، جو گھر کے کاموں میں پھنسی رہتی تھی۔ باپ اس کی کم عمری ہی میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ باقی دوسرے لوگوں کو اس کی فکر کیوں رہتی؟ ایک بار تو کسی بچے نے اس کو اس بری طرح دھکیلا تھا کہ اس کا گھٹنا بالکل مڑ گیا اور پھر اس غریب کو ایسی تکلیف رہنے لگی کہ سیدھا ہو کر چلنا بھی اس کے لیے محال ہو گیا۔ ذاکر کی کمزوری کا کیا پوچھنا! ایک تو بیچارہ کمزور تھا ہی، دوسرے اتنے بڑے حادثے سے اور بھی لاچار ہو گیا۔ لیکن اسی لنگڑی چال سے روز مسجد جاتا، وہاں اذان دیتا، قرآن شریف کی تلاوت کرتا اور پھر اللہ رسول پر پورا ایمان رکھتا۔ عقل تو پہلے ہی گول تھی۔ اب تو اور بھی بچی کھچی عقل پر محلے کے لونڈوں کا حملہ ہو چکا تھا۔ ''اور جا کر (ذاکر) بابو کیا حال ہے جی؟'' بہت آہستہ آہستہ سے بچارا جواب دیتا، ''ٹھیک ہیں۔'' ''کا شادی نا کرو گے؟'' اور وہ سنجیدگی سے مسکرا کر صرف اتنا کہتا، ''دیکھو اللہ کو کب منظور ہے!'' اتنا جواب دے کر وہ جلدی جلدی آگے بڑھ جاتا اور اسی میں اپنی خیریت سمجھتا۔

لرزشوں اور لغزشوں کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ذاکر جب ہم لوگوں کے آنے کی خبر سنتا تو پھولا نہ سماتا۔ پورے گاؤں میں ایک ایک کو جا کر ہم لوگوں کے آنے کی خبر دیتا۔ گرمی کی چھٹیوں کے ایک ماہ میں ہی وہ ہم لوگوں کی موجودگی میں تر و تازہ ہو جاتا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ہم لوگوں کے رہتے ہوئے گاؤں کا کوئی بھی انسان اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ہم لوگوں کے گھر پر لنگڑاتا ہوا آتا اور کنوئیں کے سامنے والی ایک چھوٹی سی دیوار کو پکڑ کر تھوڑی دیر کھڑا رہتا، پھر آہستہ آہستہ آنگن میں اُترتا۔ امی اس کی خوب خاطر کرتیں۔ ہم لوگ اس کے ساتھ فوٹو کھنچواتے۔ وہ قریب قریب روز ہی آتا۔ بستی کے لڑکوں کو پتہ تھا کہ اگر ہم لوگوں کی موجودگی میں کسی نے بھی اس کو کسی طرح کی تکلیف پہنچائی تو پھر بھیا وغیرہ انھیں چھوڑیں گے نہیں۔ محبت اور ہمدردی کرنے والوں کی بھی کیا طاقت ہوتی ہے۔ اسی طاقت سے ذاکر کے چہرے پر ایک دلنواز مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ چند دنوں میں بشاش ہو جاتا۔

ذاکر قسم کے لوگ ایک علامت ہوتے تھے۔ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنا، دوسروں کے کانوں سے سننا، وہ جیتے

تھے محبت کے لیے، سوتے تھے دوسروں کی راحت کے لیے، اور جاگتے تھے دوسروں کی خدمت کے لیے۔ اب یہ علامت اپنی معنویت کھو چکی ہے، اپنی قیمت بھلا بیٹھی ہے۔ اس لیے ایسے لوگ کیڑے مکوڑے بن گئے ہیں جنھیں دنیا پامال کرتی ہوئی چلتی ہے۔ ورنہ ان کے آگے ہوائیں اپنی سرسراہٹ بھول جاتی تھیں۔ یہ چار عناصر کے مرکب تھے جیسے ہر انسان ہے۔ مگر ہر عنوان کو پہچانتا تھا اور اپنے جوہر ان پر نثار کرتا تھا۔ ان کی معصومیت سے خدا کی قدرت کھیلتی تھی۔ ان کی سادگی سے رحمت آنکھ مچولی کرتی تھی۔ ان کا ظاہر، ان کے باطن کو سنوارنے کے لیے اندر چلا گیا تھا۔ اور ان کا باطن ان کے وجود پر چھا گیا تھا، اس لیے یہ پہچانے نہیں جاتے تھے لیکن ہر چیز ان کی پہچان بن جاتی تھی۔ یہ کسی پہچان کے محتاج نہیں تھے۔ لیکن ساری پہچانیں ان کی محتاج تھیں۔ ذاکر کو ہم سب کا پیار حاصل تھا۔ اس لیے کہ ہم اس کے باطن سے تھوڑے بہت آشنا تھے۔ اتنا ہی ذاکر کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس کی ضرورت سے فاضل، اس کی احتیاج سے زیادہ، اس کی طلب سے سوا۔

اس کی زندگی جو اتنے سارے طوفانوں اور بحرانوں سے گھری ہوئی تھی، وہ ان چند دنوں میں دم لینے لگتی تھی، ستانے لگتی تھی۔ کبھی بنگلے پر اور کبھی زنان خانے میں آ کر خوش گپیاں کرتا۔ ایک بار ہم لوگ پٹنہ سے ٹیپ ریکارڈر لے کر شیخپورہ گئے تھے۔ گاؤں کے لیے اُس زمانے میں ٹیپ ریکارڈر ذرا ایک نئی سی چیز تھی۔ سب لوگ باری باری اپنی آواز ٹیپ کرتے، پھر اُسے سنتے۔ ذاکر میاں نے بھی اپنی خواہش ظاہر کی، ''ذرا ہم بھی ایک گانا گاتے!'' بھیا نے کہا، ''ہاں ذاکر ضرور گاؤ۔'' ذاکر گانا گانے لگے، ''میری پیاری بہنیا، بنے گی دلہنیا''، گاؤں کے سارے لڑکے جو ٹیپ ریکارڈر کو گھیرے کھڑے تھے ہنس ہنس کے دیوانے ہو رہے تھے اس لیے کہ ذاکر گانا کیا گا رہے تھے، گانے کو بول رہے تھے۔ کسی نے آواز لگائی، ''ابھی گانا یاد کر رہے ہو یا گا رہے ہو؟''۔ ''سمجھتے نہیں ہو، ہم گانا گا رہے ہیں جی!''

شیخپورہ سے ٹم ٹم اور ٹرین کا سفر طے کر کے ذاکر کبھی کبھی گیا شہر میں میرے سسرال آ جاتے اور گیٹ پر مالی سے پوچھتے، ''باجی امریکہ سے آئی ہیں؟'' کوئی جواب دیتا، ''تم کو پتہ نہیں ہے کہ تمھاری باجی دسمبر میں آتی ہیں؟ ذاکر میاں، آپ بغیر پتہ لگائے ہوئے اتنی دور سے کیوں آ جاتے ہیں؟'' پھر جواب سنتے ہی بیچارہ فوراً واپس لوٹ جاتا۔ میں یہ جب بھی سنتی مجھے بے حد تکلیف ہوتی۔ مگر ذاکر کے دماغ میں جو بات آتی تھی وہ وہی کرتا تھا۔ ہم جب بھی ہندوستان جاتے تو اسے بہت سمجھاتے، ''ذاکر، یہ تم بغیر پتہ کیے ہوئے آ جاتے ہو۔ ہم تم کو ضرور خبر کریں گے کہ ہم کب آنے والے ہیں۔''

میں جب بھی ہندوستان گئی، جاتے ہی ذاکر کو خبر بھجوائی اور خبر پاتے ہی ذاکر میاں دوسرے ہی دن براجمان ہو

گئے۔ ذاکر کا رنگ تو بالکل گورا چٹا تھا مگر اس دھوپ کی شدت اور زندگی کی سختیوں کو برداشت کرتے کرتے رنگ بالکل سنولا گیا تھا۔ سر پر نہرو کٹ ٹوپی، چند بالوں کی چگی داڑھی اور پھر سفید ذرا میلی ہی سی شیروانی اور شیروانی کے اوپر سے ایک بڑی سی چادر سر سے اوڑھے ہوئے ہوتا۔ اپنی بگڈ یری آنکھوں سے مجھے بڑی محبت سے دیکھتا۔ ایک بار جب میں گئی تھی تو ادھر اُدھر کی بات کرتے کرتے یک بیک ایک دو منٹ کے اندر ہی زور زور سے رونے لگا۔ میں گھبرا کر اس کے پاس گئی۔
''ارے ارے کیوں رو رہے ہو؟ ذاکر بتاؤ گے بھی۔'' زور زور سے روتے ہوئے بولنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ آخر رو رو کر کیا بول رہا ہے۔''باجی، ہم آپ تینوں بہنوں کے لیے بہت پریشان رہتے ہیں۔'' ہم نے جلدی جلدی کہا،''ہم لوگوں کے لیے اتنا کیوں پریشان رہتے ہو؟ ہم لوگ وہاں بہت مزے میں ہیں ذاکر۔''
''نا باجی آپ نا جانیں ہیں (نہیں جانتی ہیں) کہ ہم کتنی کتنی رات سونہ سکے کہ ای (یہ) امریکہ اور عراق کی لڑائی جو ہوئی تو کا جانے میری تینوں باجی زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔''
مجھے ہنسی آنے لگی۔ لیکن میں اسے پھر بتانے لگی،''امریکہ کی سرزمین پر لڑائی نہیں ہوئی تھی ذاکر! وہ لڑائی تو عراق میں ہوئی تھی۔'' لیکن میں یہ سوچنے لگی کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔ آخر یہ چاہتا کیا ہے؟ پھر قریب قریب رو کر ہی کہنے لگا،''باجی، ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ آپ لوگ جہاں بھی رہیے خیریت سے رہیے۔ مگر میرے پاس کوئی ایک بھی ریڈیو نہیں ہے جس سے آپ تینوں بہنوں کی خیریت ملے۔ اس لیے ایک ریڈیو ہم کو خرید دیجیے۔'' یہ سن کر مجھے اور بھی ہنسی آئی۔ ہم نے کہا،''ذاکر تم کو اس قدر رونے کی کیا ضرورت تھی؟ تم پہلے ہی کہتے تو ہم تمھارے لیے ریڈیو خرید دیتے۔'' خیر، کسی سے ہم نے ایک ریڈیو منگوا کر اس کو دے دیا۔ جب گھر سے جانے لگا تو باہر برآمدے میں کچھ من چلے لوگ بیٹھے تھے جنھوں نے ذاکر کو چھیڑنا شروع کیا......''ارے اب تو ذاکر بابو کے پاس ریڈیو ہو گیا، مگر تم تو میاں اتنا روزہ، نماز اور قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہو، تم کو یہ ریڈیو اور دنیا کی خبر سے کیا مطلب ہے؟ تم تو بس مسجد جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔ لاؤ یہ ریڈیو مجھے دے دو۔'' کچھ ہی لمحوں کے بعد کچھ سوچ کر کہنے لگا،''اچھا سلام علیکم ہم چلے۔'' اور اتنی تیزی سے بھاگا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ چار پانچ دنوں کے اندر ذاکر پھر شیخوپورہ سے گیا آ گیا اور اُس کے ہاتھ میں وہی ریڈیو بھی موجود تھا۔'' کیسے ہو ذاکر؟، کیسے کیسے پھر آنا ہوا؟'' تو بولے،''باجی! یہ ریڈیو تو بڑی (بہت) کھڑ کھڑاوے ہے۔'' یعنی اس کی آواز میں بہت disturbance ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ''باجی ای (یہ) تو بڑی (بہت) کھڑ کھڑاوے ہے'' لوگوں کے قہقہے کا بہانہ بن گیا۔

شیخوپورہ میں ہم لوگ ذاکر اور اس کی امی سے ملنے گئے تو گفتگو کے دوران یک بیک ذاکر میاں اچھل کر بولے، ''باجی باجی آپ کو پتہ چلا، میرے بڑے بھیا کو نوکری مل گئی ہے!'' یہ سن کر واقعی میں بے حد خوش ہوئی کہ چلو اس گھر کی حالت تھوڑی سدھر جائے گی۔ اگر گھر کے بڑے لڑکے کو نوکری مل گئی ہے تو وہ سب کی دیکھ ریکھ کرلے گا۔ ہم لوگ بیک وقت بول اٹھے، ''مبارک ہو ذاکر! یہ تو بہت ہی اچھی خبر تم نے سنائی۔'' اسی دوران میں یہ پوچھ بیٹھی، ''نوکری کہاں ملی ہے؟ جہاں آباد میں؟'' جہان آباد شیخوپورہ سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر شہر نما گاؤں تھا جہاں ڈاکٹر، چھوٹا ہسپتال اور ضرورت کی ساری چیزیں ملتی تھیں۔ ذاکر بولا، ''نہیں باجی اسی گاؤں کے قریب والے دوسرے گاؤں میں بھیا کو چوہا مارنے کی دوا بیچنے کی نوکری ملی ہے۔ ارے باجی، لوگ اس میں بہت کماتے ہیں۔ یہ معمولی نوکری نہیں ہے۔'' میں بالکل خاموش ہوگئی اور ذاکر کی ہر بات پر ہاں ہاں کرتی رہی۔ میں اس کی معصومیت اور کم عقلی پر خاموش آنسو بہاتی رہی۔ خود تو بیچارہ صرف مسجد میں اذان دیتا تھا جس کی تنخواہ امی کی طرف سے کچھ دی جاتی تھی۔ نانی اماں بچپن میں ایک قصہ سناتی تھیں کہ کسی لڑکی کی شادی ہونے والی تھی تو لوگوں نے پوچھا کہ لڑکا کیا کرتا ہے۔ پتہ چلا کہ لڑکا مسجد میں اذان دیتا ہے اور لڑکا کا بڑا بھائی قاعدہ بغدادی کی کتاب پڑھتا ہے۔ وہی قصہ اب واقعی نظر کے سامنے تھا۔ تھوڑی دیر تک ان کے گھر پر ہم لوگ اور رکے۔ چائے آئی اور ساتھ میں جہان آباد کے بسکٹ۔ چائے مجھے بہت پسند آئی جو کہ دوئندھی (دھوئیں والی) تھی۔ ایسی دھوئندھی چائے میں پہلے نہیں پسند کرتی تھی، مگر اب اس دھوئیں والی چائے سے ایک سے ایک حسین یادیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ میں اس چائے کو مزے لے کر پیتی رہی۔ نانی اماں ہمیشہ بڑے زور سے بگڑتی تھیں اگر گھر میں کسی نے دھوئیں والی چائے بنادی تو۔

''توبہ توبہ! کیسی دھوئندھی چائے ہے، پھیکو جی حلق سے اُترے نا ہے!''

ہم لوگوں کو رخصت کرنے کو ذاکر بھی دروازے تک آئے، ''پھر کب آیئے گا باجی؟ جلدی آیئے گا نا؟'' اسی طرح کے سوالات کرتے کرتے یک بیک اشکبار ہو کر رونے لگے اور کہنے لگے، ''باجی، ہم کو کوئی طرح سے امریکہ بلوالیجیے۔ یہاں اب یک دم جی نہیں لگتا ہے۔ سب لونڈا (لڑکا) ہم کو دھکا دے دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تمرا (تمھارا) کپڑا امیلا ہے۔ تنگ تنگ ہو کے رہ گئے ہیں باجی! کبھی کبھی تو مسجد کے اندر جانے نہیں دیتا ہے۔'' مجھے اس پر واقعی بہت ترس آنے لگا اور میں اس کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتی رہی، ''ذاکر، امریکہ جانا اتنا آسان نہیں ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ اللہ ہی جانے ذاکر کو یہ سب باتیں سمجھ میں بھی آئیں کہ نہیں۔

ہم لوگ شخپورہ سے پٹنہ واپس آ گئے تو ایک روز پھر ذاکر ہم لوگوں سے ملنے کے لیئے پٹنہ آ گیا۔ میری امی کے پاس بیٹھا اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں بولا،" پھوپھی، ہم ایک مولی صاحب (مولوی صاحب) سے پوچھا ہے کہ ہم کو کیسے زندگی گزارنا چاہیے، تو مولی صاحب بولے، کہ گجائے عمری (قضائے عمری) پڑھیے اور جلد از جلد ساوی (شادی) کر لیجیے۔" امی نے سنتے ہی کہا،" انا اللہ"۔ اسی وقت آس پاس بیٹھے ہوئے سبھی لوگ ہنسنے لگے۔ پٹنہ جب بھی ذاکر آتا تو بس وہ دل لگی اور ہنسی مذاق کا ایک سامان بنا رہتا۔ اس کے بعد تو ذاکر پر اپنی شادی کرنے کا بس ایک بھوت سا سوار ہو گیا۔ بہت ساری لڑکیاں دیکھی گئیں۔ زیادہ تر لڑکی والوں نے ہی انکار کر دیا۔ ہم لوگ امریکہ واپس آ گئے مگر چند ماہ کے بعد پٹنہ سے خبر آئی کہ ذاکر کی شادی ہو گئی ہے۔ ساتھ میں تصویر بھی آئی۔ سر سے پاؤں تک کا سہرا باندھ کر ذاکر پھولے نہ سما رہا تھا۔ تصویر دیکھ کر یہ پتہ چل رہا تھا کہ سراتی اور براتی دونوں ہی کے لیے ذاکر کی شادی ایک مذاق یا ہنسنے ہنسانے کا موقع بنا ہوا تھا۔ ذاکر کی دلہن کی بھی تصویر آئی۔ سہرے کے اوٹ سے ذاکر کا بشاش چہرہ تصویر میں یہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ اندر سے خوش ہے۔ زندگی کی ان مشکلات کا سامنا کرتا ہوا ذاکر جس کا دماغ اکثر ان سختیوں کو سہہ کر سُن ہو جاتا تھا، اس کی زندگی میں ایک نئی لہر رقص کرتی ہوئی اسے نظر آ رہی تھیں۔ ذاکر کی دلہن کی تصویر دیکھ کر تو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس ڈھب کی ہیں، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد پتہ چلا کہ وہ اپنے میکے واپس چلی گئی۔ اس کے بعد جب ہم ہندوستان گئے اور ذاکر سے پوچھا،" تمھاری دلہن کیوں چلی گئی ذاکر؟" تو بولا،" باجی اس کا بہت نکھرا (نخرا) تھا۔ خالی نکھرا ہی نہیں، آتے ہی کہے لگی (کہنے لگی) کہ سارا کھیت میرے نام لکھ دو۔" میں نے بھی انا اللہ پڑھ لیا۔ کہ ان دونوں کا رشتہ اب شاید ہی رہ سکے۔ اور وہی ہوا بھی۔

ذاکر پھر سے اسی ماحول میں سانس لینے لگا جس میں وہ پہلے تھا۔ اسی طرح سے ان کی اماں اپنی بجھی بجھی آواز میں ذاکر کو پکارتی رہیں۔ دروازے کی اوٹ سے ذاکر کا انتظار کرتی رہیں اور ذاکر گھر کے چھوٹے بڑے کاموں کو آہستہ آہستہ لنگڑا لنگڑا کر کرتا رہا۔

ذاکر کے گھر کے بالکل ساتھ والا گھر بچکوڑی نانا کا تھا۔ یہ گھر گاؤں کے دکھن طرف کا آخری گھر تھا۔ اس گھر کے بعد کھیتوں کی ہریالی اور کھیتوں کا پاٹ نظر آتا تھا۔ گھر کے باہر ایک چھوٹے سے برآمدے کی چھت تھی جو دو پایوں پر مکان سے جڑی ہوئی تھی۔ جب میں دور سے اس برآمدے کو دیکھتی تھی تو کھیت، اس کی ہریالی اور صبح کا کہاسا، جو اس کا پس منظر

ہوتا تھا اور کھپرے والا مکان مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ایک مکمل پینٹنگ ہو۔

بچکوڑی نانا کے چار لڑکے، نہال ماموں، صلاح الدین ماموں، شہاب ماموں اور ظفر ماموں تھے۔ ظفر عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ نانا کی شادی کرواہا گاؤں میں ہوئی تھی۔ نانی کا نام کیا تھا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ اُن دون بڑے لوگوں کا نام جاننے کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ نانی ایک بہت ہی زندہ دل انسان تھیں۔ قد تھوڑا سا چھوٹا، چہرے پر ہلکے چیچک کے داغ، بے انتہا پھرتیلی، چہرے پر ہروقت ایک مسکراہٹ، پان کی کھلّی ہمیشہ منھ میں رہتی۔ مجھ کو تو خیر بے حد مانتی تھیں مگر مزاج ایسا شاندار کہ غیر کی طرف بھی دیکھ لیں تو ایک رشتہ قائم کر لیں۔ ہم لوگ شخپورہ جاتے تو وہ ہم لوگوں کے یہاں رہنے کو آجاتیں۔ پانی بھر بھر کر ہم لوگوں کو کنوئیں کے پاس ہی نہلا دیتیں۔ کنوئیں سے پانی نکالنے میں ان کو نہ تو کوئی تکلیف ہوتی اور نہ دیر لگتی۔ سر میں صابن لگا کر بالٹی بالٹی پانی سر پر گراتی جاتیں اور پوچھتی جاتیں، ''جی بھرا رے میاں؟'' پھر بال جھاڑتیں۔ ہروقت ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرتیں۔ پان، چونا، کتھا اور سُپاری کے خرچ کے بارے میں بہت تفصیل سے بتاتیں۔ چہرہ مسکراہٹ سے اور دل کے اندر کی محبت سے ہروقت چمکتا رہتا۔ ان کے کھڑاون سے جس طرح کی آواز نکلتی تھی، وہ گوری نانی کے کھڑاؤں سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ نانی کے کھڑاون کی آواز میں ایک توانائی تھی، ایک مکمل ارادے والی توانائی۔

نانی آرہی ہیں...... سب لوگ ایک ساتھ بول اٹھتے، ''سلام نانی۔'' ''جیتی رہو، کھوس (خوش) رہو!'' پھر بہت ساری دعائیں۔ ''اچھا، گپ شپ بعد میں۔ لاؤ کا کا (کیا کیا) کام ہے؟'' اور پھر کام میں لگ جاتیں اور ساتھ ساتھ بولتی بھی جاتیں۔ ان کی زبان میں ایسی شیرینی تھی، ایسی محبت تھی کہ آج میں نانی کو اپنے تصور میں لاتی ہوں تو جھوم جاتی ہوں۔ ایک ماہ میں نانی اپنے بیتے ہوئے گیارہ مہینے کے ایک ایک لمحے کو یاد کر کرکے سناتیں۔ ان کے انتقال کے بعد جب میں شخپورہ گئی تو ایسا لگا کہ بس میرے بہت ہی قریب پلنگ پر آکر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں ''کیسی ہو میاں؟...... کا (کیا) بتاویں سہابو (شہاب) جو ابری (اس بار) جہان آباد سے پان لائیں (لائے) سب خراب نکل گیا رے...... بس ایہی کتھا چونا اور ڈلی چباویں ہیں۔'' اور پھر نہ جانے کتنی کہانیاں ان کی ہی زبان سے نکلی ہوئی آنگن میں گونجتی رہی۔

لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ سیدھی سادی اور سپاٹ زندگی میں کون سی خوبصورتی ہے، مگر اس سیدھی سادی زندگی کی خوبصورتی کوئی مجھ سے پوچھے۔ شخپورہ کے آنگن میں وہ گزارے ہوئے شب و روز، وہ ہنگامے، نانی اور گوری نانی کا گھٹ

مٹ کیا ہوئے، اس لہجے کو میں آج بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوں۔ اپنے سینے میں ان روشن چہروں کو قید کر کے زندگی کر رہی ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے سمیٹنے کی مشقت کرنی ہی نہیں پڑی۔ یہ تو رحمت کی پھواریں بے سمیٹے جیب و دامن و گریباں میں سما جاتی ہیں۔ رگ و پے میں داخل ہو جاتیں، خون کی روانیوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ طلب سے نہیں ملتی ہیں۔ بے طلب آجاتی ہیں بشرطیکہ ان کی پہچان ہو۔ اس قسم کے لوگوں سے پیار کرتے ہیں ان پر ان کا وجود بے مانگے نثار ہونے لگتا ہے۔ یہ ایسے پھل ہیں جو موسموں کے منتظر نہیں رہتے۔ یہ بے موسم پھل جاتے ہیں، یا ان کے لیے ہر موسم اپنے پھلنے کا موسم ہے، جب چاہو ان کی لذت لو، ان کی مٹھاس لو، ان کی حرارت لو، ان کی ٹھنڈک اور تازگی لو۔ ان کی مہک عطر شمامہ ہے کہ کپڑا دھلنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ جیسے کلیم عاجزؔ کے دوست شاہ بدرالدین صاحب کی دیہاتن بیوی کی خوشبو کہ وہ مہینوں ایسی خوشبو کی تلاش میں رہے کہ اس خوشبو کا کوئی نام ملے، مگر تمام خوشبوؤں میں اس دیہاتن کی خوشبو ممتاز اور بے نام رہی۔ اس خوشبو کے پیدا کرنے والے نے اس خوشبو کا کوئی نام ہی نہیں رکھا۔ یہ تمام پیدا کی ہوئی خوشبوؤں اور اس کے علاوہ بہت سی ناپیدا خوشبو کا مرکب تھا، پھر اس کو نام کون دے۔

گوری نانی، نانی اماں اور نانی سب کی سب میری ہی شخصیت کا ایک حصّہ تھیں..... تھیں نہیں، ہیں۔ میں ان کی یادوں کے بغیر ادھوری ہوں۔ ان کے سراپا کو تصور میں لاتی ہوں تو دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جب وہ زندہ تھیں تو میں نے اپنی طرف سے کسی بھی حق کو ادا نہیں کیا۔ میں اپنی دنیا میں لگی رہی۔ ان ہی رات دن کے جھمیلوں میں، بے کار کی باتوں میں۔ نہ تو انھیں پٹنہ سے خط لکھا، نہ لندن سے اور نہ امریکہ سے۔ خود تو نہیں پڑھتیں، کوئی پڑھ کر ہی سنا دیتا، کیسے بے تحاشہ ہنستیں! کیسی کیسی دلچسپ باتیں کرتیں! انھوں نے تو اپنا فرض پوری طرح ادا کیا۔ میری شادی میں آئیں اور پٹنے میں کئی دنوں تک رہیں۔ شادی کے کاموں میں ویسے ہی ہنس ہنس کر، بول بول کر، امی کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ اور جب میں اپنے سسرال جانے لگی تو میرے ساتھ نانی ہی کو امی نے روانہ کیا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ تھیں۔ میری ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک سے رکھتیں۔ ایک ایک پل میری ہر ضرورت پر نظر رکھتیں۔ مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھتیں اور جب کمرے میں کوئی اور نہ ہوتا تو وہی پھر شخچورہ کی ساری باتیں شروع کر دیتیں، جن کو سن سن کر مجھے بے حد لطف آتا۔ اپنی بہوؤں کی، اپنے بیٹوں کی باتیں،

ایسی ایسی باتیں جو کہ دیگر لوگوں کی باتوں سے بے حد مختلف ہوتیں۔ مجھے ان کی باتوں کو سن کر بے حد مزہ آتا۔ جب چُپ ہو جاتیں تو میں انھیں ٹوکتی، ''اور نانی، کچھ اور بتایئے نا!'' نانی پھر شروع ہو جاتیں اور نہ جانے کن کن موضوعات پر بولتی ہی جاتیں۔ مرکزی موضوع وہی ہوتا، یعنی آم، آم کا باغ، بَجر، کھپروں کی باتیں، مکان کی چھت، دیواروں کی مرمت...... اور پھر سب کے بعد پھر وہی پان، سپاری، کتھا اور چونے پر آ جاتیں۔ ان چیزوں کے خرچوں پر تفصیلی گفتگو کرتیں۔

شخپورہ میں کسی ایک دن بھی جب نانی ہم لوگوں کے یہاں نہ پہنچتیں تو ہم انھیں ڈھونڈنے گھر سے نکلتے۔ سیدھے ان کے گھر کی طرف جاتے۔ یعنی اسی گھر کی طرف جو گاؤں کا آخری گھر تھا۔ اسی دو پایوں والے برآمدے میں جہاں ایک پلنگ بچھی ہوتی جس پر نانی اپنے خیالوں کی دنیا میں مگن بیٹھی رہتیں، ایک خاص انداز سے خود کو پنکھا جھلتی رہتیں اور ہلکے ہلکے کسی گیت کو گنگناتی رہتیں۔ میں چپکے سے جا کر ان کی پشت سے ان کو چھوتی تو بول اٹھتیں، ''ارے انجم رے...... کا بٹی! ارے آہی رہے تھے۔ چل چل آویں ہیں۔ ارے بڑی پاؤں دکھ رہا تھا بٹی۔ چل چل نہ بھائی!'' اور پھر اپنی اسی کھڑاؤں کی توانائی کی آواز کے ساتھ ساتھ میرے گھر پر آ جاتیں۔ نانی کے بغیر ہم لوگ جیسے ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ صرف یہ نہیں تھا کہ وہ ہم لوگوں کا کام کر دیتی تھیں بلکہ ان کی موجودگی میں گھر گلزار رہتا تھا۔ ہر شخص کی حرکتوں پر نظر رکھنے والی نانی، بات بات پر کھل کر قہقہے لگاتیں۔ کسی بھی بات کو شروع کرنے سے پہلے یہی کہتیں، ''ارے نا رے بٹی تے نا جانے ہے (تم نہیں جانتی ہو)۔'' میں اپنے ماضی کے ملبے سے ان ہی جملوں کو چُنتی رہتی ہوں جو میری نظروں کے سامنے کی دھند میں کسی دیے کی طرح روشن رہتے ہیں اور اس دھند میں بھی مجھے پھر ایک نیا راستہ ملنے لگتا ہے۔

جان بوجھ کر نہیں، بلکہ خود بہ خود ہی نانی کی سیدھی سادی باتوں کی بہار، اور اس بہار کے پھول میرے دل میں خود بہ خود بھرتے چلے گئے۔ ان کے لہجے کا اُتار چڑھاؤ، ان کی آنکھوں میں ہم لوگوں کے لیے محبت کا ایک انداز، پان کی سرخی لیے ہوئے، مسکراتے ہونٹ اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ان دو پایوں والے اپنے برآمدے میں میری نانی ہمیشہ اپنی دنیا میں مگن!!

گاؤں میں کوئی عورت دن دہاڑے کبھی باہر نہیں نکلتی تھی۔ اگر دن میں کسی عورت کو باہر کسی کے گھر جانا بھی ہوا تو وہ ایک پیچھے کے راستے سے جاتیں۔ وہ راستہ زیادہ تر عورتوں کے ہی چلنے کا ہوتا۔ اس لیے کہ سامنے جو بنگلہ تھا، اس میں ہر وقت مردوں کی محفل جمی رہتی۔ کبھی شطرنج، کبھی تاش، کبھی قہقہے لگتے رہتے تھے۔ لیکن نانی ہمیشہ بنگلہ کی ہی طرف سے آتیں

اور کہتیں، ''نا بابو پیچھے کے راستے سے آوے ہیں تو زمین میں کھڑا ون جموے (جمتی) نہ کرے ہے اور نا ہی کبھی کسی نے ان کو ٹوکا۔ جب بھی آتیں ایک سے ایک نئی نئی باتیں سناتیں، ''ارے انجم، قیوم کی ساری بٹیین (بیٹیاں) کنواں پر بیٹھ کر انگریزی بول رہی ہیں رے۔ چل نا سنے کو!'' ہم لوگ بھی تجسس میں پڑ گئے اور نانی کے ساتھ قیوم ماموں کے یہاں جانے کو تیار ہو گئے۔ آخر وہ لوگ کیسی انگریزی بول رہی ہیں۔ میری منجھلی بہن، نانی اور ہم آہستہ آہستہ قیوم ماموں کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ان کی تینوں لڑکیاں کنوئیں پر بیٹھ کر ''ف'' والی بولی بول رہی ہیں۔ ''تم کفہفاں سفے افارفی ہفو (تم کہاں سے آ رہی ہو)''۔ واپس آکر گھر پر ہم لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ ''ارے نانی، یہ انگریزی تھوڑا ہی بول رہی تھیں۔ یہ تو ''ف'' والی بولی تھی۔ نانی بولیں، ''ارے، ہم کا (کیا) جانیں۔ میرے تو لگا کہ انگریزی ایسے ہی فٹا فٹ بولی جائے ہے۔''

دن میں لوگ بنگلے کے بڑے کمرے میں رہتے تھے اور شام کو جب ذرا ٹھنڈک ہو جاتی تو بنگلہ کے سامنے کا برآمدہ اور اس برآمدے سے جڑی زمین جس کو بنگلا کا صحن بھی کہا جا سکتا ہے جو کہ کافی اونچائی پر تھا یعنی جتنا اونچا بنگلا تھا، اس پر دو چوکیاں بچھائی جاتیں۔ دری اور سفید چادر بچھائی جاتی اور اس جڑی چوکی پر ابا سفید سفید کرتا پائجامہ پہن کر اپنے خاص انداز سے پاؤں پر پاؤں رکھ کر بیٹھتے اور پھر گاؤں کے کبھی شرفا، براہل، پاسی، تیلی، بنیا آتے اور ''وکیل صاحب'' ''وکیل صاحب'' کہہ کر ابا کو مخاطب کرتے اور دنیا جہان کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کے مسئلوں پر باتیں کرتے۔ کبھی کبھی نوجوانوں کی چوکی ابا کی چوکی سے ذرا ہٹ کر بچھتی اور پھر کبھی مل کر دیر دیر تک ہنسی مذاق کہانی قصے اور خوش گپیاں کرتے۔

ایک سین میری نظروں میں کچھ اس طرح سمایا ہوا ہے کہ میں اسے شاید ہی کبھی بھول سکوں۔ میں اپنے سسرال (گیا) میں تھی۔ پتہ چلا کہ ہم سے کوئی ملنے کو آیا ہے۔ میں نے نوکر سے کہا کہ جو بھی ہے اس کو اندر بھیج دو۔ دروازہ کھلا تو دیکھا کہ آصف بھیا جو امی کے چچیرے بھائی کے بیٹے تھے، وہ ایک براؤن رنگ کے ٹھونگے میں کچھ پیٹھا لے کر آ رہے ہیں۔ اس لمحے کو شاید میں کبھی بھول نہیں سکتی جس وقت انھوں نے اس ٹھونگے کو میری طرف بڑھایا تھا۔ ان کی بے پناہ محبت اور بے غرض پیار سے لبریز آنکھیں میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ سچ ہے کہ ایک معمولی سا تحفہ بھی اگر کوئی سچے دل اور اتنے پیار سے دے تو وہ تحفہ، تحفہ ہوتا ہے۔ اس تحفے کو میں نے، میرے دل نے، میرے پورے وجود نے، سچے جذبے سے قبول کیا اور

میری آنکھیں بھر آئیں۔ آصف بھیا کے بڑے بھائی جب بارہ تیرہ سال کے تھے تو اسی وقت ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے لیے مولوی ماسٹر سب رکھا گیا تھا۔ بہت ذہین تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ماموں اور ممانی بے دم ہو گئے تھے۔ اسکے بعد آصف بھیا پیدا ہوئے۔ گھر میں ایک بار پھر بچے کی خوشیاں ناچنے لگیں لیکن اس بار ماموں اور ممانی نے فیصلہ کیا کہ یہ پڑھانا لکھانا بیکار چیز ہے۔ بس کسی طرح یہ جیے بچے اور انھیں کچھ نہیں چاہیے تھا سوا آصف بھیا کی زندگی کے۔ بس وہ دن ہے کہ آج تک آصف بھیا دیہات میں ہی رہ گئے۔ کھیت کھلیان باغ تالاب ان ہی چیزوں سے ناتا جوڑتے گئے۔ خود بھی گاؤں کے تھے اور تحفہ بھی اسی گاؤں سے لے کر آئے تھے۔ ماں باپ انھیں دیکھ دیکھ کر نہال ہوتے رہے اور سوچتے رہے کہ اگر یہ بھی پڑھنے لگتا تو بڑے بھائی کی طرح اللہ کو پیارا ہو جاتا۔

آصف بھیا جس طرح سے میرے لیے تحفہ لائے تھے، اب نہ اتنے پیار سے کوئی تحفہ دیتا ہے اور نہ کوئی اس طرح قبول کرتا ہے۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں میری زندگی میں آج تک اُجالا بکھیرتی ہیں۔ وہ ایک تحفہ میری ساری زندگی کے لیے کافی ہے۔ شاید اب مجھے کسی اور تحفے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں کئی بار محسوس کرتی ہوں کہ ان ہی بے غرض لوگوں کی معصوم محبت نے مجھے شاعر اور مصور بنا دیا ہے۔ میری غزلوں میں بھی نظموں کی طرح میری اپنی زندگی کے وہ رنگ بکھرے ہوئے ہیں جو حقیقت پسندی کی حد تک میرے اپنے جذبات کے قلم کی brush strokes کو بکھیرتے ہیں۔ یعنی جہاں میری غزلوں میں کہیں کہیں روایت پسندی ہے، وہ ذاتی زندگی کے ان نقوش کا بھی بھرپور حوالہ ہے، جو صرف اور صرف میری ذات سے ابھرے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی ایک مسلسل غزل یاد آ رہی ہے جو میں یہاں رقم کر رہی ہوں:

محفلِ ہستی میں کیسے کیسے تھے آباد لوگ
چشم پُرنم ہو گئی آنے لگے جب یاد لوگ

میں انہیں کے واسطے جینے کی کوشش کرتی ہوں
آزماتے ہیں مجھے جو اب ستم ایجاد لوگ

جو محبت کی بسا کر بستیاں رخصت ہوئے
کتنے دور اندیش تھے یارب وہ دور افتاد لوگ

جن کے آنگن میں مہکتے تھے محبت کے گلاب
اس کی خوشبو بھول بیٹھے خانماں برباد لوگ

خود پھٹے حالوں پھٹے کپڑوں میں رہتے تھے مگر
دوسروں کو کر گئے دل شاد وہ، دلشاد لوگ

جن کی غربت سے عمارت والے شرمندہ رہیں
کاش انجم شہر میں ایسے ہوں پھر آباد لوگ

شیخپورہ میں امی کی ایک کبرا بوبو رہتی تھیں۔ امی ان کے گھر ہم کو لے کر اکثر جاتی تھیں۔ باہر سے دیکھنے میں وہ گھر کیسا تھا، مجھے بالکل یاد نہیں ہے مگر گھر کے اندر کا آنگن تو اس وقت بالکل میری نظر کے سامنے ہے۔ مٹی کی دیواروں پر کھپرے کی چھت والے مکان کے آنگن میں پلنگ بچھی ہوتی تھی۔ ایک مٹی کا کچا گھڑا، چند کٹورے، دو ایک دیگچیاں ادھر اُدھر بکھری ہوئیں۔ ایسا لگتا جیسے گھر کا کام کسی صورت سے چل رہا ہے۔ کافی بوڑھی تھیں مگر اسی بڑھاپے میں اپنا سارا کام کرتیں۔ ہاتھ میں لاٹھی لے کر دروازے پر کھڑی ہو جاتیں اور اپنے آم کے باغ کی جوان کے گھر کے سامنے ہی تھا اس کی حفاظت کرتیں۔ ان کو اور ان کی لاٹھی کو دیکھ کر ہی کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ کوئی ایک آم بھی توڑ لے۔ ہم لوگ جب گئے تو لاٹھی لے کر آہستہ آہستہ کمرے سے آنگن کی طرف آنے لگیں۔ ہم لوگوں کے بہت قریب بیٹھ گئیں۔ اور زور زور سے امی سے باتیں کرنے لگیں۔ آواز میں بڑھاپے کا کوئی آثار نہیں تھا۔ رنگ کم، کافی لمبی اور دبلی تھیں۔ اسی وجہ سے کمر جھک گئی تھی۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ ایک نبی حسن اور چھوٹے لڑکے کا نام علی حسن تھا۔ علی حسن بھیا بہت ہی سخی اور کشادہ دل انسان تھے۔ پٹنہ میں ہم لوگوں کے گھر برابر آتے تھے۔ یعنی اسی عدالت گنج کوارٹر میں جو پٹنہ میں اسٹیشن سے بہت قریب ہے۔ ہم سبھی لوگوں کو بے حد مانتے تھے۔ خاص کر بڑے بھیا سے بہت زیادہ دوستی تھی۔ امی کی کبرا بوبو کی طرح رنگ کم اور خوب لمبے چوڑے تھے۔ ان ہی کی طرح زور زور سے بولتے۔ منہ میں ہمیشہ پان کی سرخی رہتی۔ "خالہ۔ خالہ" کر کے امی سے باتیں

کرتے۔ جہان آباد میں کارنیوال چلاتے تھے جہاں سے بہت سا پیسہ آتا تھا۔ کارنیوال کی بے حساب باتیں سناتے۔ جب کارنیوال نہیں چل رہا ہوتا اور ہم لوگ پوچھتے، ''علی حسن بھیا، کیسے ادھر آنا ہوا؟'' تو بولتے: ''ارے بھائی! وہی کارنیوال کا لائسنس لینے کو آئے ہیں۔'' سخی تو اس قدر تھے کہ کوئی بھی پیسہ مانگتا، فوراً جیب سے نکال کر دے دیتے۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سوچتے۔ ہر ایک سے محبت کرنے والے علی حسن بھیا کا نہ جانے کتنوں کے سر پر قرض ہوتا۔ ایسا قرض جس کا تقاضہ کرنے والا بالکل بے فکر۔ خود پیسے کی ضرورت بھی ہوئی تو کبھی نہیں مانگا۔ جب ہم لوگ پوچھتے کہ ''علی حسن بھیا شادی کب کیجیے گا؟'' تو بہت زور سے ہنس دیتے۔ کافی دنوں کے بعد ایک دن پتہ چلا کہ علی حسن بھیا نے شادی کر لی ہے۔

ایک دن شام میں اسکول سے میں واپس آئی تو پتہ چلا کہ علی حسن بھیا اور بھابھی آ رہی ہیں۔ ہم لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خیر دونوں قریب مغرب کے وقت گھر میں داخل ہوئے۔ بھابھی کا رنگ بہت کم کھلا ہوا تھا مگر چہرے پر غضب کا بھولا پن تھا۔ بھابھی کلکتہ کی طرف کی تھیں۔ بنگلہ زبان بہت ہی پیارے انداز سے بولتی تھیں۔ اردو میں بھی بولتی تھیں تو لگتا تھا کہ بنگلہ ہی بول رہی ہیں۔ کارنیوال میں کسی شو کے سلسلے میں کلکتہ سے آئی تھیں۔ علی حسن بھیا کو بھابھی بہت پسند آ گئیں اور بس شادی ہو گئی۔ امی کو کھالا اماں (خالہ اماں) کہتیں تو مجھے بہت اچھا لگتا۔ ان دنوں کارنیوال اپنے پورے شباب پر تھا۔ اسی کے پانچ چھ سال کے بعد ہی علی حسن بھیا کی صحت خراب ہونے لگی۔ وہ شیخوپورہ میں اپنے مکان میں جا کر رہنے لگے۔ امی کی کبرا بوبو کا انتقال تو ہو ہی چکا تھا۔ بھابھی نے علی حسن بھیا کی بے حساب خدمت کی۔ شوہر کی خدمت میں نہ رات کو رات اور نہ دن کو دن سمجھا۔ ہم لوگ جب بھی ان سے ملنے جاتے، فوراً اپنے باغ کا مالدہ آم منگواتے اور کہتے: ''ارے بہن اسے کھا کر دیکھو کیا غضب کی مٹھاس ہے۔'' دن بدن علی حسن بھیا کی کمزوری بڑھتی گئی۔ گٹھیلے جسم والے علی حسن بھیا اب بالکل بستر سے لگ گئے۔ جہان آباد کے ڈاکٹر کے یہاں سے دوا آتی رہی مگر ان دواؤں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بستر پر لیٹے لیٹے لوگوں کو بے بسی سے دیکھتے رہے اور آخر ایک دن علی حسن بھیا اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے انتقال کے بعد بھابھی اسی گاؤں میں اسی گھر میں تنہا زندگی کے دن کاٹتی رہیں۔ نہ کلکتہ واپس گئیں اور نہ کسی اور جگہ۔ اس جگہ کو اپنا گھر مان لیا۔ پوری کی پوری وہیں کی ہو کر رہیں اور آخر کار ایک دن اسی گھر میں کسی معمولی سی بیماری سے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

علی حسن بھیا کے آموں کے باغ کی طرف غلام رسول کی بیوی رہتی تھی۔ سب لوگ اسے رسول بہو کہتے۔ خود بھی

گوری چٹی اور بے حد خوبصورت تھی اور اس کی تینوں لڑکیاں بھی اتنی ہی حسین۔ اتنی حسین تھیں کہ شاید ہی کبھی کسی نے اتنی خوبصورت لڑکیاں دیکھی ہوں۔ چھینٹ کا بلاؤز اور اس پر سوتی گلابی رنگی ہوئی ساری، جوان لوگوں پر ایسی جچتی کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جائے۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی خبر نہیں تھی کہ وہ کتنی خوبصورت ہیں۔ دنیا کے چھل کپٹ سے کوسوں دور تھیں۔ غلام رسول ایک غریب آدمی تھے اور ذات کے انصاری تھے۔ میں امی سے ہمیشہ کہتی تھی کہ منجھلے بھیا جب انگلینڈ سے اپنی پڑھائی ختم کر کے آجائیں گے تو غلام رسول کی بیٹی سے شادی کر دیجیے گا اور امی کوئی جواب نہ دیتیں، صرف مسکرا کر رہ جاتیں۔

گاؤں میں رفیق نام کا ایک درزی بھی تھا جو علی حسن بھیا کے گھر کی طرف رہتا تھا۔ اس کی دکان تو ہم نے کبھی دیکھی ہی نہیں، نہ کبھی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا جانے دکان تھی بھی یا نہیں، لیکن وہ برابر باہر بنگلہ پر آتا تھا اور امی جب اس کو بلواتیں تو گھر کے اندر آجاتا۔ خوب ہنستا اور قسم قسم کی باتیں کرتا۔ امی کو بوبو کہہ کر پکارتا۔ کہتا، ''ہم نے بھی ساری ڈگری پاس کر لیا ہے بوبو۔ ارے جب نیفا سیا تو ایف اے پاس کیا، مُہری سیا تو ایم۔ اے پاس کیا۔ بوبو پہلے تو آپ سے بچپن کی بات کرنا ہے، اب بوبو بچپن کی بات کیجیے۔'' نہ جانے کیسے بیچارے کو آخری عمر میں کسی طرح کی کوئی بیماری ہوگئی کہ قریب قریب نابینا ہی ہوگیا۔ اتنی تکلیف میں بھی ہمیشہ ہنستا ہی رہا اور اپنے دکھ کو ہنس ہنس کر جھیلتا رہا۔

ہم لوگوں کے باہر والے بنگلے کے ٹھیک سامنے نظیر بھیا کا بنگلہ تھا۔ نظیر بھیا رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ ان کے ماشاءاللہ کئی لڑکے لڑکیاں تھیں، وہ بھی ہم سے بہت بڑے تھے۔ اس لیے ہم ان لوگوں کو بھیا او باجی کہتے تھے۔ حیدر بھیا، صفدر بھیا، جہانی بھیا، آنو بھیا اور آسو بھیا۔ لڑکیوں میں حسنہ باجی اور سلطانہ باجی۔ سلطانہ باجی بے حد حسین تھیں۔ اتنی خوبصورت کہ ہم کو وہ بالکل کسی فلم کی ہیروئن لگتی تھیں۔ ان کے گھر میں بھی جھولا کا بہت ہی زبردست انتظام رہتا تھا۔ اسی لیے جھولا جھولنے کے لیے میں ہر وقت وہاں پہنچ جاتی تھی۔ نظیر بھیا کے ساتھ والے گھر کے لوگوں کو ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا، اور نا ہی گھر دیکھا، مگر امی بتاتیں تھیں کہ وہ عباس ماموں کا گھر تھا۔ یہ بھی دور کے رشتہ دار تھے جو اٹھ کر پاکستان روانہ ہوگئے تھے۔ اس گھر کے احاطے میں ہر طرح کے پھل کے درخت لگے ہوئے تھے۔ بستی کے بچوں کو اگر بھوک لگتی تو

سیدھے اسی ہرے بھرے احاطے میں دیوار پھلانگ کر اُتر جاتے اور امرود، فالسہ اور جامن سے پیٹ بھر لیتے۔

عباس ماموں کے گھر کے ساتھ والا گھر مجیب چچا کا تھا۔ گاؤں کے سبھی لوگ ان کو مجیب میاں کہتے تھے۔ وہ میرے ابا کی مدد لگ بھگ گاؤں کی زندگی کے ہر شعبے میں کرتے تھے۔ کھیت سے غلہ کب آئے گا اور کہاں رکھا جائے گا، آم کی سوکھی جلاون کی لکڑی کہاں رکھوائی جائے، کتنا آم ٹوٹا، بمبر کا آم کتنا ہوا۔ اس سال مکان میں کتنے نئے کھپروں کی ضرورت ہوگی۔ گھر کی مرمت دیواروں کی لپائی پوتائی اور کیا کچھ نہیں! بڑے ہی پُر خلوص اور محبت والے تھے۔ ایک خاص قسم کی شفقت بھری آواز اور انداز تھا۔ اور وہی انداز ان کے سارے بچوں میں تھا۔ ان کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑے بشیر بھیا، پھر نثار بھیا، ساجو بھیا، کالو بھیا اور شفیع بھیا۔ لڑکیوں میں شہرو باجی، شمشی باجی، رضیہ باجی اور راکو باجی۔ شہرو باجی کی لڑکی جس کا نام پیاری تھا، میری بچپن کی دوست تھی۔ مجیب چچا کے سارے بچے ہم لوگوں کے اپنے سگے بھائی بہنوں کی طرح تھے۔ ان لوگون کی محبت اور خلوص نے مجھے میرے بچپن کو ایک الگ ہی طرح سے سنوارا تھا۔ اس طرح سے سنوارا کہ میری یادوں کی لکیروں میں رنگوں کا ایک ریلا سا ابھرنے لگتا ہے۔ ان لوگوں کی سیدھی سادی باتوں کے جوہر کو میں سن کر مزے تو لیتی ہی تھی، مگر اب تو ان کے ادا کیے ہوئے جملے کسی ہیرے کی روشنی کی طرح میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

راکو باجی کا اصل نام رابعہ تھا۔ مگر چونکہ میری امی کا نام بھی رابعہ تھا اس لیے نانی اماں کا یہ حکم ہوا کہ اس کا نام رابعہ کس نے رکھ دیا، اس کو آج سے راکو پکارو۔ تو وہ بیچاری رابعہ سے راکو ہوگئی۔ راکو باجی کی پُرکشش مسکراہٹ اور کھلکھلاتی ہوئی ہنسی ایسی ہوتی تھی کہ میں نے آج تک ویسی دلکش مسکراہٹ دیکھی ہی نہیں ہے۔ ہر بات میں ان کا کھلکھلا کر ہنس دینا مجھے بے حد بھاتا تھا۔ میں امریکہ سے ایک بار گیا گئی تو راکو باجی اپنے شوہر کے ساتھ جمشید پور سے رات بھر بس کا سفر طے کر کے گیا میری محبت میں آئیں۔ اور میرے ساتھ تین چار دن گیا میں رہیں۔ میں انھیں مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہی۔ مجھے پچھلی باتیں یکے بعد دیگرے یاد آتی گئیں۔ کس طرح چاندنی رات میں ہم سبھی لوگ ندی کے کنارے بالو پر بیٹھتے تھے اور راکو باجی اپنا دوپٹہ اتار کر ندی میں چھلانگ مار کر کودی تھیں کہ ہم سبھی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ چت، کروٹ، پٹ اور نہ جانے کن کن زاویوں سے ندی میں تیرنے لگیں۔ دور دور تک تیرتی ہوئی چلی جاتیں، کبھی کبھی دیر دیر تک پانی کے اندر غائب ہو جاتیں، کچھ اس طرح سے ڈراتیں کہ وہ ڈوب چکی ہیں مگر پھر یک بیک ناک بند کر کے سانس روکے ہوئے پانی کے اندر

سے نکلتیں۔ خوب زور زور سے ہمیں پکارتیں، ''آؤ انجم، آؤ نا ارے تیرنا بہت آسان ہے۔'' مگر میری ہمت پانی میں جانے کی نہیں ہوئی۔ میں انھیں کو تیرتے ہوئے دیکھ کر محظوظ ہوتی رہی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو بے حد پسند کرتے تھے۔ میری طرف دیکھتی ہوئی، مجھ پر فدا ہوتی ہوئی وہ کاجل والی روشن آنکھیں اور باتوں میں ریشم سی نرمیاں لیے ہوئے وہ ہونٹ اس وقت میرے نظر کے سامنے ہے۔

امریکہ سے میں نے ایک خط راکو باجی کے نام روانہ کیا۔ ہمیشہ کی طرح ہر بار تو جواب آتا ہی تھا۔ پیار بھری باتیں، پچھلی باتیں وہ بھی یاد کرتی تھیں اور میں بھی۔ مگر اس بار جواب نہیں آیا۔ جب کافی دن ہو گئے تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ آخر ایک دن پٹنہ سے خبر آئی کہ کینسر کے مرض میں کئی ماہ سے مبتلا تھیں جس کی خبر مجھے نہیں دی اور ایک دن اپنی روشن آنکھیں، تبسم والے ہونٹ اور محبت سے لبریز دل کو سنبھالے ہوئے اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملیں۔

راکو باجی کی اماں بھی ہم لوگوں کو بہت مانتی تھیں۔ ان کی نظر میں ہم لوگوں کے لیے ایک خاص پیار تھا اور اس نظر کو میں بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ابھی گیا بچپن سے ہی اللہ تعالیٰ نے اس محبت کو تولنے کا آلہ نصب کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ محبت کے عجب کرشمے ہوتے ہیں۔ کسی کو محبت جتانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کی آنکھ کے ایک خاص انداز سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس محبت میں کتنی گہرائی ہے، کتنی لچک ہے، کتنی روانی ہے۔ اسے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ محبت اپنا کام خود کرتی ہے۔

مجھے جھولا بنوانے کا شوق ہوتا تو ابا کہتے، ''جاؤ، مجیب میاں سے کہو کہ جھولا کی رسّی جا کر لا دیں۔'' بس میں تو ان کی جان ہی کو آ گئی کہ ابھی ابھی آپ جھولا کی رسّی جا کر لا دیں۔ میں کئی گھنٹوں تک جھولے کی خواہش کو دل میں لیے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ آخر انھوں نے خدا جانے کہاں سے پیلی پیلی، موٹی موٹی جھولے کی رسّی لا کر سامنے رکھ دی اور وہ جھولا علی حسن بھیا کے گھر کے ایک کمرے میں چھت کی بلّی میں لگایا گیا۔ سارا دن پہلے تو اس جھولے کے لگنے کا ہنگامہ رہا، پھر راکو باجی نے جھولے پر کھڑے ہو کر ایسی ایسی شاندار پینگیں لگائیں کہ بس جھولا جھولنے کا مزہ ہی آ گیا۔

اتفاق سے اسی دن بے طرح بارش ہوئی اور اس بارش سے نکلتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ ہوا اور جھولے کی اُڑان نے دل و دماغ کو شاداب کر دیا۔ آسمان کو چھوتے ہوئے جھولے، برساتی گیت اور اس رسّی کی ایک خاص خوشبو نے دل کو وہ سکون بخشا کہ آج تک اس کو تصور میں لا کر ایک انوکھا سرور حاصل ہوتا ہے۔

مجیب چچا کے لڑکے ساجو بھیا تو روز ہی قریب قریب ہم لوگوں کے گھر میں آتے اور کنوئیں کے سامنے چھوٹی اینٹوں والی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے، ''ارے بھائی، راتے (رات) کا قصہ کس کس کو سننا ہے؟'' اور ہم لوگ ہنستے ہوئے ان کے قریب چلے جاتے، اس لیے کہ یہ پتہ ہوتا تھا کہ یہ پھر کوئی مسخری بات سنانے والے ہیں۔

''کیا ہوا کل رات ساجو بھیا، بتائیے نا!''

پھر سنانے لگے، ''ارے راتے (رات) بستی میں ایک بارات آئی تھی۔ جب دلہا آنگن میں عورتوں کے پاس شربت پینے کو گیا تو بڑا خفا ہو گیا۔ عورتیں کہیں کہ شربت پی لو اور وہ دلہا تو شربت پیئے ہی نا۔ آخر اس نے اپنی سالی کے ہاتھ سے شربت لے کر پھینک دیا اور بولا کہ ''ہم کو پینے کا من نہیں ہے تو کا (کیا) ہم کو بلجوری پیاؤ گو (زبردستی پلاؤ گے)؟'' اس قصے کو سن کر ہم لوگ دیر تک ہنستے رہے اور ساجو بھیا اپنے خاص انداز سے مسکراتے رہے۔

بس آئے دن اسی طرح کے سچے لطیفے، کہانیاں سنا سنا کر وہ ہم لوگوں کا دل بہلاتے۔ پھر ایک دن بولے، ''ارے راتے (رات) پھر نے ایک بارات آئی تھی۔ دلہا سے پوچھا گیا کہ آپ کا نکاح فلاں فلاں کی لڑکی سے ہونا قرار پائی ہے کیا آپ کو قبول ہے؟ تو دلہا بولا کہ ہائے مولی (مولوی) صاحب اور سائیکلوا (سائیکل) کا تو نام ہی نہیں لیا۔ تو مولوی صاحب بولے کہ آپ کا نکاح سائیکل سے نہیں لڑکی سے ہو رہا ہے۔''

ان دنوں تو معمولی سے معمولی بات پر بے تحاشہ ہنسی آتی تھی۔ اور یہ سچا لطیفہ تو ہم لوگوں کو ہفتوں اور مہینوں ہنساتا رہتا۔

ہم لوگوں کے گھر کے ساتھ ہی آصف بھیا (آصف کریم) رہتے تھے۔ ان کی اماں یعنی میری ممانی اور آصف بھیا دونوں ماں بیٹا ساتھ رہتے تھے۔ ان کے دروازے پر ہمیشہ دو تین گائیں بندھی رہتی تھیں۔ اس لیے ان کے گھر آنا جانا میرے لیے ایک بہت ہی بڑا مسئلہ تھا۔ اگر ان کے گھر کسی طرح چلی بھی گئی تو واپس آنا میرے لیے ایک دشوار کام تھا۔ دروازے پر گھنٹوں کھڑی رہتی۔ جب تک کہ کوئی آئے نہ اور میرا ہاتھ پکڑ کر میری کھڑکی تک پہنچا نہ دے۔ مجھے ان بندھی ہوئی گایوں سے کچھ عجیب سا خوف آتا تھا۔ آصف بھیا کی شادی میرے ہوش و حواس میں ہوئی تھی۔ بستی کے سارے لوگوں کا آنا جانا ان کے یہاں بھی ہر وقت ہوتا رہتا تھا۔ عورتیں چاہے تو ڈھیکی میں دھان کوٹتی رہتیں یا چکّی کو گھر گھراتی ہوئی آٹا،

ستو یا تلخہ پیستی رہتیں اور گیت گاتی رہتیں۔ گاؤں میں لوگ اپنی خوشی کا اظہار ان ہی گیتوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ہم لوگ جب ۱۹۸۶ء میں شخپورہ گئے تو ساری لڑکیاں بستی سے آکر، چٹائی بچھا کر، دو تین گھنٹوں تک گیت گاتی رہتیں جس میں ٹونا، شہانی گیت، سہاگ اور جھومرا اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھا۔ آصف بھیا اور ان کی اماں ہم سبھوں پر جان چھڑکتی تھیں۔

اب جب کبھی سوچتی ہوں تو لامحالہ مجھے یہ بات محسوس ہونے لگتی ہے کہ ایسے سادے، سچے اور کھرے لوگ دنیا کے ایک دوسرے کونے میں ہی آباد ہیں جو بہت ہی کم میں کھاتے پیتے ہیں، کم میں پہنتے اوڑھتے ہیں، یعنی کھدر اور موٹے جھوٹے کپڑوں سے اپنے تن کو ڈھانپتے ہیں۔ لالٹین اور دیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں کتنی گلیوں اور کتنے نکڑوں سے گزر کر اپنی اپنی منزل کی طرف اسی طرح چلتے ہیں جس طرح موٹر کار پر بھاگتا ہوا انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا فیض ان کو زیادہ نصیب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ مشینی زندگی کے عذابوں سے کم از کم محفوظ رہ کر زندگی کے دن گزارتے ہیں۔ اپنی سادہ سی زندگی گزار کر، محنت اور مشقت کر کے، قدرت کے نظام کو سمجھ کر اپنے طور پر اسے مدنظر رکھتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔ کھیت میں کام، باغ کی دیکھ ریکھ، زمین کی تہوں سے اپنے دونوں بازوؤں کی طاقت سے پانی نکالتے ہیں اور پھر رات کو تھک کر چور، کھلے آسمان تلے ستاروں کی چھاؤں میں بے خبری کی نیند میں ڈوب جاتے ہیں۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے دل میں ایک کھٹک رہ جاتی ہے کہ کاش وہ دوسری دنیا میں رہ سکتے، وہاں کی آسائشوں کے مزے لیتے۔ مگر انھیں کیا خبر کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ ایک قیمتی دولت ہے اور اس وقت اگر سچ پوچھیے تو دنیا میں کوئی حسین، خوبصورت اور صاف جگہ ہے تو وہ شخپورہ ہے۔ لکڑی کے جلنے کی خوشبو، پتوں کی خوشبو، اُڑتی مٹی کی خوشبو، مٹی سے لپے پُتے گھر، کھپرے پر گرتی ہوئی بارش کی بوندیں، وہاں کے ہر موسم کی مہک، اس کی ٹھنڈک، گرمی کی بہار کا کسی اور جگہ سے کیا مقابلہ!

مگر میں جب بھی گئی، یہ سب باتیں صرف سوچتی ہی رہی، اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکی۔ یہ باتیں میرے دل ہی میں رہیں اس لیے کہ امریکہ اور انگلینڈ آکر میں کمزور ہو گئی ہوں۔ مجھ میں اب کوئی ہمت باقی نہیں ہے اور وہ لوگ...... وہ لوگ تو دلیر ہیں، بہادر ہیں۔ بڑی سے بڑی مشکل کو اپنے طور پر حل کر لیتے ہیں اور کسی چیز سے بھی ڈرتے نہیں ہیں۔ اگر یہ باتیں میں ان کو بتاتی تو وہ یہ سمجھتے کہ خود تو آسائشوں کے گہوارے میں جھول رہی ہیں اور مجھے یہ بتا رہی ہیں کہ یہی جگہ سب سے پاک صاف ہے اور خوبصورت ہے۔

لیکن انھیں علم نہیں ہے کہ دنیا کی سب آسائشوں کے ہوتے ہوئے بھی صوفیہ انجم نام کی لڑکی، جواب امریکہ میں مقیم ہے۔ اپنا دل وہیں چھوڑ آئی ہے جہاں اس کے بچپن اور لڑکپن گزرے ہیں۔ وہ قفس میں قید پنچھی کی طرح پھڑ پھڑاتی ہے، لیکن آزاد نہیں ہو پاتی۔ تھک ہار کر الفاظ کے گجرے پروتی ہے، ہار بناتی ہے اور پڑھنے والے انھیں نظم یا غزل کہتے ہیں۔ یہ ہار پرونے کے بعد دل کو یک گونہ آرام ملتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے امریکہ کی مشینی زندگی سے چند لمحے چُرا لیے اور ایک بار پھر اپنے بچپن کی یادوں کے سہارے جی لیا۔

شاید ایسے ہی ایک موڈ میں مجھ سے میری نظم ''دھندلی عمارت'' لکھی گئی تھی (یا اس نظم نے زبردستی مجھ سے خود کو لکھوا لیا تھا!)، یہ نظم میں یہاں رقم کر رہی ہوں:

مجھے تو خود بھی خبر نہیں ہے میں کیسے رستے پہ چل رہی ہوں
کہاں کہاں سے گزر چکی ہوں کہاں پہنچ کے کھڑی ہوئی ہوں
نہیں نہیں میں تو جانتی ہوں پتہ ہے اس شہرِ بے ہنر کا
یہاں نظر آ رہا ہے جو کچھ وہ سب ہے دھوکا مری نظر کا
یہاں سے نکلوں چلوں وہاں میں جہاں کے منظر ہیں دھندلے دھندلے
وہ سبزہ زاروں کے درمیاں کچھ مکانوں کے نقش اجلے اجلے
صحن کے اک اک بڑے شجر میں نیواڑ کی رسیوں کا جھولا
وہ جھولے پر بیٹھی بچیوں کے الگ الگ جسموں کا ہیولا
وہ نرم و نازک لچتی تانوں کا پینگ اور وہ دیہاتی گانا
وہ پاؤں لہراتے اور ان میں حسین گھنگھرو کا چھن چھنانا
میں اپنے دیوار اور دریچہ کو چھونا چاہوں پر چھو نہ پاؤں
پلی اسی رنگ و بو میں لیکن میں خود ہی رنگ و بو نہ پاؤں

میں اپنے ماضی کے اس تصور میں گم تھی لیکن جو ہوش آیا
تو کوئی صحن و شجر نہ جھولا، مکاں نہ دیوار و در دریچہ
میں کب سے ماضی کے تانے بانے ادھیڑتی اور بُن رہی ہوں
بتائے کوئی میں جاگتی ہوں کہ کرچیں خوابوں کی چن رہی ہوں

شاید میں غلط کہہ رہی ہوں۔ یہ میری شاعری ہے اور شاعری عمل کی محتاج نہیں ہے۔ یہ تخیل ہے۔ یہ فنکاری ہے۔ یہ رنگ آمیزی ہے کہ امریکہ کی زندگی میں اس کا پرتو مجھ میں نظر نہیں آتا۔ امریکہ ملک اسی لیے بنا ہے کہ چمکیلے سکّے چند دے کر سب کچھ خرید لیتا ہے۔ اس کے بدن سے جوہر نچوڑ لیتا ہے۔ اس کا رنگ جذب کر لیتا ہے۔ اس کی خوشبو چوس لیتا ہے۔ صرف خیالوں میں چند قدروں کو باقی رکھتا ہے۔ خیالوں سے تخلیق نہیں ہوتی۔ تخیل کا کام رنگ آرائی اور نقش کاری ہے۔ تخیل مونالیزا کی مسکراہٹ نہیں بن سکتا، وہ تو لیونارڈو ڈاونچی کی روح سے اس کے اندرون سے کھینچ کر آتی ہے۔ اس میں فنکار کی زندگی کا جوہر ہے۔ لیونارڈو ڈاونچی اس وقت موجود ہوتا اور امریکہ میں رہتا تو فقیر بن کر امریکہ کی سڑکوں پر لاکھوں ڈالر کی گاڑی میں مارا مارا پھرتا۔ شاہی حجامن کی طرح اس کا فن حجامت بنانا ہوتا، مونالیزا بنانا نہیں۔ میں روتی ہوں کہ میں شیخوپورہ والی انجم کیوں نہ رہی، امریکہ کی انجم کیوں بن گئی۔

☆☆☆

(۴)

میرے بچپن کی بہت ساری حسین یادیں ہیں۔ان یادوں میں سے ایک یاد میری بڑی باجی ہیں۔میری باجی......
زندگی سے بھرپور، خواب خواب سی مسکراتی آنکھیں، الجھے ہوئے بالوں کے بیچ چمکتا ہوا پُرکشش چہرہ، گلے لگا ہوا فونٹین پین، ہاتھ میں کچھ تحریر شدہ اور کچھ سادے اوراق کی ایک کاپی اور کچھ کتابیں۔ چہرے پر اعتماد کی پُر وقار روشنی، خوبصورت آواز کی مالک تھیں۔تنہائی میں گنگنانے والی۔ پھولوں سے، برگ و بار سے بے تحاشہ محبت کرنے والی باجی کو جب میں تصور میں لاتی ہوں تو مجھے خوشبوؤں سے لدی ٹھنڈی نسیمِ صبح کا لمس محسوس ہونے لگتا ہے اور پھر اسی پل مجھے اپنے آپ پر تعجب ہونے لگتا ہے کہ میں نے اتنی کم عمر میں باجی کی ایک ایک ادا کو، ان کے انداز کو، ان کے خدوخال کو، ان کے پُرکشش چہرے کو اپنے ذہن میں کس طرح محفوظ کرلیا؟ کس طرح میں نے اپنے چھوٹے سے ذہن میں ان سے متعلق مناظر کو سمولیا؟ ان کے نرم لہجے کے اُتار چڑھاؤ کو، پیار اور شفقت سے بھری آنکھوں کے اشاروں کو محسوس کیا جو آج تک کسی بینک میں رکھے ہوئے جواہرات کی طرح میرے دل کے اندر محفوظ ہیں۔

خاندان میں سب سے پہلی لڑکی باجی تھیں جنھوں نے میٹرک بہت ہی اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ سارے رشتہ داروں اور دوستوں میں ایک دھوم مچ گئی تھی۔امی، جنھوں نے ڈھنگ اور سلیقہ سکھایا تھا، ان کا سر فخر سے اونچا تھا۔ابا بھی بہت زیادہ خوش تھے۔مگر ان کے دوست اور ملنے والوں نے انھیں ڈرا دیا تھا،"ارے صاحب! آپ نے یہ کیا کیا؟ کیا لڑکی

کی شادی نہیں کرنی ہے؟ پڑھی لکھی لڑکی کی شادی جلد نہیں ہوتی ہے۔'' لوگوں نے ڈرایا بھی تو ابا کو۔ ایسے شخص کو جو کہ پہلے ہی زندگی کی راہ میں ہر قدم بہت ہی پھونک پھونک کر رکھتے تھے۔ میرے سیدھے سادے ابا اس قدر ڈر گئے کہ میٹرک کے آگے باجی کی پڑھائی ہی بند کروادی۔ باجی نے ابا کا کہا مانا اور گھر میں پھر وہی سلائی، بُنائی، کشیدہ کاری، ناول اور افسانوں کے بیچ میں گھر کر باجی اپنے شب و روز گزارنے لگیں۔ گھر کے باہر کے بھی لوگ ان پر جان چھڑکتے اور ہر انسان پسند کرتا۔ امی بھی باجی کی پڑھائی رکتے دیکھ کر موقعے کی نزاکت پہچان کر باجی کو کندن بنانے میں اور بھی منہمک ہو گئیں۔ سسرال جانے سے پہلے یہ سیکھ لو، یہ کر لو، کپڑے سینا جان لو، کھانا پکا لو، کشیدہ کاری سیکھو۔ اور باجی بھی امی کی کہی ہوئی سب باتوں کو سن کر سب کچھ سیکھتی گئیں۔ اور پھر ایک دن کندن بن کر چمک اٹھیں۔ ریشم، کریپ، ململ اور یک رنگے کے سبک لمس جیسی شخصیت بن کر باجی ہر دلعزیز ہو گئیں۔ ہرے لان میں پھولوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی، سبز پتوں کو چھوتی ہوئی، موسموں کی خوشبو کو چنتی ہوئی، اپنی سوچوں میں باجی کرن کی طرح جگمگانے لگیں۔

میں آج کل کی بات نہیں لکھ رہی ہوں مگر ان دنوں ہندوستان کی ساری لڑکیاں اپنے گھر سے کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی سسرال کے انجان ماحول میں جا کر خود کو بسانے کی سو فی صد کوشش کرتی تھیں۔ اسی کوشش کی وجہ سے ان کے ہاتھوں کی مہندی میں سرخی آتی تھی۔ کانوں کی بالی میں چمک اور مانگ کے سیندور میں لال رنگ نکھرتا تھا۔ اسی بندھن میں انھیں سکھ ڈھونڈنا ہوتا تھا۔ اسی کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ بلکہ ٹریننگ دی بھی نہیں جاتی تھی، ٹریننگ خود اپنے آپ ہی لینی پڑتی تھی۔ ہر اچھی بُری بات کو فرخندہ نصیبی سمجھ کر مسکرانا ہوتا تھا۔ علم، ڈھنگ، سلیقہ لیے سمندر کی سی گہری اتھاہ آنکھوں والی لڑکیوں کو، جذبات اور احساسات سے لبریز دل والیوں کو اندھیری رات کے سہمے سہمے چاند کی مانند اجنبی ماحول میں خود کو ڈھال لینا ہوتا تھا۔ نئے آنگن میں اپنی چمکتی روشنی کو بکھرانا ہوتا تھا۔ وہاں کی کھردری زمین کو سنگ مرمر جیسا تراشنا ہوتا تھا اور پھر گلابی جاڑے میں گرمی کی لو میں، بارش کی بوندوں میں، پت جھڑ کے زرد غبار میں، سر پر آنچل سنوارتے ہوئے، ننگے پاؤں صحن کی چاروں دشاؤں کی طرف جی جی بول کر مسکراتے ہوئے دوڑنا بھاگنا ہوتا تھا۔ اپنی انا، تمکنت، باتوں کی شوخی، ناز و انداز کو ایک لفافے میں بند کر کے صحن سے جُڑی چہار دیواری کے اس پار کہیں رکھ دینا ہوتا تھا۔

باجی کے اندر بھی ایک ہندوستانی لڑکی کی طرح وہ ساری صلاحیتیں موجود تھیں جو مشکل سے مشکل وقت میں چٹان کی طرح کھڑی رہتی ہے۔ باجی کے بھی بے تحاشہ رشتے آئے۔ امی اور ابا کافی دنوں تک ہر رشتے کو تولتے رہے، سوچتے

رہے۔ ابا کی نظر میں جو ایک اچھے لڑکے کا خاکہ بنا ہوا تھا وہ اب تک نہیں آیا تھا۔ انتظار تھا۔ آخر کار ایک دن ایک رشتہ آیا۔ خوبرو، پڑھے لکھے اچھے خاندان کے، سیّد کی تلاش جو ابا کو تھی، وہ مل گیا اور پھر باجی نے ماں باپ کے آگے سرخم کر دیا۔ اور پھر ایک دن مانگ میں سیندور، بالوں میں موتی پروئے، جوہی چمیلی کے گجروں سے لدی پھندی، باجی موسمِ گل کی راج کماری، سسکتی ہوئی نوشے بھائی کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اپنے سسرال روانہ ہوگئیں۔ اس وقت میں تین چار سال کی تھی۔ مجھے کوئی خبر نہیں کہ کب دلہا آیا، کب بارات آئی اور کب باجی دلہن بن کر اس سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر چلی بھی گئیں۔!!

باجی کا یوں سب لوگوں سے جدا ہو جانا تکلیف کی ایک قدرتی بات تو تھی مگر میرے ماں باپ باجی کے لیے ایک تعلیم یافتہ اور ایک شریف ساتھی کو چن کر بے حد خوش تھے۔

ویسے مشرقی زندگی کی یہ خصوصیت برِ صغیر ہند و پاک تک محدود تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پشاور سے آسام تک زندگیوں میں صدیوں تک صوفیوں کی ایک محنت شامل ہوئی۔ یہ محنت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے پہلے بھی انفرادی طور پر جاری رہی۔ خدا پرستی نے خود سپردگی کا ایک عام جذبہ مردوں میں عورتوں میں اور ان کی بیرونی اور اندرونی زندگی کو ایک خاص ڈھانچے میں ڈھال گیا۔ اس سانچے میں ہندوستانی دیومالائی تہذیب کے اثرات بھی نمایاں رہے۔ ہندوستان کی ہندو عورتیں اپنے شوہر کو بھگوان کا روپ دیتی تھیں۔ وہاں محبت اپنے مقام سے اٹھ کر پرستش بن جاتی تھی۔ یہ سرزمین کا اثر ہے اور ہزاروں سال کی تہذیب کا اثر ہے جو پچھلی یعنی بیسویں صدی تک باقی رہی کہ بیویاں اپنے شوہر کی موت پر خود بھی شوہر کی چتا پر بیٹھ کر اپنے آپ کو خاکستر بنا دیتی تھیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ میکے سے سسرال جانے والی دلہن پھر مر کر ہی گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ صوفیوں میں جو خدا کے ساتھ خود سپردگی کا رشتہ ہے اس نے عورتوں میں بھی خود سپردگی کا مزاج پیدا کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ افراط تفریط سے الگ ہو کر جائزہ لیا جائے تو اعتدال کی حد تک یہ جذبہ ہندوستانی معاشرت میں بہت پاکیزگی پیدا کرنے کا سبب بنا۔ اور عورتوں کا کردار بہت بلند ہو گیا۔ یہ بلندی مغربی تہذیب کے داخل ہونے تک بہت نمایاں رہی۔ اردو شاعری میں غالبؔ کے افکار کے نمایاں اثرات رہے اور اس نے اکبرؔ سے اشعار کہلوائے کہ بیویاں کہتی ہیں:

خود تو گٹ پٹ کے لیے جان دیے دیتے ہیں
مجھ سے کہتے ہیں کہ پڑھ لیجیو قرآن شریف

☆

ترقی کی راہیں زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

ورنہ دلہنیں اطاعت گزاری، فرماں برداری اور شوہر پرستی کا اعلیٰ نمونہ ہندوستان ہی میں تھیں۔ دلہنوں کی زندگیاں شوہر کی بے چوں چرا اطاعت کا نمونہ بن جاتی تھیں۔ شوہر کی مرضی، شوہر کی خواہش، شوہر کی پسند، ان کی اپنی مرضی، اپنی خواہش، اپنی پسند بن جاتی تھی۔ یہ صبر، تربیت اور ماحول خود سکھا دیتی تھی، اس میں محنت کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ باجی اسی ماحول، اسی تربیت اور اسی فطرت کی زندہ نمونہ تھیں۔ وہ تو خدا کا شکر تھا کہ باجی کو ان کا ہم سفر بہت ہی نیک اور بڑوں کی عزت کرنے والا ملا۔

شاید اپنے بچپن میں باجی کی رخصتی کی یاد میرے لاشعور کے کسی کونے میں ہو بہو جذب ہو گئی تھی۔ اس لیے جب برسوں بعد میں نے اپنی نظم "مداوا" لکھی تو اس میں جن جذبات کی عکاسی کی گئی تھی، وہ میرے تو تھے ہی، لیکن ان پر باجی کی رخصتی کے دن کی چھاپ بھی تھی۔ نہ معلوم کیسے یہ دو دن آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ ایک کہاوت ہے کہ لڑکیاں "دو جنمیاں" ہوتی ہیں۔ یعنی ایک ہی جنم میں انھیں دو جنم کاٹنے ہوتے ہیں۔ گائے کی طرح گھر کے آنگن کے کھونٹے سے رسّی کھول کر ماں باپ نے جس کے ہاتھ میں تھما دی، وہی ان کا مجازی خدا ہو گیا!

تو بات تھی میری نظم "زرد چمیلی کی خامشی" کی۔ آج بھی جب اس نظم کو پڑھتی ہوں تو مجھے باجی کی رخصتی کا وہ غائبانہ منظر یاد آ جاتا ہے جس کو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا:

زرد چمیلی کی خامشی

یہ کس کے قدموں کی چاپ آئی...... یہ کون آیا؟
یہ بام و دراب جو خستہ جاں ہیں
یہ چونک اٹھے ہیں
یاس و حسرت سے شکل ہم سب کی تک رہے ہیں

جگر کا درد شدید سہہ کر دراڑ نیلے سے پڑ گئے ہیں
کسی کے ہاتھوں کے لمس کو یہ ترس رہے ہیں
میں ڈبڈبائی نگاہ سے صحن پار کر کے انھیں ستون کے شکستہ سائے میں
سر جھکائے گزشتہ یادوں میں کھوگئی ہوں
وہی ستوں جو تھکے تھکے سے......ملول ہیں اور شگاف سے
جن کی سرخ اینٹیں پرانے زخموں کی طرح دن رات رس رہی ہیں
جنھیں چمیلی کی زرد بانہیں لگا کے سینے سے کہہ رہی ہیں
کہ ہم تمھارے دکھوں سے اتنے قریب تر ہیں کہ
اب دوئی کا نہیں ہے کوئی بھی فرق باقی
وہ پلکیں خوابوں سے الجھی الجھی
وہ سرخ جوڑے میں سہمی سہمی
لُبی حنا میں لرزتی بانہیں تمھاری گردن میں تھیں حمائل
تمھیں نے جس کو کیا تھا رخصت
وہ دور جا کر ایک ایسی بستی میں بس گئی ہے جہاں کوئی ہم زبان نہیں ہے
منڈیر پر کی نحیف بیلیں خلا میں ہر سمت دیکھتی ہیں
وہ کیسے بولیں کہ ان کے لب پر سکوت کی مہر سی لگی ہے
مگر دعا ایک فضا میں گونجی کہ تو جہاں ہے وہیں کھلے تو
بلا سے دامن ہے اپنا خالی
نہیں میسر جو بوند اک بھی

☆☆

باجی کا سسرال سے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ لیکن چند سال کے اندر ہی نوشے بھائی نے پاکستان منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہاں نوکری اچھی مل گئی۔ ان کے کچھ رشتہ دار بھی وہاں آباد ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر ایک دن پوری تیاری کر کے جانے کا مکمل ارادہ کر لیا۔ باجی کی بے چینی دن بہ دن بڑھنے لگی۔ وہ بے حد اداس ہو گئیں جو کہ قدرتی بات تھی۔ اپنوں سے جدا ہونے کے تصور سے ہی وہ جیسے کانپ گئیں۔ وہ باجی، جو اپنے سارے بھائیوں بہنوں پر جان چھڑکتی تھیں، اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کے لیے ماں کی طرح تھیں، ان کو اپنی ساری دولت چھوڑ کر جانا تھا۔ نہ جانے کہاں؟ کون سے شہر میں؟ کون سی انجان گلی میں، جس کا انھیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مگر جانا تو تھا ہی۔ آخر کار ایک روز امی اور ابا کے گلے سے لپٹ کر باجی روئیں اور نوشے بھائی کے ساتھ کراچی جیسے بڑے شہر کے لیے پٹنہ، بہار، ہندوستان سے روانہ ہو گئیں۔

ایک صبح مجھے یاد ہے کہ گھر کے پچھلے حصے میں ایک چبوترے پر باجی کی بلّی، جس کا نام بیگم تھا، رو رہی تھی۔ باجی اسے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ ہم نے آکر امّی کو بتایا کہ امّی باجی کی بیگم رو رہی ہے۔ اب میں جب یاد کرتی ہوں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس بلّی کے آنسوؤں سے ہی مجھے یہ پوچھنے کی جستجو ہوئی تھی کہ آخر اس بلّی نے آنسو کیوں بہائے؟ اس لیے کہ امی سے پتہ چلا تھا کہ باجی، بیگم کو اس قدر پیار کرتی تھیں کہ ان کے جانے کے بعد یہ کبھی کبھی بیٹھ کر باضابطہ روتی ہے۔ اس بلّی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی باجی کی جدائی اور کھلنے لگی۔ باجی کو دیکھنے کا، ملنے کا، اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کا اشتیاق جیسے دن بہ دن بڑھتا ہی گیا۔ میں ایک ادنیٰ سی ہستی، اس بلّی کے آنسوؤں کے سوز و گداز کو محسوس کر کے اپنے جذبوں کو سنبھالے سنبھالے اسی عدالت گنج کوارٹر میں گھومتی پھرتی رہی۔ استعاروں، اشاروں اور خوشبوؤں کے لشکر کو اپنی ننھی سی دنیا میں بسائے بسائے باجی اور نوشے بھائی کے لیے مصروف انتظار رہتی تھی۔ میں نے امی سے کبھی بھی بے حساب سوالات نہیں کیے، جیسے بہت سے بچے کرتے ہیں۔ یہ جانتی تھی کہ شاید جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہونا ہی ہے۔ یہ سب تو بڑوں ہی کا فیصلہ تھا کہ باجی ہم لوگوں سے بچھڑ کر ہندوستان سے پاکستان چلی جائیں۔ زندگی کی طرح سے بے قرار میری باجی، خلوص، شفقت اور محبت کی ساری دولتوں کو لے کر، ان سے مجھے محروم کر کے چلی جائیں۔ میرے منع کرنے سے، پاؤں پٹخ کے رونے سے بھی کیا باجی رُک جاتیں؟ نوشے بھائی کو پاکستان جانا ہی تھا اور ساتھ میں باجی کو بھی۔ سو وہ چلے گئے۔ ایک باب تمام ہوا لیکن کیا زندگی کی کتاب کے باب کبھی ایسے بھی ختم ہوا کرتے ہیں؟

میں سوچتی ہوں کہ یہاں کتاب کے ابواب پہلے ایسے ہی ختم ہو جاتے تھے۔ یہ زندگی کی رنگا رنگی کا ثبوت ہے۔

والدین کی اطاعت، شوہر کی اطاعت، شوہر کے والدین کی اطاعت، یہ مختلف پہلو ہیں زندگی کے۔ ایک باب ختم ہوتا تھا، تو دوسرا دروازہ کھل جاتا تھا۔ پھر عموماً پچھلا دروازہ بند ہی ہو جاتا تھا۔ اس کے دوبارہ کھلنے کا امکان بہت دور افق کے سو پردے میں چھپ جاتا تھا۔ یہ کچھ میری باجی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، ایک روش تھی جو معاشرے کو سو فیصدی اپنی آغوش میں جکڑ لیتی تھی۔ باجی کی زندگی میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہوا۔ سبک روی سے وہ ایک دروازے میں داخل ہوئیں۔ آگے دروازہ کھلا تو قدم کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس میں بھی داخل ہو گیا۔ اور مڑ کر دیکھنے کی ضرورت بھی شاید نہیں ہوئی تھی، وہ دروازہ اور آنگن جہاں اب رہنا تھا۔

میری بڑی باجی کی شادی جب ہوئی تھی تو میں بہت چھوٹی تھی۔ صرف ایک ہلکا، دھندلا سا منظر یاد آتا ہے جب میری امی نے میرے گھر کے ایک پرانے نوکر سے کہا تھا، ''ذرا سا انجم کو عاصمہ کے سسرال لے جاؤ، یہ عاصمہ کو بہت تلاش کر رہی ہے۔'' اس وقت میں قریب تین سال کی ہوں گی۔ جیسے ہی میں ان کے گھر میں داخل ہوئی، دروازے کے پاس باجی کے جیٹھ (ضیاء الہدیٰ صاحب) بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے پکڑ کر کہا، ''اب اسے نہیں جانے دیں گے''، لیکن میں جلد ہی وہاں سے بھاگ کر باجی کے پاس چلی گئی۔ باجی، جو صرف چند دن پہلے ہی دلہن بنی تھیں، حسب روایت شرم و حیا کی گٹھری بنی ہوئی دیوار کی طرف منھ کیے ہوئے بیٹھی تھیں۔ تین برس کی بچی، میں اس روایت کو اس وقت تو کیا سمجھ سکتی تھی کہ دلہن اپنے سسرال میں کیوں اپنا سراپا سب سے چھپائے رکھتی ہیں۔ اب سوچتی ہوں کہ زمانہ کس قدر بدل گیا ہے۔ اب دلہنیں ہار سنگھار کے لیے ''بیوٹی پارلر'' لے جائی جاتی ہیں۔ ان کا میک اپ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایکٹرسوں کا بھی کیا کیا جاتا ہوگا۔ مہمانوں کے سامنے کھلے منھ پھدکتی پھرتی ہیں۔ شادی کے بعد نیا بیاہا ہوا جوڑا بازار، سنیما گھر، دعوتوں، محفلوں میں سب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ لیکن ان دنوں حالت مختلف تھی۔ باجی دیوار کی طرف منھ کیے بیٹھی تھیں۔ ان زیوروں میں، لال کپڑوں میں مجھے ان کو دیکھ کر بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اس جوڑے میں مجھے وہ ایک اجنبی سی لگ رہی تھیں۔ میں زیادہ دیر تک ان کے پاس بھی نہ ٹھہر سکی اور بنّی داوا، جو ہم لوگوں کے یہاں کام کرتے تھے، ان کے ساتھ فوراً گھر واپس آ گئی۔ یہ ایک ایسا سین تھا جو آج بھی باجی کا نام سنتے ہی میرے ذہن کے پردے پر ایک فلم کی طرح حرکت کرنے لگتا ہے۔

میں اکثر سوچتی ہوں اور یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ سب سے پہلے مجھے کب ہوش آیا تھا اور وہ کون سا سین تھا

جو میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔

بہت زیادہ کوشش کے بعد ایک بہت ہی حسین سا واقعہ یاد آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاش میں اسی برآمدے کی سیڑھیوں پر پھر سے واپس چلی جاتی اور ان کو چوم لیتی۔ جہاں کی ہر چیز سادہ اور حسین تھی۔ میں سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ میرے منجھلے بھیا بھی قریب ہی بیٹھے تھے۔ کچھ اور لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے تھے جس کا عکس سا دماغ میں آتا ہے۔ سامنے بیچ والے کمرے کی، یعنی ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر ٹیک لگائے ہوئے میری باجی ایک ہری ٹیشو کی بنارسی ساڑی پہن کر کھڑی ہیں اور اپنے خاص انداز سے مسکرا رہی ہیں۔ ہرا رنگ مجھے کیسے یاد ہے اور اس پر ٹیشو کا کپڑا، واقعی یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ یہ باجی کی شادی کے بعد کا واقعہ ہے اور ان کے پاکستان جانے کے بس کچھ دن پہلے کا ہے۔ ماں، باپ، بھائی بہن، گھر آنگن، سب کچھ چھوڑ کر باجی پاکستان چلی گئیں۔ منجھلے بھیا ان ہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہم سے چھیڑ خانی کر رہے تھے اور باجی سے کہہ رہے تھے، ''باجی، آپ انجم کو اپنے ساتھ لیتی جایئے۔ یہ آپ لوگوں کے گھر کا کام کرے گی۔'' اور میں وہاں پر بیٹھی بیٹھی بے حد خفا ہو رہی تھی، ''کیا میں دائی ہوں جو میں گھریلو کام کروں گی!''

باجی پھر کب گئیں، کیسے چلی گئیں، وہ امی سے لپٹ کر کب روئیں، مجھے کچھ خبر نہیں۔ ضرور میں اس وقت سونے چلی گئی ہوں گی۔ کسی نے مجھے باضابطہ خبر کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ امی سے پوچھا کہ کیا باجی چلی گئیں؟ کہاں گئیں؟ تو جواب ملا ''باجی تو اپنے سسرال جانے ہی والی تھیں، سو وہ چلی گئیں۔'' اور میں خاموش ہو گئی۔ میں خاموش تھی اور درد کی لہر، ایک کسک میرے دل پر ضرور چھائی ہوئی تھی۔ اسی وقت شاید فلسفے کی ایک رمز نے میرے اندر جنم لیا ہوگا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے باجی کا چہرہ، وہ لطیف پیکر، شگفتہ لہجے والی میری باجی مجھ سے کوسوں دور تھیں اور ان کی یاد کے سائے رات دن میرا پیچھا کرتے تھے۔ میں ان کے کمرے میں جاتی تھی اور سبھی لوگوں کو بتاتی کہ یہ باجی کا کمرہ ہے اور وہ جلد آنے والی ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور پھر آہستہ آہستہ باجی کو نہ دیکھنے کی عادت سی پڑ گئی۔ ایک چھوٹا بچہ یوں بھی بہت گہری سوچ کہاں رکھتا ہے۔ میرے احساس پر باجی کی جدائی کا ایک ہلکا سا نشان ضرور پڑا تھا۔ مگر میرے ذہن میں ان کی یاد کا ایک روشن ستارا بھی مستقل جگمگاتا رہا۔

شاید انسانی رشتوں میں مستقل مزاجی کا فقدان ہے۔ شاید یہی قدرت کا اصول ہے کہ جن سے ہم پیار کرتے ہیں،

جن کے بغیر زندگی کا ایک لمحہ کاٹنا بھی پہاڑ سا دشوار گزار لگتا ہے۔ جن کی جدائی کا تصور بھی ایک ہولناک تصویر بن کر ابھرتا ہے۔ وہی جب ہم سے دور ہو جاتے ہیں، ہمارا ساتھ چھوڑ کر کسی نئی جگہ چلے جاتے ہیں، اپنا بسیرا، اپنا کاشانہ ہم سے دور بسا لیتے ہیں تو ہم انہیں نہ دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور یہ معمول سا ہو جاتا ہے کہ ہم محسوس کریں کہ وہ ہمارے آس پاس نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہ ہم انہیں بالکل ہی بھول جاتے ہیں، اکثر و بیشتر ان کی یاد آتی رہتی ہے۔ ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے، لیکن اکٹھے جینے اور اکٹھے مرنے کی بات بعید از قیاس ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح باجی کا سسرال جانا اور پھر وہاں سے پاکستان ہجرت کر جانا میرے لیے زیادہ عرصے تک ایک انہونی سی بات نہ رہ سکی۔ اور میں نے اس کو پہلے ذرا مشکل سے، اور پھر فراخدلی سے برداشت کیا۔

پھر ایک وہ دن بھی میری دعاؤں کے طفیل سے چمک اٹھا جب ہم لوگ سرکس دیکھ کر واپس آئے تو پتہ چلا کہ پاکستان سے ٹیلی گرام آیا ہے کہ باجی کو بیٹا ہوا ہے اور تھوڑے ہی دن کے بعد باجی آنے والی بھی ہیں۔ اور پھر ایک روز عین آدھی رات کے وقت میری نیند ٹوٹی تو دیکھا کہ باجی پولکا ڈاٹ کا کالا جمپر، سفید شلوار اور کالا دوپٹہ اوڑھ کر سامنے کھڑی ہیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہیں۔ شاید پاکستان کے حساب سے بالکل نئے فیشن کے لباس میں تھیں۔ اس وقت وہ بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔ میں اپنی آنکھیں کھول کر اپنی مسہری کے پردے کے اندر سے لیٹی لیٹی ان کو دیکھتی رہ گئی۔ میری باجی تو ہیں، میں نے سوچا، مگر یہ تو بالکل مختلف لگ رہی ہیں۔ یہ تو اور بھی خوبصورت ہو گئیں۔ یہ اتنی خوبصورت کیسے ہو گئیں؟ آنکھیں اتنی بڑی بڑی بادام کی طرح کیسے ہو گئیں؟ اتنی خوبصورت باجی تو کبھی نہیں تھیں۔ رنگ جیسے اور سفید ہو گیا تھا۔ نوشے بھائی بھی ساتھ میں تھے۔ ایک بیوی بن کر، ایک بچے کی ماں بن کر، باجی سرفرازی کا تاج پہنے اپنے آپ میں دنیا جہان کی دولت سمیٹے میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ میں تھوڑی دیر ان کو یوں ہی تکتے تکتے یک بیک اپنے بستر سے اٹھ کر بے اختیار رو پڑی اور اپنی باجی کے سینے سے لپٹ گئی۔ مجھے جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ باجی واپس اپنے گھر میں آ گئی ہیں۔ وہ باجی جن کا انتظار رات اور دن ایک چھوٹے سے ذہن پر بوجھ بن کر مسلط تھا۔ وہی باجی اب آ گئی تھیں۔ خوشی سے پورا جہان جھوم رہا تھا۔ لوگ، رشتہ دار سب آئے گئے۔ ایک ہنگامہ رہا۔ لیکن یہ ہنگامہ دیرپا نہیں رہا۔ اس لیے کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد ہی پھر باجی کے جانے کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ وہ چند ہفتے تو پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ کراچی شہر کے قسم قسم کے قصے سناتیں اور ہم لوگ بھی ان چند ہفتوں میں ایک منٹ بھی بیکار نہ جانے دیتے اور ان کی باتیں سنتے رہتے۔

باجی کے ساتھ ان کا بیٹا (منور الہدیٰ) ہر وقت باجی کے سینے سے چپکا رہتا تھا۔ چند ایک گانے سے بغیر سوتے نہیں تھے۔ جیسے ''راجہ کی آئے گی برات'' اور ''تصویر تیری دل مرا بہلا نہ سکے گی''۔ وہ ہم لوگوں کی زندگی میں کھلونے کی طرح آ گیا تھا۔ نوشے بھائی ان دونوں گانوں کو بہت سُر میں گاتے تھے۔

باجی کی آواز بہت ہی خوبصورت تھی۔ غزلیں اور گانے وہ ہر وقت ہی گنگناتی تھیں۔ خاص کر ایک گانا ''دیکھو جی میرا جیا چرائے لیے جائے''، لتا منگیشکر کا گایا ہوا یہ گانا مجھے آج تک بے حد پسند ہے۔ میں نے لندن میں ایک ریکارڈ صرف اسی ایک گانے کی وجہ سے خریدا تھا جو میرے پاس اب تک ہے۔ میں اکثر اس گانے کو سنتی ہوں اور ساتھ ساتھ ویسے ہی گنگناتی ہوں جیسے باجی عدالت گنج میں آنگن میں اُترنے والی سیڑھیوں پر بیٹھ کر گاتی تھیں۔ ہم بھی ان کے بہت ہی قریب بیٹھ کر سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ آج بھی میں اس گانے کو سنتی ہوں تو اس کوارٹر کا برآمدہ، کمرہ، آنگن اور دیوار پر چڑھتی ہوئی چمبیلی کی بیل، سب کچھ جیسے میری نظروں کے سامنے آ جاتا ہے، اور اس گانے کی دھن میں باجی کا وہ شوخ پیکر، ان کا سراپا لہرانے لگتا ہے۔

مجھے ایک لمبی دوپہر یاد آ رہی ہے جب مئی جون اور جولائی کے زمانے میں گرمی اپنے شباب پر ہوتی تھی۔ دن تو دن، رات میں بھی لو چلتی تھی۔ دوپہر میں بارہ بجے کھانا کھا کر ہم بھی کمروں میں بند ہو جاتے تھے اور پھر شام پڑتے ہی کمروں سے باہر نکلتے تھے۔ وہ دوپہر مجھے اب تک یاد ہے جب باجی نے مجھے کہا، ''چلو کمرے میں، باہر بہت گرمی ہے۔'' دوپہر کا کھانا جیسے ہی ختم ہوا، ہم لوگ بھی کمرے میں چلے گئے۔ باقی لوگ کہاں تھے، مجھے یاد نہیں۔ صرف یہ یاد ہے کہ ہم باجی کے ساتھ ان کے کمرے میں بند ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد باجی بتانے لگیں کہ ان کی ایک دوست بھی چند منٹوں میں آنے والی ہے، لیکن مجھے باہر نہیں جانا ہے، یہیں پوری دوپہر گزارنی ہے، لہٰذا میں وہیں ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر تکیہ لگا کر لیٹی رہی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دروازے کی کنڈی ہلی اور باجی کی ایک بہت ہی خوبصورت سی دوست جن کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا، کمرے میں مسکراتی ہوئی داخل ہوئیں۔ اس روز تو وہ بے حد ہی حسین لگ رہی تھیں۔ دونوں نے اشاروں میں کچھ باتیں کیں۔ پھر باجی نے میری طرف دیکھ کر کہا، ''اس کو ابھی کوئی عقل نہیں ہے، اس سے کیا ڈر رہی ہو۔ یہ کسی کو کچھ نہیں کہے گی۔ چلو تم شروع ہو جاؤ۔'' میں زمین پر لیٹی لیٹی ٹک ٹک ان دونوں کو گھورتی رہی کہ آخر ان لوگوں کا ارادہ کیا ہے۔ یہ کھسر پھسر کس بات کی ہو رہی ہے۔ خیر، میں ہمہ تن گوش رہی، مگر خاموش ہی رہی۔ اتنے میں باجی کی دوست نے دوپٹے کو

کاندھے پر رکھ کر، پھر کمر کے چاروں طرف گس کر باندھا۔ ایک ہاتھ اوپر اور دوسرا ہاتھ نیچے کر کے ”تا دھن تک دھن“ کرتی ہوئی ناچنے لگیں۔ دروازہ تو پوری طرح سے اندر سے بند تھا اور آہستہ آہستہ ان کے ڈانس کرنے کی رفتار میں تیزی آ رہی تھی۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا کہ مجھے احساس یہ ہونے لگا تھا کہ وہ ناچتے ناچتے جیسے ہوش کی دنیا سے کہیں دور، اپنے ناچ کے مسحور کن تال پر تھرکتی ہوئی، کسی اور ہی جہان رقص وسرور میں پہنچ چکی تھیں۔ میں نے اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں کسی کو بھی اس بے باکی سے ناچتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لیے میں سراپا حیرت زدہ آنکھیں پھاڑ کر ان کو گھورے جا رہی تھی اور باجی ...... اور باجی تو اپنی سہیلی کے ناچ میں بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔ خیر، کافی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ تھک کر بیٹھ گئیں اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھر روانہ ہوگئیں۔ اب بھی جب کبھی اس دلربا منظر کو قرطاس ذہن پر منعکس کرتی ہوں تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ سنگیت، رقص اور جوانی کا کس قدر گہرا تعلق ہے۔ جو بات الفاظ میں نہیں کہی جا سکتی، جو زبان پر نہیں آ سکتی، وہ body language سے کہی جا سکتی ہے۔ شاید اسی یاد کے سہارے میں نے اپنی نظم ”دھنک“ تخلیق کی تھی۔ اس منظر کا معمولی سا عکس اس نظم میں دیکھا جا سکتا ہے:

پھر آج میرے تصور میں موتیا جاگا
پھر آج سبز پری اُتری چھچھاتی ہوئی
پھر آج ڈالیاں پھولوں کی رقص کرنے لگیں
پھر آج خوشبوؤں سے بام و در مہکنے لگے
پھر آج پھیل گیا روح و دل میں سیل جمال
اثر نہ درد کا باقی رہا نہ غم کا خیال
پھر اٹھا چڑیوں کا ایک جھنڈ چہچہاتا ہوا
ہوا ہرے بھرے کھیتوں سے اٹھی گاتی ہوئی
میں دیکھنے لگی، سننے لگی، نکھرنے لگی
چھلکنے لگ گئی، سجنے لگی، سنورنے لگی
وہ میرا گاؤں کا گھر لال لال کھپرے کا

پھر اس کی اولتی سے ٹھنڈی دھار گرنے لگی
وہ ٹھنڈی دھار میری روح میں سمانے لگی
بھگونے لگ گئی مجھ کو
میں کھلکھلانے لگی

•

شام کو ہم بھی کمرے سے باہر نکلے۔ نکلتے ہی میں نے پوری تفصیل چھوٹے بھائی جان کو بتائی۔ ایک دو اور لوگوں نے بھی سُن لیا۔ چھوٹے بھیا اور منجھلے بھیا خوب ہنس رہے تھے اور دونوں ہی باجی کو خوب چھیڑ رہے تھے اور باجی مجھ پر خفا ہو رہی تھیں۔ مجھے صفائی میں کچھ کہنا بھی نہیں تھا اس لیے میں خاموش ہی رہی۔

جن دنوں کی باتیں میں لکھ رہی ہوں ان دنوں میں، میں اپنے اس سن تک نہیں پہنچی تھی جہاں اونچ نیچ کا احساس، بھلے بُرے کی تمیز اور راز مخفی رکھنے یا افشا کر دینے کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے۔ اب ہلکا ہلکا سا کچھ یاد آتا ہے اور پھر بیچ کا حصہ بھول جاتی ہوں۔ یہ ایک عجیب سی بات لگتی ہے کہ مجھے سب کچھ یاد کیوں نہیں ہے۔ کیا میں زیادہ تر سوتی رہتی تھی؟ یا جب انسان چھوٹا ہوتا ہے تو ایک الگ خمار آلودہ زندگی گزارتا ہے۔ صبح سے شام کیسے وقت گزرتا، کچھ خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ کیسے دو پہر آئی، سہ پہر آئی، پھر شام آئی اور پھر شام سے رات چلی آئی۔ شاید دن کے اجالے کے ساتھ ساتھ میرے ہوش و حواس بھی رخصت ہو جاتے تھے، اور پھر اس وقت سے صبح تک دنیا سے بے خبر ہو کر سوئی رہتی تھی۔ جتنی دیر کے لیے بھی جاگتی تھی، وہ وقت حُسن سے بھرپور، ان لمحوں میں سرخوشی کے ہنگامے، کھلکھلاتی ہوئی آوازیں، بولتی ہوئی آنکھیں...... زندگی کیا تھی، زندگی تو بس ایک موجِ رواں کی طرح بہتی چلی جا رہی تھی!

اسی طرح سے باجی کو کئی بار پاکستان سے آتے ہوئے اور جاتے ہوئے میں دیکھتی رہی۔ جب وہ آئی تھی تب بھی امی سے لپٹ کر روتی تھیں اور جانے کے وقت تو رونا ہی رونا تھا۔ ان کے آنے کی خبر سے گھر کا ہر فرد ناچ اٹھتا تھا اور میں...... میری نظر کی پوری کائنات تو جیسے جھوم جاتی تھی اور میری چھوٹی سی زندگی بس ایک تبسم پُر کیف ہو جاتی تھی۔ میں آنگن اوساروں میں کودنے لگتی، اچھل اچھل کر، زور زور سے بولنے لگتی، ''باجی آ رہی ہیں!...... باجی آ رہی ہیں۔'' گھر کی پوری فضا میرے ساتھ ساتھ مسکرانے لگتی۔

پھر باجی جتنے دنوں تک ہم لوگوں کے ساتھ رہتی تھیں وہ وقت اتنا تیزی سے گزرتا کہ جیسے پتہ ہی نہ چلتا کہ صبح سے

شام کیسے ہوئی۔ جیسے جیسے ان کے جانے کا وقت قریب آتا، دل بس بالکل بے اختیار ہو کر دھڑکنے لگتا: "ارے باجی کے جانے کے دن بھی آ گئے۔ یہ ایک ماہ کیسے گزر گیا۔" میں چھپ چھپ کر روتی، مگر باجی کو بھی پتہ نہیں چلتا، اور پھر باجی ایک دن سب سے مل کر خوب روتیں، سب ہی روتے تو ساتھ ساتھ میں بھی خوب رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی۔

ان کے جانے کے ہفتوں بعد تک ہم لوگ اداس رہتے تھے اور امی اور ابا تو بالکل ہی خاموش ہو جاتے تھے۔ میں اکثر ابا سے پوچھتی تھی، "ابا آپ نے باجی کی شادی ایسی جگہ کیوں کر دی کہ وہ ہم لوگوں سے اتنی دور چلی گئیں؟" ابا بے چارے زیادہ تر خاموش ہی رہتے تھے۔ میرے اس طرح کے سوال سے اور بھی اداس ہو جاتے اور کوئی مختصر سا جواب دے کر آگے بڑھ جاتے۔ کوئی کسی ملک بھی چلا جائے، وہ اتنی دوری نہیں لگتی تھی جتنی دوری ہندوستان اور پاکستان میں لگتی تھی۔ حالانکہ ہوائی جہاز سے تو ایک ہی دو گھنٹے کا سفر ہے۔ مگر ان دونوں ملکوں کی آپس میں جنگ و جدل اور نفرت کی آگ دونوں ملک کے تعلقات کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ آئے دن بس جنگ کی باتیں ہوتی رہتیں اور اسی چکی میں میری باجی پس رہی تھیں۔ جب تک بارڈر کھلا رہا، باجی آتی رہیں۔ بچوں کے ساتھ باجی آتی رہیں۔ مگر پھر ایک وہ زمانہ بھی آ گیا جب دونوں ملکوں میں زبردست لڑائی شروع ہو گئی۔ طرح طرح کی خبریں آتی رہیں۔ بارڈر بند ہو گیا۔ دل کا آدھا ٹکڑا اس پار اور آدھا اُس پار ہو گیا۔ امی آنسو بہاتی رہیں۔ ابا خاموش رہ کر آنسو بہاتے جس کا کبھی کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔ ریڈیو اور اخبار سے خبروں کی بوچھار ہوتی رہی۔ ہر کوئی جیسے سہم گیا ہو۔ باجی ہم لوگوں سے الگ ہو کر اُدھر الگ تڑپتی رہیں۔ انگلینڈ کسی کو خط بھیجتیں تو ایک ایک ماہ کے بعد گھوم گھام کر وہ خط آتا۔ بارڈر تو ایک مدت کے لیے جیسے بند ہو گیا تھا، اور میری باجی کو ہندوستان آئے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ کبھی کبھی باجی تصویر بھیج دیتیں تو وہ ہم لوگوں کے لیے ایک انمول تحفہ ہوتا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ سبھی کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی تھیں مگر ایک بے بسی کا عالم تھا۔ ہم لوگوں کی جدائی میں باجی رات دن آنسو بہاتیں۔ مجھے یاد ہے کہ باجی کا کبھی خط آتا تو وہ آنسو سے ایسا بھیگا ہوتا کہ بہ مشکل پڑھا جاتا۔ امی اور ابا کی والہانہ محبت کو یاد ہی کر کے باجی زندگی کے دن کسی طرح بس گزار رہی تھیں اور پھر اس طویل اور لمبی جدائی کے بعد تو جیسے ایک دوسرے سے نہ ملنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

سکوتِ مستقل سے جیسے دل کی بیتابی کو لوری ملنے لگی، مگر اس لوری سے کسی کو بھی آرام نہ مل سکا۔ ہر کوئی کبھی ظاہراً اور کبھی اندر سے بے چین رہا۔ میرے لب پہ نہ جانے کتنی ایسی کہانیاں، جو میں باجی کو سنانا چاہتی تھی، آ کر جیسے جم گئی تھی۔ ہر۔

بات کو یاد کر کے رکھتی تھی کہ باجی جب آئیں گی تو یہ بتاؤں گی، وہ بتاؤں گی۔ مگر اب میں بڑی ہو رہی تھی۔ اکثر خیالات کو دل کے اندر ہی جمع کر کے رکھتی تھی، کسی سے کہتی نہیں تھی اور دل ہی دل میں باجی کو یاد کرتی رہتی۔ کسی کا ذکر تو خاموش زبان سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ بس تصویر ہی واحد ایک ایسی چیز تھی جسے دیکھ کر ایک سہارا ملتا تھا اور باجی کی یاد بس ایک روشن ستارے کی طرح میرے دل میں منور تھی۔

باجی کا خط امی کے پاس آتا گیا کہ انجم کی شادی پاکستان میں کر دیجیے۔ لڑکے کے پاس بنگلہ ہے، گاڑی ہے، اعلیٰ نوکری ہے۔ کوئی تو میرے ساتھ بھی رہے گا۔ میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔ لیکن امی ابا اور بھائی بہن سب کو جیسے پاکستان سے خوف سا ہو گیا تھا۔ مجھے پاکستان روانہ کرنے کا خیال امی اور ابا اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکتے تھے۔ باجی کا خط آتا رہا، مگر امی اور ابا اس معاملے میں خاموش رہے۔ باجی وہاں اکیلی ہی رہیں اور بال بچوں میں الجھ کر ہم لوگوں کی یادوں کو سینے سے لگائے رہیں۔

میرے ماں باپ کے نحیف شانوں پر باجی کی جدائی کا غم ہر پل اور ہر لمحہ بوجھ سا بنا رہا۔ ان سے ملنے کے ذرائع اور مواقع کی مشعلیں جلتی بجھتی رہیں۔ لڑائی چلتی رہی۔ امی اور ابا کی افسردگی کا کیا پوچھنا۔ دونوں ہی بجھے بجھے رہتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کا راستہ بند تھا۔ صرف باجی ہی کے لیے نہیں، بلکہ نہ جانے کتنی اور مائیں، بہنیں، باپوں اور بیٹوں کے لیے بند تھا۔ بس یہی ایک آواز کان سے ٹکراتی رہی کہ ابھی تک راستہ بند ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ سے قبل ایک بار امی ہم کو لے کر پاکستان باجی کے پاس گئی تھیں۔ خوشی تو اپنی جگہ پر تھی کہ پاکستان جا رہی ہوں، باجی سے ملوں گی۔ باجی کا گھر دیکھوں گی۔ بچوں کے ساتھ کھیلوں گی مگر اتنے لمبے سفر کو ٹرین سے طے کرنا اتنی ننھی سی جان کے لیے کوئی آسان کام بھی نہیں تھا۔ اس وقت شاید میں کوئی سات آٹھ سال کی تھی۔ سفر کا سین پوری طرح یاد ہے۔ ویسے میں زیادہ تر نیند کے غلبے میں رہتی تھی۔ خیر، سفر کا آغاز ہوا۔ پٹنہ سے دہلی اور وہاں سے کراچی جانے والی ٹرین پر ہم ماں بیٹی سوار ہوئے۔ راستے میں کئی اسٹیشن آئے۔ پھر امرت سر اسٹیشن آیا۔

امرتسر کے اسٹیشن پر میں بیٹھی تھی تو بے حد پریشان تھی، اس لیے کہ ٹرین کے آنے میں بہت دیر ہو رہی تھی اور میرا جی گھبرا رہا تھا۔ میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کے لیے تیار تھا۔ مگر آنکھ میں جب بھر بھر کر آنسو آ جاتے تو منھ پھیر کر جلدی جلدی پونچھ لیتی تھی کہ کہیں امی نہ دیکھ لیں۔ میں امی کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ امی کہتی رہیں یہ کھالو، وہ کھالو، چلو

کچھ نہیں تو آم ہی کھالو، وہی مالدہ آم جو ہم لوگ شیخوپورہ سے باجی کے لیے کراچی لے کر جارہے تھے۔ مگر کھانے پینے کے لیے دل نہیں چاہ رہا تھا۔ انجان شہر میں، انجانے لوگوں کے درمیان، مارے خوف کے دل دھڑکتا ہی چلا جارہا تھا اور میں امی سے چپک کر بیٹھی تھی۔ خوفزدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتی رہی۔ کتنی دیر میں گاڑی آئی مجھے یاد نہیں ہے۔

گھر سے چلنے سے پہلے کا منظر بھی کافی افسردہ تھا۔ چند ہی ہفتے قبل باجی کا ٹیلی گرام کراچی سے آیا تھا کہ باجی کا دوسرا لڑکا (شاہد مرحوم) کا انتقال ہوگیا جو کہ صرف تین سال کا ایک بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ ٹیلی گرام آیا تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ دل تھا کہ پھٹا جارہا تھا۔ ایک تو غیر ملک میں باجی تنہا، اس پر اتنا بڑا دکھ، اس کے تصور سے ہم ابھی کانپ رہے تھے۔ امی اور ابا اور بھی مایوس ہوگئے۔ مگر امی بس خود پر بھروسہ کرکے، ہمت کرکے کھڑی ہوگئیں کہ انجم کو لے کر ہم چلے جائیں گے۔ ابا کی نوکری کا سوال تھا۔ سب کے اسکول کالج کھلے تھے، کون جاتا؟ ایک میں ہی تھی جو چھوٹے کلاس میں تھی جس کا اتنا زیادہ پڑھائی میں ہرج نہیں ہوتا۔ اور بس امی کی ہمت دیکھ کر ابا تیار ہوگئے تھے اور ہم لوگوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی باجی کی محبت میں رخصت کردیا تھا۔

مجھے اسٹیشن پر بیٹھے بیٹھے وہ سب منظر یاد آنے لگا کہ کیسے ٹیلی گرام کے آتے ہی چھوٹے بھائی جان زور زور سے رونے لگے تھے اور روتے ہوئے امی کو بتایا تو سب کے سب رونے لگے۔ ابا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ دن کے بارہ بجے ابا واپس آئے۔ ان کو دیکھتے ہی سب لوگ رونے لگے۔ میں وہاں پر نہیں تھی، نہ جانے کون سے خوف نے ابا کو آگھیرا کہ ان کی آواز میرے کان سے ٹکرائی، ''انجم کہاں ہے؟'' ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا ہوا۔ پھر امی نے انھیں بتایا۔ زندگی میں پہلی بار ہم نے ابا کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا۔ یہ دکھ، یہ غم، ہم لوگوں کے لیے بہت بڑا تھا۔ چند مہینے قبل ہی باجی اسے ہندوستان لے کر آئی تھیں۔ ہم تو ہر وقت اس کو اپنی گود میں رکھتے تھے۔ کہیں بھی جاتے وہ میرے ساتھ رہتا۔ یہاں تک کہ اکٹ دوکٹ کھیلتے تو بھی اس کو اپنے گود میں ہی لیے ہوئے رہتے۔ ہر کھیل تماشے میں۔ آنکھ مچولی کھیلتے دیکھتا تو کھلکھلا کر ہنستا، گھر آنگن کے شور میں رہتا۔ میں اسے محلے کی ساری گلیوں، سہیلیوں کے گھروں میں گھمالاتی۔ صرف دودھ پلانے یا کھلانے کے لیے گھر لے جاتی۔ پھر دودھ پیتے ہی میری کمر پر سوار ہوجاتا بڑی خوشی خوشی۔ شاہد مرحوم کی یاد اور پاکستان کا یہ خوفناک سفر مجھے جیسے گھلائے جارہا تھا۔

میں اور امی صرف اکیلی سفر کررہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اپنے قافلے سے بچھڑ کر، اس ٹرین اور اسٹیشن کے بیچوں

بیچ پھنس گئی ہوں۔ منزل...... منزل کا تو جیسے کوئی پتہ ہی نہیں تھا۔ سفر جیسے بے منزل کے شروع کیا گیا ہو۔ پٹنہ اسٹیشن پر جس طرح کے لوگ نظر آتے تھے ویسے کوئی لوگ امرتسر اسٹیشن پر نہیں تھے۔ ہر چیز مختلف، زبان، انداز سب جدا۔ سوچتی جاتی کہ یا اللہ کب کراچی آئے گا؟ باجی کے چہرے پر کب نظر پڑے گی؟ نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ میری امی جو میری کیفیت سے پوری طرح واقف تھیں، مجھے راستے بھر بہلاتی رہیں۔

خدا خدا کر کے ہندوستان اور پاکستان کا بارڈر آیا۔ تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ چلو کم از کم اب پاکستان کی سرزمین پر قدم تو رکھا۔ اور اسی طرح کراچی شہر بھی پہنچ ہی جاؤں گی۔ اس بارڈر کا نام واگہہ تھا۔ جیسے ہی ہم سب لوگ پاسپورٹ اور ویزا لے کر آگے بڑھے تو فوراً ایک آفیسر بولے کہ یہاں سے آپ لوگ نہیں جا سکتے ہیں اس لیے کہ چند گھنٹے قبل یہ بارڈر بند ہو گیا ہے۔ اس وقت میں تو پریشان تھی ہی، لیکن اس بار امی ہم سے زیادہ پریشان لگ رہی تھیں۔ کچھ طالب علم بھی ہم لوگوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے امی کو یہ کہہ کر تسلی دی، ''گھبرائیں نہیں۔ اب لاہور سے ہو کر جانا ہوگا۔'' اب قافلہ لاہور کی طرف روانہ ہوا جہاں ٹرین سے ہی گئے اور پھر رات بھر لاہور اسٹیشن پر بیٹھنا پڑا۔ اس لیے کہ صبح میں کسٹم کروا کر پھر آگے بڑھنا تھا۔ لاہور اسٹیشن پر ساری رات امی کے بازو سے چپک کر گھبراتی، کبھی اونگھ جاتی اور کبھی بے خبر سو جاتی۔ کسی کے قدم کی آہٹ سے بھی جیسے دل دھڑک جاتا۔ ایک سہارا صرف ان لوگوں کا ہی تھا جو ہماری طرح ریلوے اسٹیشن کی خاص قسم کی بدبو اور قسم قسم کی بوگیوں کے چلنے کی آوازوں، شور شرابے کو برداشت کر کے بالکل بے سہارا اسٹیشن پر بیٹھے تھے۔

آخر کار صبح ہوئی اور پھر صبح میں پوری چیکنگ ہوئی۔ لوگوں کا بکس، پیٹی، ہاتھ کا سامان، ہولڈال، سب کچھ کھولا جا رہا تھا اور ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہم لوگوں کا سامان بھی کھلا۔ ایک ہنگامہ تھا۔

پھر سے ایک نیا سفر ہم دونوں ماں بیٹی نے شروع کیا۔ چیکنگ کے لیے آفیسر آئے اور ہم لوگوں کا بکس کھول کر نہ جانے کیا معائنہ کر رہے تھے، وہ تو خدا ہی جانے، اس اسٹیشن کا علاقہ تو ایسا تھا جیسے وہاں قیامت آگئی ہو۔ سب لوگوں کے بکس زمین پر کھلے پڑے تھے اور میرے سر کے اوپر سے نہ جانے کتنے بکس اور پیٹیاں گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب کوئی بکس ہم دونوں کے اوپر ہی آ کر گرے گا۔ کوئی کسی کا دھیان نہیں رکھ رہا تھا۔ چیخ و پکار کا سماں بندھا ہوا تھا۔ کسٹم کیا تھا، وہ جگہ محشر کا ایک میدان بنا ہوا تھا۔

خیر، کسی کسی طرح دونوں بکسوں کی چیکنگ ہوئی اور ہم لوگ خدا خدا کر کے کراچی کی ٹرین پر بیٹھ گئے۔ ویزا،

پاسپورٹ اور سامان کا ایسا ہنگامہ تھا، ایسی نفسانفسی کا عالم تھا کہ آج بھی جب خیال میں وہ سین آتا ہے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔

لاہور سے کراچی کے لیے ٹرین کھلی، لیکن وہ سفر بھی بہت لمبا تھا۔ راستے میں ایسے ایسے درخت ایسی ایسی جھاڑیاں دیکھیں کہ جن کے تصور سے ہی آج بھی کانپ جاتی ہوں۔ یوں تو مجھے درختوں کی ظاہری شکل وصورت پر غور کرنے کی بچپن سے عادت ہے لیکن پاکستان اور ہندوستان کے راستے میں جن درختوں کو میں نے دیکھا تھا، وہ بڑے ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ کسی کا رنگ سیاہ اور کسی کا کاہی رنگ کے پانی میں چوڑے چکلے درختوں کی شاخیں ڈوبی ڈوبی مجھے کتنی خوفناک لگی تھیں۔ اتنی خوفناک کہ کبھی کبھی میں اپنی آنکھوں کو بھینچ لیتی تھی۔ ڈر کر امی کی گود میں اپنا منہ چھپا لیتی تھی۔ ماں تو یوں بھی اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے چوبیس گھنٹے تیار رہتی ہے، لیکن اس سفر میں امی کا پورا سراپا میرے لیے کچھ ایسا تھا کہ جو مجھے ان خوفناک چیزوں کے چنگل سے بچاتا چلا جارہا تھا۔

جب سندھ کی سرزمین میں ٹرین داخل ہوئی تو مجھے سرخ مٹی پر کانٹے دار درختوں کا راج جما ہوا نظر آنے لگا۔ ان جھاڑیوں سے مجھے اتنا ڈر تو نہیں لگا، ہاں مگر ان علاقوں کی بے پناہ ویرانیوں کا احساس دل کو گھلائے جارہا تھا۔ کھنڈر کی شکل میں کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں کہیں کہیں نظر آجاتی تھیں۔ میرے دل کو بس یہی سکون تھا کہ گاڑی چل رہی ہے اور یہ چلتی ہوئی گاڑی کبھی نہ کبھی مجھے کراچی، میری باجی کے پاس ضرور ہی پہنچا دے گی۔ کتنی دیر میں کراچی پہنچی اور کب کراچی شہر آیا مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ کوئی اسٹیشن آگیا اور آہستہ آہستہ گاڑی نے وہاں رکنے کا ارادہ کرلیا۔ امی نے کہا، ''انجم اٹھو کراچی آگیا۔''

میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کیا۔ میری نگاہیں تو باجی کو تلاش کررہی تھیں۔ اتنی بھیڑ میں باجی کو تلاش کرنا آسان بھی نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ ٹرین چلتی رہی۔ لوگ اپنے اپنے رشتہ داروں، دوستوں کو کھوج رہے تھے، ہاتھ ہلا رہے تھے، آگے بڑھ کر گلے ملنا چاہ رہے تھے اور ہم ماں بیٹی ٹرین میں بیٹھ کر باجی اور نوشے بھائی کو کھوج رہے تھے۔ گاڑی رکی۔ بہت دیر کے بعد نوشے بھائی نظر آئے تو میں چیخی، ''امی، دیکھیے نوشے بھائی ہیں!''

گاڑی رکی۔ ہم لوگ اترے اور نوشے بھائی سے جاملے۔ مگر باجی نہیں آئی تھیں۔ باجی پتہ نہیں کیوں نہیں آئیں۔ پھر نوشے بھائی اور ہم لوگ گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

باجی ان دنوں کراچی میں فیڈرل بی ایریا میں رہتی تھیں۔ فلیٹ کے سامنے گاڑی رکی۔ ہم تینوں فلیٹ کے اندر داخل ہوئے۔ اندر جانا ہی تھا کہ باجی کہیں سے دوڑ کر آئیں اور امی سے اپنے مخصوص انداز میں لپٹ کر دیر تک روتی رہیں۔

آنسوؤں کا ایک ایسا بہاؤ تھا جو تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں بھی ان دونوں سے لپٹی دیر تک روتی رہی۔ ایک مدت کے بعد باجی کی صورت دیکھنے کو نصیب ہوئی تھی۔ مگر کن حالات میں، جبکہ باجی اتنی اداس تھیں۔ ایک ایسا اضطراب، ایک ایسی ناقابلِ برداشت ہلچل تھی، خاص کر میری چھوٹی سی جان پر، جو سفر کی اذیتوں کو سہہ کر ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی تھی جس کو میں آج بھی ایک تازہ واقعے کی طرح محسوس کرتی ہوں۔ میں دیر تک گم سم کھڑی، بغیر کچھ بولے ہوئے، اپنی ماں اور بہن کی تھکی ہوئی رونے کی آواز کو سنتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ سارے الفاظ منجمد ہو چکے ہیں اور تھوڑی دیر میں ہم سبھی کسی خموشی کے گہرے سمندر میں ڈوب جائیں گے۔ مجھے سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ کسی بھی جملے کی ادائیگی کس طرح کروں؟ کوئی بات کیسے شروع کروں؟ باجی سے کیا کہوں؟ جو ایسی نڈھال ہو رہی تھیں، پاش پاش ہو رہی تھیں کہ اچانک نوشے بھائی نے کوئی ایک ہنسنے کی بات کی تو ہر کوئی تھوڑا سا مسکرانے لگا۔

جسم بالکل تھک چکا تھا اور ذہن تو انھیں کالے کالے درختوں کے پریشان کن مناظر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا جو پانی میں اپنا بدنما عکس چھوڑتے ہوئے جنات کی طرح کھڑے تھے اور سندھ کی صف بستہ سوکھی جھاڑیاں، سر جھکائے ہوئے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کے چنگل سے نکلنے کے لیے وقت درکار تھا۔

ایک طویل، مہیب سناٹا سیاہ لباس میں میرے آگے رقص کر رہا تھا کہ نوشے بھائی کے اس جملے نے مجھے تھوڑا سا سہارا دیا اور سب کے ساتھ ساتھ میں بھی مسکرانے لگی۔

اب جب بھی میں لاہور سے کراچی تک کے اس سفر کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ شاید دنیا کے سب بچے اس قدر حساس نہیں ہوتے، جتنی کہ میں تھی۔

بچے اپنے اعصاب پر قابو تو نہیں رکھ سکتے، لیکن بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ میں ایک عجیب الخلقت بچہ تھی جسے اعصاب کی شکل میں قدرت سے ایک نازک ترین، جلد ٹوٹ جانے والا، کاغذی بل بوتا ملا تھا۔ قوتِ برداشت نام کو نہیں تھی۔ دکھ، تکلیف، بیماری، چوٹ کا درد تو خیر جسمانی ہوتا ہے اور بچوں کو رلا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے، لیکن ایک بھیانک منظر، ایک بدصورت لینڈ اسکیپ، ایک بھدا ناک نقشہ شاید تمام بچوں کے ذہن پر اتنا گراں نہیں گزرتا۔ میرے لیے تو بدصورتی، بدہیئتی، بدعلامتی جیسے ذاتی طور پر ہی محسوس کرنے والے عوامل تھے جو میری طبع نازک پر نہ صرف گراں گزرتے تھے بلکہ دیر تک مجھے پریشان کیے رکھتے تھے۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ میری شاعری، میری مصوری، حتیٰ کہ میری بات

چیت، بھی میری طبیعت کے اس حساس رخ کی غماز ہیں ع

کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

باجی کا فلیٹ اوپر یعنی second floor پر تھا۔ اس فلیٹ کا کونا کونا مجھے اب تک یاد ہے۔ ایک کچن، ایک بالکونی، ایک بھنڈار (Pantry) جہاں ایک سیمنٹ کا شیلف تھا جس پر امی اور باجی نے مل کر شخپورہ کے مالدہ آم سجائے تھے۔ ایک ڈرائنگ روم اور دو بیڈروم تھے۔ ایک بیڈروم میں باجی نے ستارے کی شکل کا ایک نائٹ بلب لگایا تھا جو مجھے بے حد پسند آیا تھا اور اسی چمکتے ہوئے بلب کو گھورتے گھورتے میں رات کو سو جاتی تھی۔

ہم لوگوں کے پہنچ جانے سے باجی خوش تھیں۔ ان کا غم مجھے تھوڑا تھوڑا ہلکا سا لگنے لگا۔ اتنا بڑا غم تو وہ ابھی بھی نہیں بھولی ہوں گی مگر ایک تبسم سے، ایک تکلم سے، محبت بھری آوازوں کو سن کر بجھے ہوئے دل نے تھوڑا سکون ضرور حاصل کر لیا تھا۔ آہستہ آہستہ باجی کی شکل وصورت ہم لوگوں کی موجودگی سے بدلنے لگی۔ تازہ وشاداب ہونے لگی۔

میں بھی آہستہ آہستہ اس شہر سے، اس جگہ سے مانوس سی ہونے لگی۔ زیادہ وقت میرا فلیٹ کے نیچے کے احاطہ میں گزرتا تھا۔ دو چار دوست بن گئی تھیں جن کے ساتھ میں رات دن کھیلتی رہتی تھی۔ صرف ایک دوست کا نام یاد ہے، موہانی، جو میرے ساتھ ہر وقت ہوتی تھیں۔ میں ایک دن اسی طرح نیچے کھیل رہی تھی کہ باجی کی چیخ چیخ کر رونے کی آواز آئی۔ میں دوڑ کر اوپر فوراً پہنچ گئی۔ باجی اپنی کوئی پرانی الماری ٹھیک کر رہی تھیں جس میں سے شاہد مرحوم کا کوئی کپڑا ان کو نظر آ گیا تھا۔ پرانا غم پھر سے تازہ ہو گیا۔ امی بھی کسی طرف سے باجی کے پاس دوڑ کر آ گئیں اور پھر دونوں دیر تک روتی رہیں۔ ہم بھی ایک کونے میں کھڑے کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔ نہ تو میری عمر باجی کو دلاسا دینے کی تھی اور نہ ہی میں اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ بس ایک خاموش بے بسی تھی جس نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ ویسے میری اور امی کی موجودگی میں ایسی دل گرفتہ سی باجی آہستہ آہستہ کافی سنبھلتی جا رہی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ امی ان کے پاس گئی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ باجی نارمل ہو رہی تھیں۔

ان ہی دنوں نوشے بھائی اور دوسرے رشتہ داروں نے ہم لوگوں کو کافی گھمایا پھرایا۔ کراچی شہر مجھے بے حد اچھا لگا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہاں سے جانے کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

کراچی میں باجی کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ کچھ تو ان کے رشتہ دار اور کچھ ہم لوگوں کے خاندان کے لوگ تھے جن

کے گھروں سے باجی کا آنا جانا تھا۔ باجی کی ایک سسرالی رشتہ دار تھیں جن کا نام مریم تھا۔ باجی سے ان کی بے حد دوستی تھی۔ وہاں ہم لوگ اکثر جاتے تھے۔ مجھے ان کا ایک سجا سجایا کمرہ اب بھی یاد ہے۔ وہ اپنے کمرے کو بے حد سجا کر رکھتی تھیں۔ جب بھی وہاں جاتے تھے تو جیسے وہ کمرہ تنہائی میں بھی ہم لوگوں سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوتی۔ اسی گھر میں ایک بڑا سا برآمدہ بھی تھا جو گھر سے جڑا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں سارے لوگ وہیں پر بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک رات باجی کے ساتھ ان کے گھر رہی تھی۔ ایک دن ان لوگوں میں سے ہی کسی نے زوردار آواز لگائی، ''ارے عاصمہ، یہ تمھاری چھوٹی بہن، جو ہندوستان سے آئی ہے اس کو کہو نا کہ ہندوستان کا National Anthem گا کر سنائے۔ پھر بھی میرے پیچھے پڑ جاتے۔ گانے بجانے کا شوق تو مجھے بچپن سے ہی ہے۔ میں تھوڑے سے نخرے کے بعد شروع ہو جاتی تھی...... جن گن مَن ادھینا یک جیا ہے بھارت بھاگ ویدھاتا......!! اپنے پورے جوش میں بالکل ایک سچے گانے والے کی طرح دل کے اندر سے ہمیشہ یہ راگ اور یہ بول میری زبان سے ادا ہوتے تھے۔ قومی ترانہ ختم ہوتے ہی ایک زوردار تالی بجتی، سبھی بے حد خوش ہوتے اور کہتے کہ ''ارے یہ تو بھئی عاصمہ، پوری ہندوستانی ہے۔''

ہم لوگ قریب چار ماہ کراچی میں رہے، اُدھر پٹنہ میں ابا، بھیا اور میری منجھلی بہن تھیں جن کو چھوڑ کر ہم لوگ کراچی آئے تھے۔ وہ بے قرار تھیں اور خط پر خط آتے رہے کہ اب کیا ارادہ ہے؟ کب آرہی ہیں؟ امی کی بہت سی اور بھی ذمہ داریاں تھیں جنھیں وہ چھوڑ کر باجی کی محبت میں کراچی آ گئی تھیں اور انھیں اب جلد از جلد واپس جانا تھا۔

باجی سے پھر جدا ہونے کی گھڑی آ گئی تھی۔ وہ ایک بے حد مشکل وقت تھا جو بہت جلد آنے والا تھا۔ باجی نے تو ہم لوگوں کے جانے کے ایک ہفتہ پہلے سے ہی رونا دھونا شروع کر دیا تھا اور آخر کار ایک دن ان کو پھر تن تنہا نوشے بھائی کے ساتھ کراچی میں چھوڑ کر ہم لوگ ہندوستان واپس آ گئے۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ جب ہم لوگ ہندوستان واپس گئے تو وہ راستہ اتنا دشوار نہیں لگا۔ شاید باجی بہل چکی تھیں۔ ان سے مل کر ایک سکون حاصل کر چکی تھیں۔ ان کو پھر کسی حد تک ویسا ہی تازہ اور بشاش چھوڑ کر آئی تھی۔ انھوں نے بھی زندگی کے کاموں میں ویسی ہی دلچسپیاں لینی شروع کر دی تھیں۔ اور واپسی میں مجھے اپنے بھائی بہنوں سے ملنے کی خوشی کی وجہ سے شاید وہ تکلیف دہ سفر اتنا تکلیف دہ نہیں لگ رہا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ صبح سے شام اور شام سے رات ہوتی رہی۔ باجی ہم لوگوں سے ہزاروں میل دور، اور ہم لوگ باجی سے دور! پھر وہی لمبی جدائی ان کے اور ہم لوگوں کے بیچ میں حائل رہی۔ وہی خط و کتابت کا سلسلہ، وہی بے بسی!

اتنا سارا وقت گزر گیا کہ میری شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ باجی کو ابا نے میری شادی کی تاریخ لکھ کر بھیج دی اور اپنی خواہش کا اظہار اس طرح کیا کہ تمھارا شادی میں آنا ضروری ہے۔ باجی نے پھر وہاں سے ویزا اور پاسپورٹ تیار کروایا اور ایک دن خدا خدا کر کے ہندوستان پہنچ گئیں۔ ان دنوں بارڈر بھی کھل گیا تھا اور پاکستان ہندوستان کے تعلقات بھی بس غنیمت ہی تھے۔ لیکن جنگ کی کیفیت نہیں تھی۔ باجی آگئیں اور پھر وہی خوشی کا موسم جو آیا تو سبھی لوگ ہشاش بشاش دکھائی دینے لگے۔

اس بار باجی سارے بچوں کے ساتھ آئی تھیں۔ ہم لوگ اب عدالت گنج کوارٹر سے منتقل ہو کر اپنے مکان میں، جو ابا نے سلطان گنج میں گنگا کے کنارے بنوایا تھا، چلے آئے تھے۔ وہ قیام باجی کا بے حد مختصر لگا۔ شادی بیاہ میں وقت تو یوں بھی ہوا کے دوش پر اڑتا رہا۔ وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اور چپکے چپکے ایک دن باجی کے رخصت ہونے کا دن بھی آ گیا۔ اور باجی پھر اپنے گھر واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ہی پھر ایک بار ہندوستان اور پاکستان کی جنگ شروع ہوگئی۔ کافی دنوں تک دونوں ملکوں کے تعلقات خراب رہے۔ آنا جانا بند۔ ٹرین، ہوائی جہاز، سب کچھ بند۔ کوئی راستہ نہیں! ایک دل کے جیسے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ باجی کراچی میں اور ہم لوگ پٹنہ میں۔

ہم لوگ ادھر تین چار سال کے بعد انگلینڈ آ گئے تھے، اُدھر باجی اب بچوں کی پڑھائی لکھائی کی وجہ سے نہیں آ سکیں۔ اپنی زندگی میں کچھ زیادہ مشغول ہوگئیں، مگر ہم لوگوں کو بھولتیں کیسے۔ خط آتے رہے۔ تحفے تحائف بھی کسی نہ کسی کے ہاتھ مجھے ضرور مل جاتے تھے۔ اب باجی سے ملے ہوئے قریب قریب بارہ سال ہو گئے تھے۔ باجی سے ملنے کی بے چینی اب پھر اپنے شباب پر تھی۔ ان کا بھیجا ہوا ہر تحفہ اس قدر خوبصورت ہوتا تھا کہ لوگ ان تحفوں کے بارے میں بنا پوچھے ہوئے نہیں رہ پاتے تھے۔ ہر کوئی بے ساختہ پوچھ لیتا تھا، ''ارے یہ تو بڑا خوبصورت ہے، کہاں سے آیا؟'' اور میں، میں تو بڑے ہی ناز و انداز سے جواب دیتی، ''یہ میری باجی نے پاکستان سے بھیجا ہے۔'' ان کے بھیجے ہوئے ہر تحفے کو بے حد سنبھال کر رکھتی۔

میں جب ہندوستان سے اپنی شادی کے بعد لندن گئی تو باجی اس وقت کراچی سے اسلام آباد چلی گئی تھیں۔ تو شے بھائی کا ٹرانسفر ہو گیا تھا اس لیے گھر بھر کو کراچی سے باضابطہ اٹھ کر جانا ہی تھا۔

لندن میں ایک روز ایئرپورٹ پر کسی کو چھوڑنے گئی تھی۔ دو پنجابی فیملی کے لوگ ایک جگہ ایئرپورٹ پر بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا، ''آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟'' ان لوگوں نے بتایا کہ وہ لندن سے براہ راست اسلام آباد جا رہے ہیں،

تو میں دل ہی دل میں بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ پھر میں نے ان لوگوں کو بتایا: ''میری باجی بھی اسلام آباد میں رہتی ہیں اور سچ پوچھیے تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ ابھی ابھی چلی چلوں۔'' اس وقت نہ تو میرے پاس باجی کا فون نمبر تھا اور نہ ہی پتہ۔ باجی سے ملے ہوئے تیرہ سال سے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ شاید میں کوشش کرتی تو اس وقت لندن سے اسلام آباد چلی بھی جاتی، مگر میں نے زندگی کا کچھ وقت ایسا بھی گزارا ہے، جب کہ میں بالکل نڈھال سی رہتی تھی۔

باجی سے ایک مدت سے بچھڑ کر لندن آ چکی تھی اور کسی حد تک لندن سے وہاں جانا کوئی اتنا مشکل بھی نہیں تھا مگر خود اپنے اندر کسی ارادے کو جنم دینے کی طاقت بھی کب رکھتی تھی؟ زندگی جیسے پانی کے بہاؤ کی طرح بہتی چلی جا رہی تھی اور میں اس کے ساتھ رواں دواں تھی۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مقصد آ کر خود بہ خود اپنا تعارف کروانے لگتا ہے۔ اپنے نغموں کو بکھیر کر اس جال میں مجھ کو پھانس لیتا ہے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ کو کھڑا کر دیتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ رقص کرنے لگتی ہوں۔ جھومنے لگتی ہوں اور اس راگنی میں مگن ہو جاتی ہوں۔

بس دل ہی دل میں باجی کو یاد کرتی رہی، روتی رہی۔ بچوں کی تصویریں دیکھتی رہی جو کہ اب بڑے ہو گئے تھے۔ بچے اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ بڑی لڑکی کی شادی بھی طے ہو چکی تھی۔ میرے دل کی بے چینی بس دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ شادی میں جانے کے لیے دل ہی دل میں، میں نے پورا ارادہ کر لیا تھا۔ باجی اپنی لڑکی کی شادی کرنے کے لیے اب کراچی آ گئی تھیں۔

ہم سب بھائی بہنیں، سب کے سب ہندوستان سے باہر تھے۔ کوئی انگلینڈ، کوئی امریکہ اور کوئی کناڈا میں تھے۔ سبھی نے یہ پکا ارادہ کر لیا تھا کہ شادی میں کراچی جانا ہے۔ سب لوگ پہلے ہندوستان گئے، پھر وہاں سے شادی کے لیے خرید و فروخت کر کے امی کو لے کر پاکستان کے سفر کی تیاری شروع ہو گئی۔ امی پٹنہ میں تن تنہا تھیں۔ ان کو وہاں سے ساتھ لے کر اب پٹنہ سے دلّی اور دلّی سے کراچی جانا تھا۔ اب کراچی کا سفر وہ سفر نہیں تھا جس سفر کو ہم نے اپنے بچپن میں امی کے ساتھ طے کیا تھا، یعنی وہی سفر ریل گاڑی والا رات اور دن بھر کا، ویزا اور پاسپورٹ کا ایک ہنگامہ، ایک غل۔ اس بار تو ہم سبھی لوگ ہوائی جہاز سے دلی گئے تھے۔ جیسے ہی ہوائی جہاز پر بیٹھے، فوراً ہی ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ ہم لوگ کراچی ایئر پورٹ پر دس منٹ میں اترنے والے ہیں۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کراچی اتنی جلدی کیسے آ گیا۔ پھر اپنے بچپن کے سفر کو میں یاد کرنے لگی۔ یا اللہ ایک وہ سفر تھا اور ایک یہ!

دلی سے میں نے بہت سے ہندوستانی گانوں اور غزلوں کے ریکارڈ خریدے تھے اور وہ سب ایک الگ بیگ میں میرے ساتھ تھے۔ میں نے قصداً اسے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا کہ ٹوٹ نہ جائے۔ ان ریکارڈوں کو ہاتھ میں لے کر میں امیگریشن کی لائن میں کھڑی تھی کہ میرا نمبر آئے۔ لائن بہت لمبی تھی اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج میں اس ایئرپورٹ سے باہر بھی نکل سکوں گی۔ خاص کر جب کہ میرا اور امی کا پاسپورٹ ہندوستانی تھا۔ تو وہ ایک اور وجہ بھی تھی کہ لائن میں آپ کو دیر تک کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ خیر، میں اور امی لائن میں بدستور کھڑی رہیں۔ میرے اور بھائی بہنوں کا پاسپورٹ امریکن اور کنیڈین تھا اس لیے وہ لوگ کب کے آگے نکل کر باہر تھے۔ ادھر امیگریشن افسر نے نہ جانے کس قسم کے فارم مجھے پکڑا دیے تھے۔ ایک میرے نام کا اور ایک امی کا۔ اور پھر یہ کہا کہ آپ دونوں ہندوستانی ہیں اس لیے ایک کنارے ہو کر کھڑی ہو جائیں۔ باقی سارے لوگوں کے جانے کے بعد اس نے ہم لوگوں کا پاسپورٹ لیا اور سارا فارم لیا۔ دیوار سے لگا ہوا ایک بینچ تھا جس پر میں نے امی کو بٹھا دیا تھا اور جلدی جلدی فارم بھرنے لگی۔ ان سارے لوازمات کے بعد اس نے خوب مسکرا کر ہم دونوں کے پاسپورٹ پر مہر لگائی اور کہا کہ اب جا سکتی ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

جیسے ہی ہم باہر نکلنے کے لیے آگے جا رہے تھے کہ ایک صاحبہ کسی ہوائی جہاز کے عملے کے ساتھ میری طرف آتی ہوئی دکھائی دیں۔ جب وہ بہت قریب آ گئیں تو میں نے ان کو پہچاننے کی کوشش کی...... وہ میری باجی تھیں۔...... یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ میری باجی ہیں۔ باجی کو دیکھتے ہی نہ جانے ان کی کتنی تصویریں میرے ذہن میں جاگ گئیں۔ ایئرپورٹ والی باجی کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کروڑوں سال گزر گئے ہیں اور اس کے بعد میں باجی کو دیکھ رہی ہوں۔ سر کے بالوں میں چاندی کی چمک آ گئی تھی۔ چہرہ تو وہی تھا، مگر ہم لوگوں کی جدائی کے غم کا ایک لرزتا ہوا عکس اور مہ و سال کی تھوڑی سی تھکن، اپنوں کے بغیر زندگی کے گزارے ہوئے دنوں کی تلخ حقیقت نہ جانے کتنے ان کہے افسانوں کے عنوان کی جھلک تھی۔ بارہ برسوں کی لمبی رفاقت میں ہم دونوں اپنے اپنے بسائے ہوئے گھروں میں جی رہے تھے۔

باجی کے بغیر، صرف باجی کی یادوں کو سینے سے لگا کر نہ جانے کتنی بہاریں آئیں، خزاں آئی، بارشیں ہوئیں، طوفان آئے، زمین برف سے ڈھک گئی، کتنی بار بیمار پڑی، میں نے کئی نظمیں لکھیں، غزلیں لکھیں، تصویریں بنائیں۔ یہ سب کچھ باجی کے بغیر ہوا۔ آج ایک مدت کے بعد میری آنکھیں باجی کے پُرنور چہرے کو دیکھ کر روشن ہوئی تھیں۔ وہی باجی، جنھوں نے جینے کی ہر ادا سکھائی تھی مجھے، میری منزلوں کی راہ دکھائی تھی۔ مجھے ایک ذہن دیا تھا۔ میری کتابوں کے

اوراق کے بیچ اپنا سر کھپایا تھا۔ میرے بالوں میں ربن باندھنے والی میری باجی، میرے بہت ہی قریب کھڑی تھیں۔ ارد گرد سارے لوگ بے چہرہ سے لگ رہے تھے۔ صرف باجی کا ہی ایک چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ ان کے قرب کے احساس سے میں مخمور تھی۔ ان کا چہرہ دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ہم دونوں کی جدائی کے سب لمحے ترس کھا کر ہم دونوں پر پھول برسا رہے تھے۔ میرے پاؤں تو جیسے اٹھ نہیں پا رہے تھے کہ میں جلدی سے اپنی باجی کے گلے مل لوں۔ وہ چند قدم کا راستہ اتنا دشوار تھا کہ میں ان ہوائی جہاز کے عملے کے سامنے ایک تماشہ سی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ لوگ جیسے ہم دونوں کے ملنے کا slow motion میں تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ ایسا لگا کہ دور سے یہ آواز آئی، ''انجم......!'' ایک ٹھنڈک سی میری رگ رگ میں اترنے لگی اور شدت احساس نے ایسا بیتاب کیا کہ سارے ریکارڈ غزلوں کے اور فلمی گانوں کے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر کراچی ایئرپورٹ کی پکی زمین پر گر گئے اور میں اپنی باجی سے، اس لطیف پیکر سے محبتوں کے اتھاہ ساگر سے، روح شعر و نغمہ سے، لتا جیسی آواز والی باجی کے گلے لگ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اس قدر روئی کہ اپنے سامان تک کا ہوش نہیں رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ارد گرد والے لوگوں نے ریکارڈ کا بیگ اٹھا لیا تھا مگر اس کا ایک ریکارڈ بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ باجی کے ساتھ ساتھ رہی۔ وہ مجھے دیکھتیں اور میں انھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں اور یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں تو بار بار یہی سوچتی رہی کہ کیا یہ واقعی میری باجی ہیں؟

(۵)

میں دہلی کے لیے ڈیٹرائٹ (Detroit, Michigan) ایئرپورٹ سے ہوائی جہاز پر سوار ہو رہی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی سوچتی جاتی تھی کہ کاش یہ بیس گھنٹوں کا سفر کم ہو جائے اور میں جلد از جلد دہلی پہنچ جاؤں۔ دہلی پہنچ کر وہاں سے اپنے شہر پٹنہ پہنچنے کی بے قراری تھی۔ درحقیقت اس بے قراری کا کوئی علاج بھی نہیں تھا اس لیے یہ بے قراری، بے قراری ہی رہی۔ ہوائی جہاز اُڑا اور منٹوں میں تھرتھراتے ہوئے بادلوں کو چیرتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ زمین کی ہر چیز بچوں کے کھلونوں کی طرح دکھائی دینے لگی۔ ہر کوئی اپنی اپنی سیٹ پر کروٹیں لے لے کر اور بھی مطمئن ہو گیا۔ میں نے بھی تو اسی امید کو لے کر سفر شروع کیا تھا کہ چلو کسی نہ کسی وقت جہاز پہنچ ہی جائے گا۔ صباح تاج (میرے شوہر) نے تو دو موٹے موٹے اخبار خرید لیے تھے اور اس کا کونا کونا کھنگال ڈالنے کا پورا ارادہ رکھتے تھے۔

میرے بیٹے کے پاس البتہ بے شمار سوالات تھے جن کا میں صبر و تحمل سے آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھی۔ صحیح معنوں میں میرا دل اندر سے یہی چاہ رہا تھا کہ اب میں اپنے بیٹے سے التجا کرنا شروع کر دوں کہ مزید سوالات نہ کرے۔ مگر وہ بھی کیا کرتا؟ مجبور تھا۔ میں اس کے ساتھ تاش اور چھوٹی چھوٹی بچوں کی گیمز کھیلنے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور اس طرح خود کو بھی بہلاتی رہی اور ساتھ ساتھ اسے بھی۔ اور پھر یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ کتابیں پڑھنا تو میرا ایک محبوب مشغلہ ہے، لیکن جو کتاب اس وقت میرے ہاتھ میں تھی، اس کے اوراق بھی میری انگلیوں کے درمیان پریشان و بے حال رہے۔ بس وہی بے قراری کا ایک عالم سا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی اور قصداً اپنی آنکھوں کو بند کر کے خود کو ان ہی گل رت منظروں میں گھسیٹتی چلی گئی۔ پھر رفتہ رفتہ میں خواب اور بیداری کے عالم میں ایک پرسکون شہر میں، رنگ و آہنگ سے بھرپور وادی میں، خوشبوؤں کی پازیب چھنچھناتی ہوئی، پھولوں کی کیاریوں سے سجی سجائی رہ گزر پر گامزن ہو گئی۔

میری نظروں کے سامنے آموں کے، ببولوں کے، کھجوروں کے پُر بہار سائے اور ان پر مچلتی ہوئی پھواریں رقص کرنے لگیں۔ رنگ و بو کا کبھی نہ ختم ہونے والا رقص مسلسل جیسے مجھے اپنے نرغے میں لے کر آگے بڑھنے لگا۔ معطر دھول کے غبار میں دھنک کے سارے رنگ مچلنے لگے۔ میں اس دلکش منظر میں کافی دیر تک رہی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب اناؤنس ہوا کہ جہاز استنبول ایئرپورٹ پر اُتر رہا ہے۔ وہاں سے دو گھنٹے کے بعد دوبارہ دہلی ایئرپورٹ کے لیے جہاز چلا۔ تھوڑی دیر تک کچھ مسافروں سے اِدھر اُدھر کی گپ شپ کی۔ اپنے بیٹے کو ہندوستان کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائیں۔ صباح سے دہلی پہنچنے کے بعد کے پروگرام کے بارے میں بات چیت کی۔ تھوڑی دیر تک انگریزی فلم دیکھ لی۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد خدا خدا کر کے جہاز دہلی ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔ دہلی میں صرف رات بھر کے لیے صباح کے بڑے بھیا کے یہاں ٹھہرے اور دوسرے دن پٹنہ کے لیے ہوائی جہاز سے روانہ ہو گئے۔

پٹنہ میں پروین ہم لوگوں کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ پروین میری بھانجی بھی ہے اور میرے شوہر کی بھتیجی بھی۔ اس کے شوہر اور بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ مدت کے بعد اس سے مل کر آنکھیں بھر آئیں۔ ایئرپورٹ اچھا خاصا ایک چھوٹا سا ہسپتال لگ رہا تھا اور اس بے پناہ مجمعے میں صرف پروین اور ان کے شوہر کا چہرہ چمک رہا تھا۔ خیر، اسی خستہ حال، ایئرپورٹ پر خدا کا شکر تھا کہ ہوائی جہاز لینڈ کر گیا تھا اور میں اپنے شہر پٹنہ کی سرزمین پر نہ جانے کیسے کیسے جذبوں کو سنبھالے کھڑی تھی۔ وہاں کی دھول بھری ہواؤں نے آ کر مجھے چھوا، اور بس وہیں کھڑے کھڑے مجھ سے اپنا ناتا جوڑ کر اٹھلانے لگی، میرے ارد گرد منڈلانے لگی۔ کچھ دیر ٹھہری اور اپنی بھینی بھینی خوشبو کی پرچھائیں جیسی چھوڑ گئی۔ اور میں قدم جمائے جیسے کسی ایک نقطے پر کھڑی ہو کر بہت دیر تک ساری چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ لیکن یہ سلسلہ دیرپا نہ ہو سکا اس لیے کہ وہاں کی چیخ پکار نے میرے ان احساسات اور یادوں کو، منتشر کر دیا۔ مجھے تو اس گھر کو دیکھنے کی جلدی تھی۔ اس گھر میں داخل ہونے کی تڑپ تھی۔ نہ جانے کتنی دلکش یادیں اس ایک گھر، اس پہلے مکان سے وابستہ تھیں۔ اس کو دیکھنے کی خواہش کو برسہا برس سے اپنے دل میں لیے پھرتی رہی اور یہی سوچتے سوچتے آج چالیس برس ہو گئے تھے اور میں نہیں جا سکی تھی۔ وہاں کے آنگن کی سیڑھیوں پر بیٹھوں گی، صحن کی کچی زمین کی وسعت پر، چنبیلی اور بیلے کے جھکتے ہوئے سایوں پر اپنی آنکھوں کے گہر نچھاور کروں گی۔ پھر دوسری طرف سے خیال آتا کہ خدا جانے اب اس گھر میں کون بابو رہ رہے ہیں، عدالت گنج پٹنہ کا وہ A/1 کوارٹر جہاں میں پیدا ہوئی تھی، جو کہ ابا کو ہائی کورٹ کی طرف سے ملا تھا، اب نہ جانے اس گھر میں کس طرح کے لوگ

ہیں۔ میں اگر اپنے گھر کے سامنے جا کر کھڑی بھی ہوگئی تو خدا جانے کوئی گھر میں ہوگا بھی کہ نہیں۔ شاید وہ گھر ہی بند پڑا ہو۔ وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ اسی طرح کے خیالات سے الجھتی رہی۔ سوچتی رہی اور بے قرار ہوتی رہی۔

گھر کا ایک ایک کونا یاد آتا گیا۔ خاص کر آنگن کا ایک کونا، جہاں گھنی چنبیلی غسل خانے کی خستہ پیلی دیوار پر پھیل کر دیوار کی دراڑوں کو اپنے سینے سے لگا کر لہلہاتی تھی اور اپنی بھینی بھینی خوشبوؤں سے آنگن اور اُسارے کی فضا کو معطر کرتی تھی۔

نہ جانے وہ چنبیلی اب وہاں ہے بھی کہ نہیں۔ کسی نے اس کی جڑ میں کبھی پانی بھی ڈالا کہ نہیں۔ اپنے تصور میں اس ٹھنڈی چھاؤں کا آنچل تھامے تھامے، دیر تک میں حسین خیالوں میں غلطاں، ادھر اُدھر بھٹکتی رہی۔ اسی گھنی چمبیلی کے درخت کے نیچے امی ہمیشہ ایک پلنگ بچھاتیں، وہیں پر بیٹھی بیٹھی گھر کا ہر چھوٹا بڑا کام کرتیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ہم لوگوں کا پڑھنا لکھنا، ہنسنا بولنا، سب کچھ وہیں پر ہوتا تھا۔ امی نے مجھے سوئیٹر بُننا بھی اسی آنگن کے کونے میں، اسی چنبیلی کے سائے میں، پلنگ پر بیٹھ کر سکھایا تھا۔ زندگی میں سب سے پہلا گڑیا کا ہاف سوئیٹر جس کا رنگ سبز تھا، اسی جگہ پر بُن کر ختم کیا تھا۔ ہاتھ پکڑ کر اس کے بعد امی نے سلائی پُرائی بھی سکھائی۔

اس گڑیا کے سوئیٹر کو پورا کرنے کے بعد سے جیسے ہر چیز کو سیکھنے اور جاننے کا خود بخود تجسس ہوا۔ اسی سوئیٹر کے بُننے کی ٹریننگ نے تجسس کے دائرے کو وسیع کر دیا اور پھر ہر چیز کے تجسس سے یہ راز بھی کھلتا چلا گیا۔ ہر چیز کو رنگ و آہنگ ملتا گیا۔ اسی سے شاید یہ بھی پتہ چلا کہ تلخی بھی آپ کے ذائقے کا حصہ بنتی ہے اور سچائی کا مقابلہ کرنے کی ہمت ملتی ہے۔

تجسس کے دائرے کی وسعت زمانی بھی ہے اور امکانی بھی۔ شاید اللہ نے مجھے یہ ودیعت کیا تھا کہ میں ہر چیز کو بہ غور دیکھ کر اس کی ماہیت سمجھنے کی کوشش کروں، اس کی گہرائی تک غوطہ لگاؤں اور یہ دیکھوں کہ کہاں کہاں کیچڑ ہے اور کہاں موتیوں کو اپنے بطن میں لیے ہوئے سیپیاں بکھری ہوئی ہیں۔ سوئیٹر بُننا ایک عمل ہے۔ گانٹھوں کی ترتیب، دھاگوں کا آپس میں ملن اور اس ملن کا نتیجہ...... ایک خوبصورت پیٹرن۔!

اس بات کو سمجھنے کے لیے میں کبھی کبھی بنے ہوئے حصے کو اودھیڑ دیتی۔ اس کا ماخذ، اس کی ماہیت، اس کی اصلیت، تاگوں کے رشتوں کا پراسرار چلن...... یہ سب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی تصویر کشی کے آرٹ میں اور شاعری میں اس تجسس کو برقرار رکھا ہے۔ ہر بار جیسے خود سے پوچھتی ہوں، یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟

میں اسی گھر کو اپنے تصور میں سجائے ہوئے سفر کرتی جا رہی تھی جس کے سامنے ایک بڑا سا تالاب تھا اور تالاب کی

دوسری طرف کے مکانات، اونچے نیچے درختوں سے، تاڑ اور کھجور کی اونچائی اور نیچائی اور پھر ان درختوں کا تالاب کے پانی میں تھرتھراتا ہوا عکس، جس سے ایسا سماں بندھ جاتا کہ گھنٹوں تک دیکھنے والا اس نظارے میں گم ہو کر رہ جائے۔ شام کی گلابی شفق اس طرح سے پانی کی لہر پر اپنا سونا بکھیرتی کہ ہر شخص اس فردوس صفت منظر میں ڈوب کر ایک سکتے کے عالم میں پہنچ جاتا۔

تالاب کے ایک کونے پر پیپل کا ایک درخت تھا اور اس درخت کے ٹھیک نیچے سیمنٹ کے بنے ہوئے ایک چبوترے پر ایک چھوٹا سا مندر تھا جہاں پجاری رات رات بھر پوجا پاٹ میں مگن رہتے۔ اکثر رات میں اس وقت نیند ٹوٹ جاتی جب پنڈت لوگ ''ہرے راما ہرے کرشنا'' کا جاپ لاؤڈ اسپیکر پر سر دھن دھن کر الاپتے۔ وہی الاپ سنتے سنتے ہم کبھی کبھی بے خبر سو بھی جاتے اور کبھی کبھی نیند دیر سے آتی۔ تالاب کی دوسری طرف ہائی کورٹ کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر ایک چھوٹا سا پُل تھا، جہاں سے روزانہ گزر کر میں اپنے Mt. Carmel School جاتی تھی۔ عجب کشش تھی پُل کے نیچے بہتے ہوئے پانی کی روانی میں کہ میں اسی پُل پر کھڑے کھڑے کبھی پانی میں چھوٹی چھوٹی کنکریوں کو پھینکتی اور پانی کے دائروں کو غور سے دیکھتی رہتی۔ وہی لہراتے ہوئے دائرے میری زیست کے لیے ایک حرف آشنائی سا بن کر اب ہمیشہ کے لیے میری گرفت میں ہیں۔ یہ وہ منظر ہے جو ہمیشہ کے لیے میرے وجود کا ایک ناگزیر حصہ بن کر رہ گیا ہے۔

ہندوستان کے صوبہ بہار میں پٹنہ شہر، جہاں کا وہ محلہ، یعنی عدالت گنج، میرے ہوش سنبھالنے اور دنیا کو سمجھنے کی آماجگاہ ہے۔ اس محلے کا وہ گھر، وہ کوارٹر، جو پورے محلے کا سب سے زیادہ سجا سجایا، پھولوں اور درختوں سے بھرا ہوا، خوشبوؤں سے اٹا ہوا تھا، وہ پیلا مکان ہم لوگوں کا تھا۔ وہیں میں پیدا ہوئی۔ اسی گھر میں مجھے ابتدائی تعلیم و تربیت ملی۔ اسی گھر میں انگریزی پھول Sweet Pea, Flex اور Carnation کی خوشبو چلتے ہوئے راہ گیروں کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اور لوگ رُک رُک کر دیر دیر تک پھولوں کو دیکھتے رہتے تھے۔ پھولوں کا شوق ہم سبھی بھائی بہنوں کو بچپن سے ہی ہے، مگر چھوٹے بھیا کو یہ شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ پھولوں کی کیاریوں کو سجانا، ان کے رنگوں کو اور پودوں کی اونچائی اور نیچائی کو صحیح ترتیب دینا، یہ سب ان ہی کے بس کی بات تھی۔ وہاں یادوں میں رنگ و بو کا ایک اتنا بڑا قافلہ ہے جو مجھ کو میرے احساسات کو، اکثر و بیشتر اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ اور میں ان خوشبوؤں سے سرشار اپنے ماضی کی مرمریں دیوار کا سہارا لیے چلتی جاتی ہوں، پر تھکتی نہیں ہوں۔ نہ ہی ان رشکِ فردوس کو سوچتے سوچتے تھکتی ہوں اور نہ ہی سوچ کی کڑی

اپنے آپ بھی ٹوٹتی ہے۔

تصور میں اس گھر کو پار کر کے، خاص کر باہر والے برآمدے کو جونہی ذہن میں لایا تو وہ وضع دار لوگ، محبت کے خریدار لوگ اور ان کی محبت وشفقت اور پیار کرنے کا انوکھا انداز، گفتگو کی شیرینی، سب کے سب مجھ پر ایک ٹھنڈی پھوار کی طرح برسنے لگے۔ اسی برآمدے میں ایک لکڑی کا گول ٹیبل رہتا تھا اور اس کے اردگرد کرسیاں بچھی رہتی تھیں۔ مباحثے، مذاکرے، گرمیٔ محفل، چائے اور شربت کے دور، ایسی رونق لگی رہتی تھی کہ راہگیر مڑکر اُدھر ضرور دیکھتے۔ منجھلے نانا (شاہ محمد عمیر) جو کانگریس پارٹی کے MLC تھے، ۱۹۵۶ء میں راجیہ سبھا کے ایم پی ہوئے تھے۔ Irrigation اور Development کے پارلیمانی سکریٹری تھے۔ گاندھی میدان کے سامنے والی کوٹھی میں تین برس رہے۔ ان کے آگے پیچھے کیدار ناتھ، جگجیون رام، شرما جی، مقبول صاحب، یحییٰ صاحب اور نہ جانے کتنے ''صاحب'' لگے رہتے تھے۔ منجھلے نانا اپنے مخصوص انداز میں سبھی سے مخاطب ہوتے۔ پچھلی باتوں کا تذکرہ اور حال کی گتھیوں کو سلجھاتے رہتے۔ ۱۹۴۲ء میں Quit India movement شروع ہوئی تو گاندھی جی کے ساتھ ساتھ نانا بھی جیل گئے۔ مجھے اب بھی یاد ہے، جب ایک دن عدالت گنج کے کوارٹر میں نانا نے اپنے جیل جانے کی تفصیلی کہانی ہم سبھوں کو سنائی تھی تو میں رونے لگی تھی۔ اس وقت مجھے وہ لفظ بہ لفظ یاد نہیں ہے، مگر ایک سین کچھ اس طرح یاد ہے کہ کس طرح ایک اندھیری کوٹھری میں رات کے وقت ان لوگوں کو چھپنا پڑا تھا اور کس طرح ایک کونے میں دبکے پڑے تھے کہ رات کے ہی وقت نالی سے سانپ نکل آیا تھا اور کس طرح جان بچا کر وہاں سے بھاگے تھے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اپنے بچپنے میں آفتاب ماموں کے ڈرائنگ روم میں نانا کی گاندھی کے ساتھ فوٹو دیکھی تھی۔ گاندھی جی نانا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چل رہے تھے۔ وہ تصویر لوگوں کی لاپرواہی کے سبب کیڑوں کا شکار ہوگئی۔

منجھلے نانا کا ایک طرح کا رعب، دبدبہ اور ساتھ میں ایک عجیب سی مسکراہٹ میرے اندر ہر لمحہ ایک روشنی سی بکھیرتی رہتی ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ سارے لوگ ایک سے نہیں ہوتے ہیں، مگر منجھلے نانا سب سے ہٹ کر تھے۔ ان سے بہت سے لوگ ڈرتے تھے مگر میں کبھی نہیں ڈری۔ میں انھیں ہمیشہ مسکرا کر دیکھتی اور وہ بھی مجھے مسکرا کر پکارتے۔ میں ان کو اپنے تصور میں لاتی ہوں تو جیسے میرے اندر ایک موسیقی اپنا سر اٹھانے لگتی ہے۔ میں خوشی سے جھومنے لگتی ہوں۔ میں فخر سے کہتی تھی، ''یہ میرے نانا ہیں۔'' اور سب لوگ یہ جانتے تھے کہ یہ انجم کے نانا ہیں۔

مجھے کبھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ منجھلے نانا سے ان کے حالی موالی کیوں اس قدر ڈرتے تھے۔ اتنے بڑے لوگوں کو یہ بھی نہیں سمجھ میں آتا تھا کہ نانا جو ایک آنکھ کو مچکا کر بگڑ رہے ہیں وہ نانا کی ایک اداکاری ہے، اور میں...... میں تو اتنی چھوٹی سی عمر میں نانا کے بولنے اور بگڑنے کے ہر انداز کو سمجھتی تھی۔ لیکن بڑوں بڑوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ایک روز نانا کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ نانا بالکل بے خبر ہو کر اپنے بستر پر سو رہے ہیں اور شرما جی جو رات اور دن نانا کے ساتھ رہتے تھے وہ کچھ خاموشی سے منہ چلا چلا کر کھا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا کھا رہے ہیں شرما جی، تو اپنی انگلی اٹھا کر بولے کہ خاموش رہو شاہ صاحب سو رہے ہیں اور بہت ہی آہستہ سے بولے کہ سبزی باغ والا موٹا بسکٹ کھا رہے ہیں۔ جب میں ان کے بالکل قریب گئی تو مجھے بے حد ہنسی آئی۔ دیکھا کہ شرما جی گلاس کے پانی میں اس موٹے بسکٹ کو ڈبا کر آرام سے کھا رہے ہیں۔ اس وقت تو میں سوال جواب نہیں کر سکی مگر بعد میں شرما جی سے پوچھا کہ آپ بسکٹ کو پانی میں بھگو کر کیوں کھا رہے تھے شرما جی؟ تو شرما جی بولے کہ بسکٹ کو پانی میں ڈبائے بغیر کھاتے تو کس قدر آواز ہوتی؟ اور پھر شاہ صاحب اٹھ جاتے تب کیا ہوتا؟

سنجھلے نانا (شاہ محمد حمید) کو پالیٹکس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ میری یاد کے مطابق شروع میں زیادہ تر جمشید پور میں رہے۔ جمشید پور میں ٹاٹا کمپنی کے منیجر تھے۔ پٹنہ برابر آتے تھے۔ عدالت گنج کے باہر والے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے ہم نے ہمیشہ ان کو دیکھا۔ منجھلے نانا اور چھوٹے نانا کی طرح سنجھلے نانا بھی ہم لوگوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کے آنے سے ہم لوگوں کے گھر میں بہار آ جاتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی تھی، ہر شخص کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی تھی، ایک ہنگامہ، ایک غل سا ہو جاتا۔ ہنسی مذاق، چھپے چھپے انداز میں مذاق کی باتیں۔ وہ وقت کیا تھا...... وہ وقت تو جیسے ریشم کی طرح پھسلتا ہوا بہت تیزی سے ہم سے دور ہو گیا۔

ایسی بات نہیں ہے کہ اب ایسے لوگوں کی کھپت نہیں رہی یا ضرورت نہیں رہی۔ ضرورت اب بہت بڑھ گئی۔ اس لیے لوگ بھوک پیاس سے بیتاب ہو کر ہر چیز سے پیاس بجھانے اور ہر چیز سے پیٹ بھرنے لگے۔ اب اچھے بُرے کی تمیز ہی نہیں رہی۔ روشنی اور اجالے کا فرق ہی نہیں رہا۔ چراغ اور لالٹین کے دور میں اتنا اجالا تھا کہ لوگ دور کی چیز ڈھونڈ نکالتے تھے، اچھائیاں چن لیتے تھے، برائیوں سے گزر جاتے تھے۔ اب یہ روشنی اچھے برے کی تمیز بھی بھول گئی۔

پہلے لہو دینے والوں کا نام تھا۔ پہلے علم والوں کا چرچا تھا، ان کے آگے ہجوم تھا، ان کے آگے میلہ تھا۔ سب اپنا اپنا چراغ لے کر آتے تھے اور روغن اور نور بھر کر لے جاتے تھے۔ اب بے علمیوں کا ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ تصویروں سے، تحریروں سے، پوسٹروں سے، ریڈیو سے، ٹی وی سے اب برائیوں کا پرچار ہوتا ہے، گناہوں کا اشتہار ہوتا ہے۔ اب لوگ خوبیوں کو تلاش کرنے کے لیے چوروں، ڈاکوؤں، لٹیروں کے آگے خیمے ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان ہی کا راگ الاپا جاتا ہے، پہلے لیڈر وہ تھے، حکمران وہ تھے جو گھر سے چھوٹے سے ڈبے میں اپنا کھانا لے کر پارلیمنٹ میں جاتے تھے اور وقفہ میں پارلیمنٹ کی گھاس پر ڈبہ کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔ چھوٹے نانا نے بتایا تھا کہ مولانا حسرت موہانی منسٹر رہے تھے تو بیٹا سفر کے لیے پیسے مانگتا تھا تو کہتے تھے پیسے کہاں ہیں، انتظار کرو، الاؤنس ملے گا تو تمھیں کچھ دے دوں گا۔ سید جعفر امام، پہلے لوگ منسٹر بنتے تھے تو ایک روپیہ nominal تنخواہ ماہانہ لیتے تھے۔ گھر نوکر چاکر کھانا پینا اپنی آمدنی سے۔ شاہ عزیر، شاہ زبیر کھدّر کا کرتہ پائجامہ موٹی ٹوپی پہنتے تھے۔ چپل پہنے پیدل چلتے تھے۔ اب کھادی کا بیش قیمت سے بیش قیمت کپڑا، اور پچیس موٹر کی قطار کے درمیان لوگ چلتے ہیں۔ اب دل کو یہی بھاتا ہے۔ کام سب کا اسی سے نکلتا ہے۔ کالے گورے اندھیرے اجالے کا امتیاز ہی نہیں۔ جو جھوٹوں کا بادشاہ ہے وہی ملک کا بادشاہ ہے۔ جھوٹ میں جتنی مہارت جس کو ہے حلقہ اس کا ہے، گھیرا اسی کا ہے، بول بالا اسی کا ہے، ہالہ اسی کا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا ہم نوالہ ہم پیالہ ہونا سب پسند کرتے ہیں۔ نوالہ چاہے حرام یا حلال کا ہو، اب کیا سوال ہے۔ جو سوالی سب سے بڑا اہم اور بڑا سوال تھا وہ سوال ہی درمیان سے نکل گیا۔ تو شاہ عمیر، شاہ زبیر اور شاہ زہیر کو ڈھونڈنے کون جائے۔ شاہ زبیر کی حویلی جس میں سری کرشن سنہا بہار کے پہلے باضابطہ وزیر اعلیٰ دن رات پڑے رہتے تھے اور شاہ زبیر سے سیاست سیکھتے تھے، اب سنسان پڑی ہے اور پٹنہ کے ایک ایک لٹیرے کے گھر کے آگے سون پور کا میلہ لگا رہتا ہے، جس کا جی چاہے ہاتھی خریدے، جس کا جی چاہے کتا خریدے کہ اب ہاتھی اور کتے کا ایک ہی مول ہو گیا ہے۔

تو میں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ پچھلا وقت تو جیسے ریشم کی طرح پھسل کر ہم سے، بہت دور ہو گیا۔ اور اس کی نرمی اور سرسراہٹ میں ہم کبھی بہتے رہے۔ اسے پکڑ نہیں پائے اور نہ ہی اس وقت یہ احساس ہوا تھا کہ ان لمحوں کو زور سے پکڑ لیں، یہ پھر واپس آنے والے نہیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عدالت گنج کی خوبصورتی وہاں کی دلکشی ان ہی لوگوں کی وجہ سے تھی۔ اس گھر میں ایک خاص نور برستا ہوا مجھے دکھائی دیتا تھا۔ وہ ان ہی شخصیتوں کی وجہ سے تھا۔ یہی تہذیب کے چاند ستارے تھے

جس کی چھاؤں تلے ہم سبھی بھائی بہن سانس لیتے تھے، گنگناتے تھے، سوتے تھے اور جاگتے تھے۔

منجھلے نانا کے تین لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ لڑکوں میں شاہ محمد اشتیاق، ڈاکٹر شاہ محمد امتیاز اور شاہ محمد نیاز اور لڑکی کا نام شاہینہ۔ سبھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے اپنے کاموں میں اور گھروں میں خوش باش ہیں۔ منجھلے نانا کے دوسرے لڑکے ڈاکٹر شاہ محمد امتیاز جو کہ ابھی بھی ساؤتھ ویلز (South Wales, U.K) میں مقیم ہیں، پیشے سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ رگوں میں سیاست دانوں کا خون رواں دواں ہے اس لیے نتیجے کے طور پر County Borough of Cynon Valley کے First outsider deputy ہوئے اور الیکشن کے ذریعہ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۹ء کے درمیان Mayor بھی بنائے گئے۔ لندن میں Buckingham Palace سے بہت ہی مؤدبانہ دعوت آئی اور Queen Elizabeth اور Prince of Wales کے ساتھ گفتگو اور ڈنر کیا۔ امتیاز ماموں کو Royality of Denmark سے بھی دعوت آئی اور جہاں 700th Anniversary کو وہاں کے Royal خاندان کے ساتھ Celebrate کیا۔ آج کل Wales County Council کے ممبر بھی ہیں اور لگاتار دس بار الیکشن جیتے اور سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیا۔ Wales کے University of Swansea اور University of Cardiff کے گورنر ہیں۔ امتیاز ماموں کے سیاسی نظریات، سماجی ہوش مندی، عصری آگہی، دردمندی اور خلوص سے دور دور کے لوگ واقف ہیں۔ انھوں نے زندگی میں ہمیشہ غور و فکر، ضبط و تحمل، مصلحت اور دور اندیشی کو روا رکھا ہے۔

چھوٹے نانا (شاہ محمد زبیر) کمیونسٹ پارٹی میں ایم ایل اے تھے۔ دونوں بھائی دو مختلف پارٹیوں میں رہ کر بھی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے، یعنی منجھلے نانا اور چھوٹے نانا۔ مسکرا مسکرا کر دونوں اپنی اپنی پارٹی کی تعریف کرتے اور آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ دونوں کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نظریں ملا کر آپس میں کبھی بھی بات نہیں کی۔ چھوٹے بھائی بڑے کا لحاظ کرتے اور بڑے بھی چھوٹے کا لحاظ کرتے۔ یہ کچھ عجیب طرح کا منظر میں نے اپنے بچپنے میں دیکھا، پھر کبھی مجھے ایسا منظر دیکھنے کو نہیں ملا۔ اگر ایسے سچے، سادے، خوبصورت اور محبت سے بھرے جذبات پھر سے آہستہ آہستہ اس سرزمین پر اُترنے لگے اور اپنی شبنمی ٹھنڈک سے لوگوں کو بھگونے لگے تو یہ دنیا پھر سے حسین ہو سکتی ہے۔

بڑے نانا (شاہ محمد زبیر) بھی کانگریس پارٹی کے Member of Council of State of

چھوٹے نانا کا خط، میری بڑی بہن کے نام

Viceroy of India کے ڈپٹی منسٹر تھے۔ بڑے نانا کو میں نے نہیں دیکھا۔ وہ میری پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ مگر ان کے بارے میں بے حد سنا تھا۔ ان کی پوری زندگی سیاست کی جدوجہد میں گزری۔ ان پر ایک کتاب (معمارِ قوم۔ شاہ محمد زبیر) بیتاب صدیقی فاضل شمسی (گولڈ میڈلسٹ) نے ۱۹۹۰ء میں لکھی تھی۔ اس کتاب کو اسکول میں پڑھایا جاتا ہے۔

بڑے نانا ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار، جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی والہانہ اور سرفروشانہ جذبات کے ساتھی، یعنی امی کے سگے ماموں نے خدمتِ خلق کو وسیلہ بنا کر اپنے حسنِ کردار اور حسنِ اخلاق سے پورے ارول (گیا ضلع) کے علاقے کو منور کر دیا تھا۔ مادرِ وطن کی خدمت کرنے کا ارادہ لے کر انگلستان سے جب واپس آئے تو اس عزم پر پوری ثابت قدمی سے مرتے دم تک قائم رہے۔ لندن سے بیرسٹری پاس کر کے وہ ۱۹۱۱ء میں واپس آئے اور پٹنہ میں پریکٹس شروع کر دی۔ مونگیر شہر میں مہاتما گاندھی ایک ہفتے کے دورے پر جب گئے تو بڑے نانا گاندھی جی کے ساتھ ساتھ رہے۔ اور بابائے قوم مہاتما گاندھی ایک ہفتے تک نانا کے مہمان رہے۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی، لالہ جیت رائے، مولانا آزاد، شوکت علی، بی اماں (والدہ محترمہ علی برادران) وغیرہ بڑے نانا کے گھر پر مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرے۔ بڑی نانی نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا۔ عورتوں کی اچھی خاصی تعداد بدیسی کپڑوں سے بائیکاٹ کی تحریک میں مونگیر میں ان کی سربراہی میں سرگرم تھی، اس میں بیگم حسن امام، بیگم سمیع اور بڑی نانی (صدیقہ خاتون) پیش پیش تھیں۔

۱۹۲۳ء میں تقریباً دو برس کے لیے جیل جانا پڑا۔ جب اس نظر بندی سے رہا ہوئے تو ان کی صحت آہستہ آہستہ خراب ہوتی گئی اور اسی کے بعد علیل ہو گئے۔ یہاں تک کہ حالت ایسی بگڑ گئی کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان ہی دنوں جواہر لال نہرو بھی بہت بیمار تھے، مگر اس خبر سے ان کو گہرا صدمہ پہنچا اور ان کی وفات پر انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

یہ بات بہت مشہور ہے کہ جب بڑے نانا اور موتی لال نہرو میں ملاقات ہوتی تو موتی لال نہرو ہمیشہ ان کو پہلے سلام کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا تو نانا نے نہرو جی سے کہا، ''کبھی تو ہمیں سلام کرنے کا موقع دیجیے، ہمیشہ آپ ہی سلام کرتے ہیں۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ آپ ہم سے بڑے ہیں اور سلام کرتے ہیں۔'' تو نہرو جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ''آپ شاہ صاحب ہیں، سید ہیں اس لیے ہمیں سلام کرنے دیجیے اور آپ اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھیے۔''

اس چھوٹے سے بظاہر غیر اہم واقعے سے جو بات مترشح ہوتی ہے وہ اگلی پشتوں کے ان لوگوں کے کردار کی عظمت

ہے۔ انکساری کے صحیح معنی ہیں جس سے ان کی عظمت کا سراغ ملتا ہے۔ اب نئی نسل میں یہ لوگ کہاں ملتے ہیں۔ اب تو ہر طرف آپا دھاپی ہے، افراتفری ہے، من وتو ہے، لوگوں کو دولت بٹورنے کی دھن ہے!

بڑے نانا (شاہ محمد زبیر) نے مادرِ وطن کی اس قدر خدمت کی ہے کہ ان کی کاوشوں کو نظر انداز کر کے اگر میں آگے بڑھوں تو ان کے حق میں انصاف نہیں ہوگا۔

ناگپور اجلاس میں قطعی اور آخری فیصلہ ہو جانے کے بعد ہی عدم تعاون کی عوامی تحریک ملک میں شروع ہوئی، لیکن یہاں بہار میں مولانا مظہرالحق، راجندر پرشاد، برج کشور پرشاد، شاہ زبیر اور شفیع داؤدی کی قیادت میں تحریک کی ہمت افزائی کے لیے خود گاندھی جی نے مولانا شوکت علی کو ساتھ لے کر دسمبر کے مہینے میں بہار کا دورہ کیا اور مونگیر میں بڑے نانا (شاہ محمد زبیر) کے گھر ٹھہرے۔ مونگیر میں اپنے قیام کے دوران گاندھی جی نے اس ضلع کے اندر بڑے نانا کے ساتھ کئی جلسوں سے بھی خطاب کیا۔

جب یہ سارے لوگ تقریباً ایک ہفتہ تک مونگیر میں رہے تو بڑے نانا اور مہاتما گاندھی میں اکثر ملاقات رہتی تھی۔ اس وقت بڑے نانا کی رہائش قلعہ کے اندر ایک نمبر کوٹھی میں تھی۔ شوکت علی اور بی اماں کا قیام بھی اسی کوٹھی میں رہا۔ علی برادران ابھی افق سیاست پر نمودار ہی ہوئے تھے۔ بی اماں کے تئیں یہ شعر ایک نعرہ بن کر ابھی نہیں گونجا تھا:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بی اماں نے اسی کوٹھی میں قیام فرما ہو کر عورتوں کے اجتماع سے خطاب کیا۔ ۱۹۲۵ء میں مہاتما گاندھی نے پورے ہندوستان کا دورہ شروع کیا۔ سولہویں بہار صوبائی سیاسی کانفرنس پورولیا میں ہوئی جس میں مہاتما گاندھی نے خاص طور پر شرکت فرمائی اور کانفرنس کی صدارت بڑے نانا نے فرمائی، اور مہاتما گاندھی کی یہ تقریر بیتاب صدیقی کی کتاب ''معمارِ قوم شاہ محمد زبیر'' میں درج ہے:

''میں سفر کرتا ہوں چونکہ عوام مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بھی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی سیدھی اور سادہ زبان میں ان سے باتیں کرتا ہوں اور وہ مجھ سے مطمئن رہتے ہیں اور میں بھی ان سے مطمئن رہتا ہوں۔ اور عوام کے ذہن میں میرے خیالات آہستہ آہستہ پیوست ہوتے رہتے ہیں۔''

پھر مہاتما گاندھی کا خیر مقدم کرتے ہوئے نانا کی یہ تقریر:

''اس سے پہلے کہ میں آگے کچھ اور کہوں، ایک بہت ہی خوش گوار فرض ادا کرنا چاہتا ہوں جو اس کانفرنس کے صدر ہونے کے ناطے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ مہاتما جی! میں ان ڈیلی گیٹوں کی طرف سے جو یہاں جمع ہیں اور ان لوگوں کی طرف سے جو یہاں جمع نہیں ہیں، آپ کا پر جوش خیر مقدم کرتا ہوں۔ جب سے آپ نے جیل سے رہائی پائی ہے، اس صوبہ کے لوگ بہت بے چینی سے اس وقت کا انتظار کرتے رہے ہیں کہ ایک بار پھر وہ آپ کو اپنے درمیان پائیں، وہ مبارک گھڑی آگئی ہے۔ صوبہ خصوصیت کے ساتھ خوش نصیب ہے کہ آپ اس کانفرنس میں موجود ہیں جہاں اس کے نمائندے سر جوڑ کر اپنے مستقبل کے کاموں پر سوچ بچار کر رہے ہیں۔ قومی تحریک یہاں بھی ان ہی حالات سے دوچار ہے جن کا سامنا دوسرے صوبوں کو ہے۔ ایک عام کمزوری ہر طرف دیکھی جا سکتی ہے۔ قوم پرستی کا ''کاز'' روبہ انحطاط ہے اور فرقہ پرستی سر اٹھانے لگی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد، آپ کا محبوب ترین کاز خطرہ میں ہے۔ صوبہ میں رائے عامہ پر اثر رکھنے والوں کے لیے یہ گھڑی محشر کی ہے۔ ایسے وقت میں آپ کو اپنے درمیان پا کر ہماری بہت ڈھارس بندھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ تنہا قوم کو بچا سکتے ہیں، آپ ہی ہیں جنھوں نے اب تک پامال ہونے والے ہندوستانی عوام میں بیداری کی جوت جگائی اور ایسی ہوش رُبا طاقت چٹائی جس کے سامنے بیوروکریسی ۱۹۲۱ء میں تھر تھر کانپنے لگی۔ آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ طاقت اپنا وجود کھو چکی ہے۔ اس بیداری کا استعمال دوسری جہتوں میں ہونے لگا تنہا آپ ہی سے یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایک بار پھر اس بیداری کے بہاؤ کو یک جہت کریں اور ایک بار پھر اس طاقت کو ظہور میں لائیں جو ہمارے قومی مطالبے کی پشت پر ہو اور جو اسے اٹل بنا سکے۔

فرقہ پرستی کا جو شعلہ پنجاب میں بھڑکا، وہ اب پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اس حسین رشتے کو ختم کر دینے کے درپے ہے جس کو آپ نے ہندوستان کے ہزاروں سپوتوں کی جان کی قیمت دے کر استوار کیا ہے۔ اس آگ کو پہلی فرصت میں بجھانا بہت ضروری ہے ورنہ کسی بھی قسم کی قومی سرگرمی ناممکنات میں سے ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ سے ہماری اپیل ہے کہ خود کو آپ ہندو مسلم مسئلہ حل کرنے میں لگا دیں اور ہمیں ان تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھیں جو بصورت دیگر سامنے آ کر رہیں گے۔''

ان ساری تقریروں اور طرح طرح کی کاوشوں کے بعد آخر میں جب بڑے نانا کا ایک خاتمۂ کلام میں نے پڑھا تو میرا سینہ بھی فخر سے اونچا ہو گیا۔ اس خاتمۂ کلام کی ایک ہلکی سی جھلک یہاں پر میں پیش کرنا چاہتی ہوں:

حضرات!

بہت ہوا، اور اب میں آپ کو مزید روکے رکھنا نہیں چاہتا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں بیٹھوں، ایک بار پھر اس عظیم خطرے کی یاد آپ کو دلانا چاہتا ہوں جو ہمیں دھڑکائے ہوئے ہے۔ کچھ عرصہ قبل پنجاب کے آسمانِ سیاست میں بادل کا محض ایک چھوٹا سا دھبہ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن آج پورے ملک کا سیاسی آسمان بادلوں سے ڈھک گیا ہے۔ ایک زبردست طوفان منڈلا رہا ہے اور فرقہ وارانہ منافرت اور بد خواہی کی لہریں ہمارے اردگرد ضربیں لگا رہی ہیں۔ یہ لہریں کانگریس کے اس عظیم بیڑے کو لے ڈوبنے کے درپے ہیں جو ایک مدت سے فاتحانہ پیش قدمی کرتی آ رہی ہیں۔ یہ ایک عظیم قومی المیہ ہوگا اگر ہم ان لہروں کو اجازت دیں کہ اس خوبصورت بیڑے کو نگل جائیں جس کی تعمیر ہندوستان، کے بہترین فرزندوں کی پیڑھی نے کی اور جس کو اس نسل کے ہزاروں بہترین پھولوں نے مصائب جھیل کر واجب التعظیم بنایا۔

ہم سبھی اس موقعے پر ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوں اور مردانہ وار اس طوفان کا مقابلہ کریں اور اس کو دبا دیں۔ اس سرزمین پر بسنے والے لاکھوں عوام اور آنے والی نسلوں کی خوشی کے لیے۔

آیئے! ہم اپنے ملک کو ہر وقتی چیز سے بالاتر رکھیں اور ایک متحدہ اور مستحکم کوشش ہندو مسلم تفرقہ کے دیو کو مار بھگانے کے لیے کریں۔ یہ دیو ہماری عزیز مادر وطن کے سینے پر بیٹھا ہے اور اس کی زندگی کا رس نچوڑ رہا ہے۔ اس کے بغیر ہماری نجات نہیں۔

اس کے بغیر ہم اس منزل کو نہیں پہنچ سکتے جس کا تعین ہم نے اگست کے مہینے میں ناگ پور نیشنل اسمبلی میں کیا۔ ساری مہذب دنیا کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ناگپور میں قوم غیر مسلح ہو گئی لیکن ایک آزاد ہندوستان کے مطمحِ نظر سے سرشار ہو کر اٹھی اور سوراج جیتنے اور بیوروکریسی کو چیلنج دینے کے لیے اپنے تہیے کا اعلان کیا۔ جنگ ہنوز اختتام کو نہیں پہنچائی گئی ہے اور ہمارے ہراول دستہ میں تفرقہ اور

پھوٹ پڑ گئی ہے۔ اس سے پہلے ہی کہ پھوٹ پڑے آزادی کی دیوی فتح کا ہار ہمارے گلوں میں ڈالے۔ یہ ایک بہت ہی شرمناک منظر ہے جو آج ہم ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں۔

کسی قوم کے لیے چیلنج دینا اور پھر اس کو بھول جانا اور روٹی کے ٹکڑوں اور چھیچھڑوں کے لیے جھگڑنا کھلم کھلا سفلہ پن ہے۔ یہ مہذب دنیا کی نگاہ میں ہم کو پھر گراتا ہے جبکہ مہذب دنیا ۱۹۲۱ء میں ہماری غیر متشدد جنگ کو بڑی حیرت اور واہ واہی کے ساتھ دیکھ چکی ہے۔

آیئے، ہم مادر وطن کے مقدس وجود کے آگے اپنی حقیر حاسدانہ باتوں کو بھول جائیں، ان ہی باتوں نے ہمارے درمیان تفرقہ ڈال رکھا ہے اور ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ آیئے، ہم اپنی منتشر طاقتوں کا ادراک کریں اور ایک بار پھر ابھی تک پورا نہ ہونے والے اس وچن کو پورا کرنے کی کوشش کریں جس کا اعلان قوم نے ناگپور میں کیا...... ہمارا عظیم رہ نما ابھی یہاں ہماری قیادت کے لیے موجود ہے۔ آیئے! ایک بار پھر ہم قطار میں لگ جائیں اور ان کی حوصلہ افزا قیادت میں آزادی کی منزل کی طرف مارچ کریں۔

خدا ہمیں شادمانی اور کامرانی سے نوازے اور ہماری راہ کے اندھیرے کو دور کرے! خدا اس مشعل کو روشن کرنے میں ہماری مدد کرے جو ہمارے قومی گناہوں کو جلا کر بھسم کر دینے والی ہے۔ خدا ہندوستان کو اس لائق بنائے کہ وہ دنیا کی قوموں کی تہذیب میں اپنا صحیح مقام پا سکے۔!!''

بڑے نانا (شاہ محمد زبیر) کا تعلق نہرو خاندان سے تاریخی رہا ہے اور وہی سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔

بڑے نانا کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ شاہ مشتاق احمد سب سے بڑے لڑکے تھے جو ہمیشہ کھدر کے کرتے پائجامے میں رہے۔ بہار وقف بورڈ کے چیئرمین رہ چکے تھے اور بہار اردو اکادمی کے سکریٹری بھی رہے اور ساری زندگی ادبی، لسانی اور قومی وملی تنظیموں کی سربراہی کرتے رہے ہیں۔

دوسرے لڑکے شاہ محمد آفتاب، بہار ویٹری کالج کے پرنسل رہے اور محکمہ مذکور کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اب ریٹائر ہو کر پٹنہ میں مقیم ہیں۔

تیسرے اور سب سے چھوٹے لڑکے شاہ محمد سلطان احمد ارول کے آبائی گھر کو آباد رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سب میرے ماموں ہیں اور میں بچپن سے ان لوگوں کے زیر سایہ پلی بڑھی۔ ان سبھوں کی باتوں، لہجوں اور پکاروں میں میرے ماضی، میرے بچپن کا جھلملاتا ہوا ایک عکس تیار ہوا اور اس عکس کو، اس روشنی کو آنکھ بند کر کے اپنے تصور میں لاتی ہوں تو ایک پوری دنیا آباد سی میری نظروں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ میرے تخیل کے پردے پر اتنی ساری حکایتیں، اتنی ساری کہانیاں، واقعات اور تصویریں بن بن کر ابھرنے لگتی ہیں کہ میری آج کی دنیا کے سارے مناظر میرے سامنے سے آہستہ آہستہ ہٹنے لگتے ہیں اور گم ہو جاتے ہیں۔

بڑے نانا کی تینوں لڑکیاں شادی کے بعد اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ پاکستان چلی گئیں اور وہیں ان لوگوں کا خاندان پلا بڑھا۔ جب میں کراچی جاتی تھی تو سبھوں سے ملاقات ہوتی تھی۔ عقیلہ خالہ، شکیلہ خالہ اور ذکیہ خالہ، یہ بڑے نانا کی تینوں لڑکیاں ہیں۔

مشتاق ماموں کے سب سے چھوٹے لڑکے، جو میرے ممیرے بھائی ہیں، شاہ محمد طارق ایم پی، بی ایس سی کرنے کے بعد صحافت میں چلے گئے اور وہ تاریخی تعلق جو نہرو خاندان سے تھا، طارق نے آگے بڑھایا ہے۔ کانگریس آئی یوتھ ونگ کل ہند تنظیم کے صدر رہے، آل انڈیا کانگریس کے سکریٹری بھی رہے اور بہار کانگریس کمیٹی کے صدر بھی رہے۔

گویا میرے ننہیال کا خاندان سیاسی، مجلسی، تنظیمی اور رفاہ عام کے کاموں میں پیش پیش رہا۔ کبھی اگر صوبہ بہار کی گذشتہ ایک صدی کی تاریخ لکھی گئی تو اس خاندان کے چشم و چراغ فرزندوں کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

یہ چاروں نانا سب کے سب امی کو اور ہم لوگوں کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ میں اسی جگہ پر بیٹھی ان سبھی کو اپنے تصور میں لے آئی۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں اور میں وہیں پر بیٹھی بیٹھی اپنی آنکھوں کو بند کر کے ان کے پکارنے کے انداز کو اندر جگانے لگی۔ میرے اندر کی دنیا وہیں پر بیٹھے بیٹھے جیسے آباد ہونے لگی۔

خاص طور پر منجھلے نانا (شاہ محمد عمیر) کہاں پر بیٹھتے تھے، کیسے بیٹھتے تھے، کیا کھاتے تھے، لوگوں سے کس طرح باتیں کرتے تھے، اس کا ایک منظر میری نظروں کے سامنے تھا۔ زیادہ تر لوگوں کو ان کا مذاق تو آخر آخر وقت تک سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ صرف ان کے مسکرا مسکرا کر بات کرنے کے انداز کو ہم لوگ ہی سمجھتے تھے۔ ان جیسے آفتاب صفت لوگ تو اب اس سرزمین پر رہے ہی نہیں۔ ان کی باتیں جدا ہوتی تھیں، محبت کرنے کا انداز جدا، پکارنے کا انداز مختلف، اور یہ آواز...... یہ

آواز تو کان میں اکثر گونجتی ہے کہ ارے کہاں گئی رے؟...... ارے کھانا جلدی سے لاؤ، دیر ہو جائے گی۔ اور کہیں جو تیری مائے (ماں) سوگئی تو بابا بڑی مشکل ہو جائے گی۔ برتن کی آواز سے اٹھ جائے گی تو تو جان...... پھر ہم کچھ نہ جانیں!'' یہ باتیں مسکرا مسکرا کر امی کے سامنے بولتے تھے اور امی ہنستی رہتی تھیں۔

میری منجھلی بہن کا گھریلو نام جھنا ہے جو کہ چھوٹی باجی نے رکھا تھا، مگر نانا ہمیشہ ان کو ''جھنوا'' پکارتے اور کہتے، ''ارے جھنوا، نا جانتی ہے رے، جس کے ہاتھ میں ڈوئی، اس کے ہاتھ میں سب کوئی! دیکھ، مہمان آویں تو گھبرا یا مت کر۔ دال میں تو تو بھر جی پانی ملا سکتی ہے۔ اب رہا چاول، تو تھوڑا وہی نا پکانا ہوگا رے!'' ان کی یہ سب باتیں لوگ سنتے جاتے اور ہنستے جاتے اور نانا کی نہ ختم ہونے والی باتیں چلتی رہتیں۔ دل کے بے پناہ سخی تھے۔ اگر کھانا کھا رہے ہیں اور گلی کا کوئی کتا ہانپتا ہوا گھر کے سامنے کسی طرف سے آگیا تو اپنے سامنے کا رکھا ہوا پورا کھانا اس کتے کے حوالے کر دیا۔ یہ تماشہ تو خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب پوچھا، ''ہائے نانا! آپ کیا کھائیں گے؟'' تو بولے، ''ارے آج بھوک نہیں ہے رے۔''

دروازے پر ایک فقیر نیم عریاں حالت میں کھڑا صدا لگا رہا تھا۔ نانا نے اس کی آواز سنی تو دوڑ کر گئے، اس کی یہ حالت دیکھ کر دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دروازے کا دبیز پردہ اتارا اور اس فقیر کے حوالے کر دیا۔ پھر ہم لوگوں کو کہا کہ جلدی سے کوئی دوسرا پردہ لا کر لگا دیں۔

منجھلے نانا ناشتہ بہت ہی اہتمام سے کرتے تھے۔ ان کے ناشتے کی ٹیبل پر ایک پلیٹ میں دس بارہ کھڑے انڈے ضرور ہوتے۔ جب بھی میں انڈا ابالنے کے لیے اپنے کچن میں کھڑی ہوتی ہوں تو نانا کی پلیٹ کے وہ ایک درجن انڈے آنکھوں کے نیچے لہرانے لگتے ہیں اور میں پھر بے ساختہ مسکرانے لگتی ہوں۔ اگر کبھی ان کو دو تین انڈے لا کر دیے تو نانا کہتے کہ ''ارے کیا لائی ہے رے چٹنی؟'' نہ تو کبھی کولیسٹرول کا ڈر، نہ ہی کوئی B.P ہوا۔ نوے (۹۰) سال کی عمر پائی۔ حج کرنے گئے۔ بشارتوں کے ثواب لے کر واپس آئے، اور پھر آتے ہی الفتوں کے پیامبر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم لوگوں کو چھوڑ کر اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ ساری دنیا سے پیار کرنے والے، محبتوں کے امین، خوشیوں کو سنوار کر بانٹنے والے، گھر اور باہر کی فضا کو جگمگانے والے، جن کے سامنے پوری کی پوری نسل جوان ہوئی اور جنہیں اپنی مسکراہٹ اور نظروں کی ٹھنڈک سے سینچ کر شاداب سے شاداب تر کیا، یہ وہی تھے جو خود نہ جانے کیسے یوں چپکے سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد

مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرے خزانے سے کسی نے میری دولت چرا لی۔ لیکن اپنے اس طرح فاتحانہ گزر جانے کے بعد انھوں نے میری یادوں میں ایک روشنی بھر دی اور وہ یاد نور بن کر میرے اندر پیوست ہوتی گئی۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لعین
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

ان کی شخصیت کی موسیقی میری نس نس میں آج تک بھری ہوئی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ان لمحوں کی لَے اور اس کا منظر، میری آنکھوں کے سامنے موجود رہتے ہیں اور مجھے زندہ رکھتے ہیں۔ اکثر رات میں کبھی نیند نہیں آتی، تو عدالت گنج کے برآمدے کی اس چمکتی روشنی میں ایک بڑے ٹھونگے میں رکھی ہوئی بہت ساری نارنجی رنگ کی جلیبی میری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں اور مجھے پھر سے بے ساختہ ہنسی آنے لگتی ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ مجھے رات کے وقت نیند نہیں آرہی تھی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر آنگن میں آئی۔ پھر کچھ کھسر پھسر کرنے کی آواز آئی، سوچا کہ آخر اتنی رات میں باہر والے برآمدے میں کون ہے۔ جا کر دیکھا کہ ایک ٹھونگے میں بہت سی گرم گرم جلیبی رکھی ہے اور میرے بڑے بھیا اور نانا بڑے ہی اطمینان سے باتیں کر کے کھا رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے، ''ارے تو کہاں سے آگئی رے؟'' نانا نے فوراً کہا، ''جلدی جلدی تو بھی کھالے اور جا کر سو جا...... ارے کھا لے جلدی جلدی...... کہیں مائے (ماں) اٹھی تو تیرا دماغ چاٹ جائے گی!'' ان کے پیار کرنے کا انداز بہت ہی نرالا تھا۔ اسی عدالت گنج کوارٹر میں امی کی محبت میں کئی سال ہم لوگوں کے ساتھ رہے اور اپنی محبت کو ہم لوگوں پر لٹاتے رہے۔

ان کا تعلق ہمیشہ سیاست سے رہا، اور چونکہ وہ کانگریس پارٹی کے ممبر تھے، اس لیے اسی کوارٹر میں بڑی بڑی دعوتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ راجندر پرشاد جو کہ First President of India تھے، ان کی دعوت نانا نے بہت سارے لوگوں کے ساتھ اسی گھر میں کی تھی، تو مجھے بھی تیار ہونے کو کہا تھا۔ سبز رنگ کی شلوار جمپر پہن کر میں نانا کے ساتھ dining chair پر ان کے بہت قریب بیٹھی تھی۔ کون کون میرے سامنے بیٹھا تھا، کون کیا بول رہا تھا، مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ اب صرف اتنا ہی یاد ہے کہ وہاں پر بے تحاشہ روشنی تھی اور اس روشنی میں ڈوبی ہوئی ہر چیز جگمگا رہی تھی۔ میرے اندر کا ماضی بھی جیسے اسی روشنی سے آج تک جگمگا رہا ہے۔ ایک جہانِ رنگ و بو مجھ میں زندہ ہے اور پھر اسی رنگ و بو اور روشنی

میں ایک ایسا آہنگ بھی ہے کہ ہر چیز متحرک ہے۔ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ بصری اور سمعی، دونوں حواس مجھے ماضی کی یادوں کے ساتھ جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ میں اپنے دھیان میں گم ذہن کی آنکھوں سے دیکھتی بھی ہوں اور ذہن کے کانوں سے سنتی بھی ہوں۔ اسی حالت کو منعکس کرتے ہوئے میری ایک غزل کے دو اشعار کچھ یوں ہیں:

ہوں نگاہ میں وہی رونقیں، وہی رسم و راہ میں لذتیں
کوئی ایسی تازہ ہوا چلے، مرا نقشِ ماضی ابھار دے
در و بام کو مرے چاہیے، وہی رقص و رنگ مصوری
کوئی ہے مسیحِ زمانہ تو میرے بیتے دن کو پکار دے

اَروَل، گیا ضلع (بہار) میں سون ندی کے ٹھیک کنارے بسی ہوئی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ہم لوگ کبھی کبھی وہاں بھی گرمی کی چھٹیوں میں کچھ دنوں کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہاں کا سب سے الگ تھلگ خوبصورت مکان، اور تینوں نانا کی شخصیات کی وجہ سے وہ مکان اپنا ایک خاص سماں بناتا ہے، جس کو بیان کرنا آسان نہیں ہے۔

وہ میری امی کا ننھیال تھا۔ ارول کے اسی مکان میں امّی پیدا ہوئیں۔ لوگوں کا ہر وقت کا آنا جانا، کھانا پینا، چائے شربت، ہر وقت ایک رونق، ایک ہنگامہ، ایک شور! وہ شان و شوکت، فراخ دلی، پیار محبت کا وہ بہاؤ تھا کہ جو بھی اس گھر میں جاتا، وہ تر و تازہ ہو کر واپس آتا۔

ارول کے مکان میں تین آنگن تھے۔ پہلے آنگن میں دو کمرے تھے اور دو طرف دیواریں۔ وہ آنگن مکان کے سامنے والے حصے میں تھا۔ دوسرے آنگن میں مقابلتاً تھوڑی زیادہ چہل پہل ہوتی تھی، جہاں کئی کمرے تھے، باورچی خانہ، بھنڈار، برآمدے، کنواں اور ساری ضرورت کی چیزیں۔ اس کے آنگن میں شور و غل، ہنگامہ، چہل پہل رہتی تھی۔ اسی آنگن میں ایک دروازہ مردان خانے کی طرف سے آتے ہوئے لوگوں کے لیے تھا۔ باہر سے نانا اور ماموں لوگ اسی دروازے سے گھر کے اندر داخل ہوتے تھے۔

تیسرے آنگن میں ایک بہت ہی بڑا نیم کا درخت تھا جس کے سائے کو میں آج تک نہیں بھلا سکی۔ اس سائے میں کچھ اس طرح کی بھیروی جھولتی تھی کہ ایک بار جب میں اس آنگن میں قدم رکھتی تو وہاں سے واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہتا

تھا۔ ہریالی کی خوشبو، سون ندی کی ریت کی خوشبو، نیم کوڑی کی خوشبو اور ساتھ ساتھ نیم کے جھومتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ...... یہ سب کچھ مل کر اس عمر میں بھی مجھے ایک سکون بخشتے تھے۔ بلکہ گھر کے بھی بچے اس آنگن میں جاتے تو وہاں سے آنے کا نام تک نہ لیتے۔ دن دن بھر نیم کوڑی چن کر کھاتے، کبھی نواڑ کی رسّی کے جھولے پر جھولا جھولتے، اور کبھی بے مقصد سون ندی کے کنارے بالو کے ٹیلوں کو دیکھتے دیکھتے گھنٹوں گزار دیتے۔ شور وغل، ہنگامہ، قہقہے، گنگنانا، گانا بجانا، اور ان سب کا ما یک ملا، جُلا شور، سب کچھ اسی نیم کے لطیف سائے تلے گونجتے تھے۔

اسی آنگن میں پیلے پیلے پھلوں والا ایک درخت بھی تھا جسے چٹیل کہا جاتا تھا۔ اس کا مزہ بے حد اچھا اور میٹھا ہوتا تھا۔ دن دن بھر نیم کوڑی اور چٹیل کھا کھا کر وقت گزارنا ہم لوگوں کا مرغوب مشغلہ تھا۔ اسی چٹیل کے درخت کے پاس گھر کی ایک دریچی کھلتی تھی۔ جس پر بیٹھے رہنا بھی ایک دوسرا مشغلہ تھا۔

☆☆☆

(دائیں سے) منجھلے نانا (سید شاہ محمد حمید) چھوٹے نانا (سید شاہ محمد ظہیر)

منجھلے نانا (سید شاہ محمد حمید)

(۶)

اسی عدالت گنج کوارٹر کے سامنے والے گھر میں ایک بنگالی فیملی بھی رہتی تھی۔ ان کا نام جگر بندھو تھا۔ ہم سب بھائی بہن جگر بندھو چچا کہتے تھے۔ وہ بھی ہائی کورٹ میں ابا کے ساتھ کام کرتے تھے۔ میں جب اس محلے کو تصور میں لاتی ہوں، تو وہ جگہ اپنی دانست میں ایک چھوٹی سی جنت بن کر میری نظروں کے سامنے لہرانے لگتی ہے۔ جگر بندھو چچا کی لڑکی کھوکھو اور نو اسی جولی میری سہیلیاں تھیں۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی ہمیشہ بنگلہ بولنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ ان ہی آوازوں کو، ان ہی صداؤں کو اپنے اندر جگاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن سے ہی اس زبان سے کچھ ایسی انسیت ہے کہ آج تک اس میٹھی زبان کو سنتے ہی گوشِ سماعت میں جھرنوں کا سا ترنگ ابھرنے لگتا ہے۔

کھوکھو میری ہم عمر تھی۔ اس کی بہنوں کا نام آرتی، بھارتی اور انجلی تھا۔ انجلی دیدی میری بڑی باجی کی دوست تھیں۔ آرتی دی اور بھارتی دی میری منجھلی بہن کی دوست تھیں۔ ہر وقت کا آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سب ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ میری بہنوں کا اور ان لوگوں کا آپس میں کھسر پھسر کرنا اور کھلکھلانا میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میرے کانوں میں ان لوگوں کی آوازیں کسی بجتے ہوئے ساز کی طرح مقید ہیں۔ انجلی دی کا اپنے لمبے لمبے بالوں کے پھندوں میں انگلیوں کو لہراتے ہوئے کہنا "اوری بابا"، "شوتی"، "تو می کی رے" کا وہ حسین اندازِ گفتگو کسی موجِ صبا کی طرح میرے گلشنِ دل میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ اس محلے میں ان سبھی کی یاد میرے دل میں ٹھیک اسی طرح ہے جیسے کسی چمن میں اُڑتی ہوئی رنگ برنگی تتلیاں ہوتی ہیں، جن کا کام صرف فضا میں حسن بکھیرنا ہوتا ہے۔

انجلی دی کی شادی تو مجھے ایسے یاد ہے جیسے اس کا ہر منظر میں نے ابھی دو چار ماہ قبل ہی دیکھا ہو۔ ان کا چہرہ بے حد

پُرکشش تھا،اس پر سے جب ان کو دلہن بنایا گیا تھا تو وہ بس ایک روشنی کا ٹکڑا لگ رہی تھیں۔ جیسے سچ مچ کا چاندز میں پر اُتر آیا ہو۔ ماتھے پر چونا اور چھوٹی چھوٹی سونے کی دھاری سجائی گئی تھی۔ بال میں بیلے اور چنبیلی کے گجرے، آنکھوں میں جیسے بہار سا نشہ، ہونٹوں پر کھلتے ہوئے گلاب، نظریں شرم سے جھکی ہوئی، جو خود اپنی جگہ پر حسن کا ایک لطیف سایہ بن کر ان کے رخسار پر چھایا ہوا سا تھا۔ سچ پوچھیے تو وہ جھکتی آنکھیں، چمکتے ہوئے ایک انمول زیور سے کم نہیں تھیں۔ شوخ، گلابی، جھلکتی ہوئی بنارسی ساری، ویسا ہی بلاؤز اور سر پر ٹیشو کا مہین بنارسی کا گلابی دوپٹہ اوڑھایا گیا۔ پھر سونے کے وہ سارے زیور جو کہ ان کے حسن کو اور بھی تابناک بنا رہے تھے، پہنائے گئے۔ وہ تو بس ایک نور بن گئی تھی اور اس نور سے جیسے ارد گرد بے پناہ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کتنے سارے خوابوں کو اپنے آنچل میں سمیٹے بیٹھی ہوئی انجلی دی اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ میری نظریں ان کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ میں نے خدا جانے کس طرح ان کے کمرے کے کسی کونے میں جگہ لے لی تھی اور وہیں سے بیٹھی بیٹھی انجلی دی کو گھور رہی تھی۔ میری نظروں کے سامنے ان کی سکھیاں انھیں slow motion میں سجا رہی تھیں۔ اس جلوۂ حسن سے اور شادی کے جوڑے کی خوشبو سے مہکتا ہوا پورے کا پورا ماحول اس قدر دل نشیں اور دل فریب ہو گیا تھا کہ میں نے وہیں پر ٹھہر جانے کا پورا ارادہ کر لیا۔ مجھے دیکھ دیکھ کر وہ بھی بدستور مسکرائے جا رہی تھیں۔ اور میں اپنی پُر اشتیاق نظروں سے ان کو گھورے چلی جا رہی تھی۔ درحقیقت ان کی نظریں مسکرا کر مجھ سے گویا پوچھ رہی تھیں کہ: ''کمرے سے تو مجھے سجاتے وقت سب کو نکال دیا گیا، مگر یہ تو کیسے کونے میں چھپ کر رہ گئی رے انجم؟''

ان پر یہ گلابی ساری، گلابی ٹیشو کا بنارسی دوپٹہ، سارے زیور گجرے اور سب سے زیادہ ان کی جھکی جھکی نظروں کا حُسن بے پناہ بھا رہا تھا۔ میں نے اس وقت تک کسی بھی کیمرہ مین کو نہیں دیکھا تھا۔ اتنے بڑے موقعے پر ان کی کوئی بھی فوٹو نہیں لی گئی تھی۔ لیکن میری نظروں نے اس ماحول کی چمک دمک کو اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے جو کسی کیمرے سے زیادہ کام کر گئی، جس نے رنگین لمحوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے capture کر لیا ہو۔ وہ یادیں کیا ہیں، بس ایک گوشۂ گلزار کی طرح ہیں جو میرے سامنے رقص کرتے ہوئے سارے موسموں کو سبز رکھتی ہیں۔ سبزہ زاروں میں بے شمار پھولوں کی شکل میں رنگوں کو بکھیرتی ہیں اور پھر...... اسی کے ساتھ ساتھ خوشبوؤں کا ایک سیلاب امنڈ آتا ہے۔

انجلی دی پوری طرح سے دلہن بن کر تیار ہو گئیں۔ وہ حسن، وہ بناؤ سنگار اور ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے لوچ نے مل جل کر ایک دھوم مچا دی تھی۔ ان کے ارد گرد پھولوں کی مالاؤں کا ایک جال تھا جن میں انتظار یار کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

ہر شخص دم بخود ہو کر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جگر بندھو چچا اور ان کے بڑے بھائی سبول دا نے تخت پر بیٹھی ہوئی انجلی دی، یعنی اس سمٹے سے پیکر کو اٹھا کر آنگن میں سجے سجائے منڈپ کے نیچے ٹھیک دولہا کے پاس لا کر بٹھا دیا۔ ساری رسمیں ہوئیں۔ بیچ منڈپ کے نیچے آگ جلائی گئی۔ پنڈت جی سنسکرت میں کیا کچھ نہیں بولتے رہے۔ سات پھیرے دولہا کے پیچھے پیچھے چل کر لیے گئے، اور میں آنگن کے اسی ایک کونے میں کھڑی کھڑی یہ سب کچھ جذب کرتی رہی، دیکھتی رہی۔ انجلی دی کی نشے والی بولتی آنکھیں کبھی کبھی میری نظروں سے ٹکرا جاتیں، جن کا لمس بہار جیسا تھا۔ ایک غیبی سرور میں ڈوبی ڈوبی سی انجلی دی، سرتاپا انتظار بنی ہوئی، سمٹی سمٹائی بیٹھی تھیں۔ میں ان کے چہرے پر کے تھرتھراتے ہوئے مکٹ کو لرزتے ہوئے ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے اور رُک رُک کے قدموں سے چلتے ہوئے دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر میں گھر آ گئی۔ انجلی دی جب رخصت ہونے لگیں تو یک بیک ایک شور ہوا۔ میں اپنے گھر کے باہر کے برآمدے سے کھڑی کھڑی رخصتی دیکھتی رہی۔ اپنوں سے بچھڑنے سے پہلے انجلی دی، جگر بندھو چچا کی گردن میں اپنی بانہیں ڈال کر زور زور سے رونے لگیں اور ادھر میں اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑی کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ مگر دولہے کے پیچھے پیچھے سنبھل سنبھل کر کپکپاتے قدموں کو آگے بڑھاتے ہوئے بوجھل دل کے ساتھ انجلی دی رخصت ہو گئیں۔ لوگ رشتہ دار اور دوست سب کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

ایسا لگتا ہے کہ اسٹیج پر کوئی سین آیا تھا اور اس اسٹیج پر ڈھیر ساری روشنی پڑی اور اس روشنی میں ان سارے واقعات کو میں نے اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر لیا۔ یعنی خود بخود محفوظ ہو گئے اور پھر اس کے آگے...... یہ لگتا ہے کہ جیسے ایک خلا سا ہے اور کچھ یاد نہیں ہے۔ پھر ایک دن کا وہ واقعہ یاد ہے جب انجلی دی کے بابا ایکا ایک بیمار پڑ گئے، سینے میں درد ہوا، منہ سے بجھی ہوئی آواز نکلی کہ جلدی سے اسلم (میرے چھوٹے بھیا) کو بلاؤ۔ لوگوں کے پہنچتے پہنچتے جگر بندھو چچا روح بن کر نہ جانے کن رفعتوں میں پرواز بھی کر گئے۔ اسلم جا کر بھی کیا کرتے؟ اسلم تو گئے مگر بے بسی سے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ منٹوں میں بس دم نکل گیا۔ انجلی کو خبر دی گئی۔ صبح صبح کلکتے یعنی اپنی سسرال سے آ گئیں۔ میں اپنے باہر کے برآمدے میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ رکشے سے اترتے ہی انجلی دی بے ساختہ کسی سے لپٹ گئیں۔ پھر دوڑتی ہوئی اپنے گھر کے اندر چلی گئیں۔

ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد جگر بندھو چچا کے لڑکے سبول دا (سبول بھائی) پورے خاندان کو لے کر کلکتہ چلے گئے۔ باپ کے مرنے کے بعد، اس دولتِ نایاب کے چھن جانے کے بعد نہ جانے کون سی مجبوری رہی ہو گی کہ نقل مکانی کرنی

پڑی۔ شہر ہی چھوڑنا پڑا۔ جس شہر سے اتنا پیار تھا، ایک مدت سے جہاں بسے بسائے تھے، اسے خیر باد کہنا پڑا۔ ہائی کورٹ کی نوکری کرنے والا چلا گیا تو اس کا کوارٹر بھی چلا گیا۔ کہیں نہ کہیں تو جانا ہی تھا، سو کلکتہ چلے گئے۔ شاید وہاں کوئی قریبی رشتہ دار ہوں، کوئی آبائی گھر ہو۔ یہ سب میں نہیں جانتی۔ بس وہ چلے گئے اور کہاں گئے، کس محلّے میں گئے، کس گلی میں بسے، کسی کو خبر نہیں۔ میں اپنے برآمدے سے کھڑی کھڑی یہ دیکھتی رہی کہ ایک بہت بڑا سا ٹرک آیا اور اس میں پلنگ، چوکی، کرسی، بکس، ہولڈال، اور نہ جانے کیا کچھ رکھا گیا اور سبول دا اپنے خاندان کو لے کر ہم لوگوں کی دنیا سے چلے گئے۔ کھوکھو اور جولی مجھ سے بچھڑ گئیں اور بس ایک یاد بن کر میرے دل کی دنیا میں بس گئی۔ رکشے پر چڑھتے وقت وہ مجھے بے بسی سے دیکھتی رہی اور میں خاموش اپنے برآمدے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ دونوں ہم سے بہت دور چلی گئیں مگر آج بھی ان کی کھنکتی ہوئی ہنسی کا اجالا میرے دل میں آباد ہے۔ آج بھی میرے شعروں میں ان کا حسن خیال بسا ہوا ہے۔ آج بھی میری مصوری میں ان کی شوخیِ دل کا پرتو دھنک کے ساتوں رنگ بکھیرتے رہتے ہیں۔ کینوس پر رنگ برنگے پھول ان ہی کے پیار کی خوشبو کا لباس پہنے چمکتے ہیں۔ ان ہی کے نغموں کی لے کو میری انگلیاں ستار پر ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ ایک مدت تک میری بے رنگ خلوت میں کھوکھو اور جولی کی یہ آواز کہ...... انجم چلو کھیلیں! یا صرف مجھے پکارنے کی آواز...... انجم...... گونجتی رہی۔ فضا میں ایک سناٹا سا جما رہا۔ صبح کی دھوپ میرے لیے پھیکی ہوگئی۔ رات بھی آئی، مگر کہکشاں نے تاروں کا کوئی جال نہیں بچھایا۔ وقت بہ ذات خود ایک بہترا مرہم ہے۔ بھول تو کبھی نہیں پائی، ہاں ان لوگوں کی جدائی کا دکھ دھیرے دھیرے کم ہوتا گیا۔ کوئی دوسرے بابو اس کوارٹر میں آگئے مگر ان کے جیسا وہاں کوئی نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ شاعر کے تخیل میں کچھ اس کا اپنا ہوتا ہے، کچھ پرایا۔ کچھ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے، کچھ تخیل کی اپنی افسانوی وارداتوں سے شامل ہو جاتا ہے۔ پڑوس کے کوارٹر کی بنگالی فیملی، اس کے افراد، خصوصی طور پر انجلی دی میرے جانے پہچانے بھی ہیں جن کے ساتھ مل جل کر میں رہی ہوں اور وہ تخلیقی ہیولے بھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے ذہن نے myth کی طرح گھڑے ہیں اور ان دونوں کا امتزاج ہی شاید وہ داستان ہے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک پورا سماں میرے آگے اُترا تھا اور ابھی بھی میرے دل کی ڈیوڑھی پر آ کر اکثر مجھے وہی پرانے منظر، ایک ساز و آہنگ لیے مجھے سنگیت سناتے ہیں اور مجھے ہر پل جگاتے رہتے ہیں جو ریشم جیسے جھالر کے پیچھے ایک اسٹیج پر ڈھیر ساری روشنیوں پر رقص کر کے بہ ظاہر تو کھو گئے مگر میرے واسطے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں۔ مجھے اکثر ان لوگوں کے لیے دکھ ہوتا ہے جن کے ماضی بے

رونق ہوتے ہیں، ان سے کبھی کوئی خوشبو نہیں آتی ہے اور وہ بیتی ہوئی زندگی سے کتراتے ہیں۔ انھیں یاد نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنی پچھلی گزاری ہوئی زندگی اور تھوڑی سی تخلیقی قوت کی اس کرامات کا تجزیہ ان اشعار میں کیا ہے:

ہیں خیالوں کے دھندلکوں میں نگینے سے جڑے
ساز میں جیسے چھپے رہتے ہیں سارے نغمے
چھن کے ہاروں کے چمن زار سے آتی ہے کرن
اوراحساس کی پیشانی پہ پڑتی ہے شکن
دونوں نے مل کے بنائی ہے میری کشتی فن
ڈھونڈنے میں جو کسی موج کے رہتی ہے مگن
یہ تلاش اب مجھے کیا جانے کہاں لے جائے
ڈوب ہی جائے کہ منزل پہ مجھے پہنچائے
مجھ کو پرواہ نہیں ہے کہ یہ میرے افکار
مجھ کو بے چین ہی رکھیں گے کہ بخشیں گے قرار
ایک خوشبو ہے جو ہر دم مجھے بہلاتی ہے
جو کسی دُور کی بستی سے چلی آتی ہے
تارے چنتی ہوں خیالوں کے انہیں راتوں سے
ہاں اسی اپنے قلم اور انہیں ہاتھوں سے
بَن کو گلزار بنانے کا بھروسہ ہے مجھے
سنگ سے پھول اگانے کی تمنا ہے مجھے

زندگی میں ایسے لعل و گہر ملتے ہیں مگر پھر اچانک ایسے بکھر جاتے ہیں کہ بس صرف ان کی چمک دل میں محفوظ رہ جاتی ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ میرے دل کی چمک، میری قوتِ تخلیق کو بے پناہ سہارا دیتی ہے۔ نغمہ سرا ہوتی ہیں، پھولوں میں رنگ بکھیرتی ہیں، میرے شعروں کو وہی سرمدی لہجہ بخشتی ہیں، اسی روشنی کے سہارے ڈیٹرائٹ سے دہلی تک پہنچی اور پھر دہلی

سے پٹنہ ایئر پورٹ تک آ گئی۔

پٹنہ ایئر پورٹ پر ہر شخص بیمار اور پریشان لگ رہا تھا۔ ہر شخص کو الگ الگ سی پریشانی ہوگی۔ کسی کو پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر، کسی کو بہتر نوکری کی فکر، کسی کو لڑکی کی شادی کی فکر، دوا علاج کی فکر اور کوئی تو اس انتہا تک بیزار لگ رہا تھا جیسے دنیا کے ذرّے ذرّے میں اسے بس بے التفاتی، نا امیدی نظر آ رہی ہو، جیسے خود کو آگ کے بگولے میں ایک سوکھے پتے کی طرح چرمراتے ہوئے محسوس کر رہا ہو۔ ان سبھی کے بیچ پروین کا چہرہ شاداب و بشاش دکھائی دیا۔ اتنے دن وطن سے باہر رہتے ہوئے نظر تندرست اور بشاش لوگوں کو دیکھنے کی عادی سی ہو جاتی ہے، اس لیے اپنے غریب وطن کے لوگ سب کے سب مریض لگ رہے تھے۔ جیسے ہر شخص فاقہ کر رہا ہو۔ کھیت کھلیان جیسے بنجر پڑے ہوں۔ چولھوں میں کوئی آگ نہ ہو، تاریک مکانوں میں جیسے صرف بجھتے دیوں کے بے قرار دھوئیں ہوں۔

ہاں کچھ موٹے سیٹھ ادھر اُدھر نظر آ رہے تھے۔ شاید ملک کے رہبر ہوں جن کے ہاتھوں میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ جو حب الوطنی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ رہنمائی کا ہزاروں ہزار لاکھوں لاکھ ڈھونگ رچا کر غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ میں ان ہی سارے خیالات کے ساتھ گھٹ مٹ ہو کر ایئر پورٹ کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کو دیکھ کر جیسے خود بھی کھنڈر سی ہو کر کھڑی رہی اور وہ ایئر پورٹ کیا...... مگر جو بھی تھا، میں خوش تھی کہ پٹنہ، میرا شہر، اور اس کی سرزمین پر میں پہنچ چکی تھی۔ ایئر پورٹ سے باہر کی پیلی دیوار دیکھ کر مجھے عدالت گنج میں پڑوس کے رضا چچا کا گھر یاد آ گیا۔

ہم لوگوں کے ساتھ والا گھر رضا چچا کا تھا، جن کا لڑکا مقبول عالم جسے پیار سے ہر کوئی مکو پکارتا، ہم لوگ ساتھ کھیلتے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے۔ مکو کی بڑی بہن انوار میری منجھلی بہن کی دوست تھیں، جن کو انو پکارا جاتا۔ مکو کی چھوٹی بہن کوثر تھی۔ ایک چھوٹا بھائی منور اور ایک سب سے چھوٹی بہن تتی تھی۔ سب کے سب اسی عدالت گنج میں پیدا ہوئے۔ رضا چچا اور ہم لوگوں کے گھر کے بیچ میں بس ایک دیوار تھی۔ ان لوگوں کے گھر کی ساری آواز ہم لوگوں کے آنگن میں آتی اور ہم لوگوں کی چیخ پکار وہاں جاتی۔ دونوں گھروں میں بے حد پیار محبت تھا۔

اس کے بعد والے کوارٹر میں ایک شیو پرشاد بابو رہتے تھے۔ ان کی دونوں چھوٹی لڑکیاں میری دوست تھیں۔ ایک کا نام شیلا اور دوسری کا لیلا تھا۔ لیلا، شیلا کی بڑی بہنیں میری بہنوں کی دوست تھیں۔ رادھا دی اور مایہ دی۔ بھائیوں میں پنٹی، سوہن، موہن اور کمل تھے۔ ان سبھوں کی شکلیں، بات کرنے کا انداز، سب کچھ مجھے یاد ہیں۔ کھوکھو، جولی، مکو، لیلا، شیلا

اور ہم ہر وقت ساتھ رہتے تھے اور بس کھیلتے ہی رہتے تھے۔ قسم قسم کے کھیل، اکٹ دوکٹ، کبڈی، ٹوٹی ٹوٹی چوڑیوں کو چاک سے کھینچے ہوئے دائروں سے بغیر دوسرے ٹکڑوں کو ہلائے ہوئے ایک انگلی سے دائرے کے باہر پھینکنے کا کھیل، لکا چوری اور نہ جانے کون کون سا کھیل۔

وہ زمانہ میری زندگی کا سب سے حسین زمانہ تھا۔ وہ جو گیا، پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ وقت کی آندھی ان خوشبوؤں کو، ان فضاؤں کو، اس تازگی کو چرا کر کہیں اُڑا لے گئی۔ ویسا ہی سکون ویسا ہی پُرنور ماحول پانے کے لیے ہر پل، ہر لمحہ نظر دوڑاتی رہی اور ان ہی لمحوں کی یادیں کہیں چپکے سے سرگوشی کرتی ہیں کہ ہمیں اپنے دل کے اندر محفوظ کرلو۔ بسائے رکھو۔ اپنے خیالوں میں یہی یادیں تمھیں زندگی کا نذرانہ پیش کریں گی...... تو سنو، بس ہمارا ہی ہاتھ پکڑ کر چلتی رہو۔

اب ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کی باتیں بہت ہوتی ہیں۔ میل ملاپ اور تقریریں بہت ہوتی ہیں اور مقصدی افسانے بھی بہت لکھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ افسانے تقریریں اور باتیں سیاست کے اسٹیج اور پلیٹ فارم سے ہوتی ہیں۔ اب سارے مسائل اسٹیجی اور سیاسی ہیں۔ پہلے یہ حقیقتیں زندگی میں تھیں تو ان کی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ ان پر ریزولیوشن، تجاویز اور منصوبے تعمیر کیے جاتے تھے۔ پریم چند کے زمانے تک یہ باتیں اسٹیج پر نہیں تھیں، اس لیے پریم چند کے افسانے اردو میں عموماً ان سچی زندگیوں کی تصویر کشی تھی جنھیں پریم چند نے خود لکھا تھا۔ ایسے شیو پرشاد چچا اور شیلا لیلا گاؤں اور دیہات میں اور شہر میں بہت نظر آتی تھیں۔ کلیم عاجز کی کتابوں میں پرشادی سنار، مہابیر حلوائی، سادھو سنار، چھتنی مالی، مصراجی، مدھوسودن پرشاد، سُرجی تمبولن، بھتو بہو، رام کھلاون بہو، ہیرا رانی، سونا رانی، روپا رانی کے تاریخی نام ہیں۔ ان کے علاوہ بے نام کے بہت سے مردوں عورتوں کا تذکرہ ہے جو بے لوث محبت اور ہم سائیگی کا بہترین نمونہ تھے۔ وہ سب ہندو تھے، مسلمان نہیں تھے۔ ٹیک رکھتے تھے، دھوتی پہنتے تھے، دیوی کی پوجا کرتے تھے، گنگا اشنان کرتے تھے۔ ان کی کتابوں میں منشی جی، پنڈت جی، مہیش پرشاد چودھری، پاسی، امرت چمار، سومر چمار، پھمن چمار، بہت سے گھر والے تھے جن سے دوستی ہی نہیں، ان سے زندگی کا رشتہ تھا۔ مولوی عابد صاحب داڑھی رکھنے والوں سے نماز پڑھنے والوں سے عید اور شب برات اور محرم منانے والوں سے ایسے تھے کہ ان کی زندگیوں کو الگ الگ کردو تو مولی صاحب، مولوی صاحب نہیں معلوم ہوں۔ مہیش پرشاد اور سادھو سنار معلوم نہیں ہوں۔ وہ سب ایک محبت بھری بے لوث، بے غرض زندگی کا اٹوٹ اور ناقابلِ تقسیم زندگی کا باہم حصہ

معلوم ہوتے تھے۔ جب دنیا آئی، حکومت آئی، سیاست آئی تو وہ رشتے کمزور ہونے لگے اور اب گویا دو الگ الگ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ کلیم عاجزؔ صاحب کے رشتے کے نانا مولوی مظاہر حسین صاحب اور ایسے بہت سے لوگوں کی جائیداد بھی غیر منقسم تھی۔ سید مظاہر حسین اور باسدیو سنگھ راجپوت کی کاشتکاری ایک ساتھ تھی۔ نام الگ الگ تھے مگر ایک ساتھ دل کی آب پاشی ان کی بُنتی اور کٹنی اور دماہی ہوتی تھی۔ مظاہر حسین ایک ایک ماہ باسدیو سنگھ کے مکان میں رہتے تھے۔ کھانا پاک صاف کھاتے تھے۔ ایک ساتھ سونا پڑنا کھانا پینا رہتا۔ یہ صاف زندگی سیاست اور جاگیرداری کے ذریعہ کاٹ دی گئی۔ اب حقیقت نہیں رہی تو باتیں ہونے لگیں۔ اب باتوں کا مزہ تصویر میں ہے، کتابوں میں ہے۔ زندگی میں جو مزہ تھا، وہ ختم ہو چکا۔ اب یہ سب بے مزہ باتیں چل رہی ہیں۔ اگر یہ زندگی نہیں بدلی اور زندگی کا جز نہیں بنی تو مستقبل میں باتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔

شہنشاہ اکبر کے بیٹے سلیم کو ایک ہندو پڑوسن لڑکی نے راکھی باندھ دی تو وہ سلیم کی منھ بولی بہن بن گئی۔ جلد ہی سلیم کی تاجپوشی ہوگئی اور وہ جہانگیر بن گیا تو وہ ہندو لڑکی گلابی پیشواز پہن کر ڈولی میں بیٹھ کر ڈھٹائی سے جہانگیر کے محل میں کود پڑی اور کمرے کمرے دوڑ دوڑ کر ناچتی پھرتی اور گاتی پھرتی کہ:

کیوں نہ پہنوں گلابی چندریا آج رے

میرے بھیا نے پہنا ہے تاج رے

جہانگیر کو معلوم ہوا تو سارے محل میں ہنستا ہوا اس لڑکی کو پکڑنے کے لیے دوڑتا پھرتا تھا، مگر وہ پکڑا نہیں رہی تھی۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد پکڑائی تو جہانگیر نے پوچھا،:: تو نے یہ گلابی چندریا خود کیوں بنالی، یہ تو میں بناؤں گا۔“

ہولی دیوالی میں سبھی بھائی بہن شیو پرشاد چچا اور جگر بندھو چچا کے گھر والوں کے ساتھ ہر کام میں حصہ لیتے۔ ہائی کورٹ میں کام کرنے والے سبھی لوگ ہولی کے دن ہم لوگوں کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور ابا جیسی خاموش شخصیت والے انسان کو بھی نہ چھوڑتے، باہر لے جاتے اور پچکاری سے ان کے کپڑوں کو رنگین کر دیتے۔ رنگوں سے نہلا دیتے۔ عبیر سے ماتھے کو بھر دیتے اور میرے ابا ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ سب کچھ تہہ دل سے قبول کر لیتے۔ گھر میں داخل ہوتے تو پہچانے نہیں جاتے۔ رنگ اور عبیر کو چھڑانے کا انتظام ہوتا۔ ایک ہنگامہ، غل، ہنسی کی پھواروں سے پورا ماحول اور بھی رنگین ہو

جاتا۔

دیوالی آتی تو کھوکھو، جولی، لیلا اور شیلا کی طرح میرے گھر میں بھی میرے لیے گھروندا بنوایا جاتا۔ مٹی کا گلابی گلابی ابرق کے چور میں لپٹا ہوا چھوٹا چھوٹا گڑیوں کا چمکیلا برتن خریدا جاتا۔ پوری ایک ٹوکری میں خانہ داری کے لیے سارے برتنوں کا ایک پورا سیٹ ہوتا اور میں ہفتوں مہینوں اس گھروندے اور ان برتنوں کے ساتھ بیٹھی بیٹھی کھیلتی رہتی، سجاتی رہتی، سنوارتی رہتی۔

گھروندے کو لال اور ہرے تلنگی کے کاغذ کو کاٹ کاٹ کر طرح طرح کا ڈیزائن بنایا جاتا اور سجایا جاتا۔ دیوالی کا دن آتا۔ صبح سے ہی ساری تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ گھروندوں میں بے شمار چھوٹے چھوٹے دیے جلائے جاتے تو دل و دماغ کے اندر ایسی روشنی بھر جاتی، ایسا سرور آجاتا، ایسی دیوانگی چھا جاتی کہ بس خوشیوں کا سب سے اونچا مقام وہی ہوتا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے آگے اب اور کوئی خوشی ہی نہیں رہی۔ اسی گھروندے کے ننھے در و دیوار پر مہ و انجم کے جمال کا عکس تھا، شوخ رنگوں کی دھنک کا ایک حسین سا جال تھا۔ گھروندے کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں جیسے کوئی چھپا بیٹھا ہو اور کوئی بسنت بہار کے کسی گیت کا الاپ لگا رہا ہو اور اس کے ایک ایک لفظ ترشے ہوئے میرے اندر پیوست ہو رہے ہوں۔ اسی دولت کو میں آج تک سنبھالے ہوئے ہوں۔ اسے کوئی چھین نہ سکا، کوئی اس دیوتاؤں جیسے اندر سبھا کے سین کو نہ بدل سکا۔ وہ میرے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ زمانہ کچھ عجیب طرح کا زمانہ تھا۔ نیند آتی تو میں کہیں پر بھی سو جاتی۔ کوئی لوری نہ بھی دے تو فضاؤں سے جیسے لوری برستی رہتی۔ صبح کی ہلکی ہلکی کرن جیسے مجھے گدگدا کر اٹھا دیتی، مجھے ہنساتی، اور پھر میں فاتحانہ اپنی کہکشاں سی رہگزر پر گامزن رہتی۔ صبح صبح نیند کے ٹوٹتے ہی آنکھ ملتے ملتے ایک ٹوکری اٹھاتی اور ہارسنگھار کا پھول چننے چلی جاتی۔

میں سوچتی ہوں زندگی اور پھول سے کیا رشتہ ہے۔ اس کائنات میں خدا کی جائیداد نیم جاں اور بے جان تخلیقات میں ایسی دنیا آباد ہے جو بہت نمایاں ہو جانے کے باوجود ابھی بہت کچھ نگاہوں سے معدوم ہے۔ آہستہ آہستہ انسان ان تخلیقاتی نمونوں سے شناسا ہوتا جائے گا اور قدرت کی وسعت تخلیق کے نہاں خانوں میں حیران اور سرگرداں پھرتا رہے گا۔ لیکن جو چیز انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی انسانی زندگی سے ہم آہنگ، ہم دوش اور ہم نشیں رہی، وہ پھول ہے۔ پھول نے ایک کم پیمانے ہی میں زندگی کی کشش کو سمیٹ رکھا ہے۔ نرمی، جسے انسانی لمس محسوس کرتا ہے۔ رنگ، جسے انسان آنکھوں

سے دیکھتا ہے۔ خوشبو، جس سے انسان کا سراپا معطر رہتا ہے۔ پھولوں سے پتوں کی سرسراہٹ، جس سے انسان کا سامعہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ زندگی کے رزق میں پھول شامل نہیں ہے، نہ اس کا تعلق کھانے سے ہے، نہ مکان سے، نہ عورت سے، نہ کپڑے میں سواری سے۔ یہ پانچ چیزیں رزق میں شامل ہیں۔ لیکن پھول کی خصوصیت اس کی نرمی، نزاکت، خوشبو اور رنگ ہر چیز میں ہے۔ کھانے میں بھی ان کی تلاش ہے، کپڑے میں بھی مکان، عورت اور سواری میں بھی۔ زندگی سے جس چیز کا ربط سب سے زیادہ ہے وہ پھول ہے۔ پھول جیسا موسم، پھول جیسی زندگی، پھول جیسی عورت، پھول جیسا مکان، پھول جیسا پیرہن، پھول جیسی لڑکیاں، پھول جیسی سواری، ہر جگہ، ہر محل میں، ہر موقع میں، ہر بات میں، ہر کہانی میں پھول سے حسن ہے، پھول سے رنگ ہے، نور ہے، پھول سے خوشبو ہے، پھول سے لطف ہے، مزہ ہے، راحت ہے۔ جب انسان کی تخلیق ہوتی ہوگی، اس کے ساتھ پھول بھی آیا ہوگا۔

شاعری میں، ادب میں، مصوری میں، موسیقی میں، معماری میں، مجسمہ سازی میں، پیکر تراشی میں، رقص میں، سرور میں، ہر جگہ پھول کی تلاش ہے تو زندگی پھولوں کی پیاس ہے، پھولوں سے آسودگی ہے، پھولوں سے راحت ہے۔ مجھے بھی پھولوں سے ربط، تعلق، محبت اور رغبت بچپن سے رہا ہے۔

پڑوس کے مکان کے کھنڈر میں ہار سنگھار کے پھول کا درخت تھا۔ اس مکان کی مالکن کلاسیکی شکل وصورت کی گوری چٹی خاتون بڑے ہی انداز سے باہر کا گیٹ کھولتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ وہ ضرور پکا (کلاسیکی) گانا گاتی ہوں گی۔ ہر صبح ان کے احاطے میں اس درخت کے چاروں طرف اتنے پھول گرتے کہ پوری زمین برف کی طرح سفید ہو جاتی۔ میں پھول کے لالچ میں، پھولوں کی محبت میں، پھولوں کی طلب میں، پھولوں کی کشش میں ان کے گھر پہنچ جاتی تو وہ میری معصومیت پر، طلب اور محبت پر مسکرا اٹھتیں اور مجھے اپنی طلب اور اشتیاق کا موقع دینے کے لیے وہاں سے ہٹ جاتیں کہ میں جی بھر کے پھولوں سے لپٹوں، کھیلوں، توڑوں، چنوں اور میں واقعی طلب اور محبت کی آسودگی کے لیے پھولوں سے کھیل شروع کر دیتی۔ میں جب پھول چننا شروع کرتی تو وہ ضرور کہتی تھیں، ''ارے انجم، تو تو بہت جلدی جلدی پھول چنتی ہے رے۔ ارے آہستہ آہستہ چن نا۔!'' اور میں ان کی آواز سنتے ہی آہستہ ہو جاتی۔ مگر پھر میں آہستہ آہستہ پھول چننے میں ایسی منہمک ہو جاتی کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہتا۔ ہار سنگھار کے ننھے ننھے پھول، ننھی ننھی پتیاں، ننھی سرخ ڈنڈیاں آسمان پر ستاروں کی طرح زمین پر ٹوٹی ہوئی پڑی رہتیں اور اس جگہ کی زمین تاروں بھرا آسمان بن جاتی اور جی بھر کے میں پھول

چنتی، انھیں بٹورتی، سمیٹتی اور ٹوکری بھرلیتی، گویا آسمان کی رعنائیاں اپنی چھوٹی سی ٹوکری میں سمولیتی اور پھر خوشی سے پھولی نہ سماتی۔

میں تو صرف پھول چننے کی لذت سے آسودگی حاصل کرتی تھی۔ میں تو اسی سرسبز احاطے میں پھول چنتے چنتے بہار کے نقشِ قدم کو اس کی پائلوں کی چھم چھم کو بغیر کسی ارادے کے اپنے اندر سمیٹ لیتی تھی۔ گھر آتی، ٹوکری آنگن میں رکھ دیتی تو ہماری محنت اور محبت میں سب لوگ شامل ہو جاتے۔ کوئی مٹھی میں لے کر سونگھتی، کوئی ہوا میں اچھالتی، خوشی میں سب شریک ہوتیں، محنت صرف ہماری رہتی۔ پھر سرخ سرخ ڈنٹھیوں کو کچھ لوگ الگ کرنے آگئیں کہ اس سے کپڑے رنگے جائیں گے یا لحاف کے پلّے رنگ و خوشبو میں بسائے جائیں گے۔ خدا جانے پھولوں کو ضرورتوں کے لیے استعمال کرنا لوگ کیوں پسند کرتے ہیں۔ پھول، صرف پھول ہیں، انھیں پھول ہی رہنے دینا چاہیے۔ اس سے رنگ بنانا اور کپڑے رنگین کرنا یا دوائیں بنانا اور صحت کے لیے استعمال کرنا، یہ حسن کے ساتھ، خوشبو کے ساتھ، رنگ کے ساتھ، نزاکت کی علامت پھولوں کے ساتھ شاید انصاف نہیں، مگر دنیا استعمال کی عادت میں مبتلا ہے۔ میں حسن کو صرف حسن، خوشبو کو صرف خوشبو، رنگ کو صرف رنگ ہی سمجھتی ہوں، اور اسی کی دیوانی رہتی ہوں، اسی کو حاصل، اسی کو منافع سمجھتی ہوں، اسی کے سرور میں رہنا چاہتی ہوں۔ اسی کا نشہ اور اسی کی سرشاری، تمام لذتیں اور تمام کیفیتیں اسی میں پنہاں ہیں۔

چاند جو دور سے نظر آتا ہے اور چاند اپنے دیدار سے کروڑوں انسان کو جو خاموش گفتگو سکھاتا ہے، مصوری کا نور اور موسیقی کا سرور دل میں بھرتا ہے، وہ چاند پر جا کر کسی کو کہاں نصیب۔ لوگ چاند کی ماہیت جاننے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کر کے راکٹ بناتے ہیں، لیکن جو چاند پر جاتے ہیں وہ نور، سرور کہاں حاصل کرتے ہیں جو ہم اپنے گھروں میں بیٹھے یا سبزہ زار پر لیٹے یا تالاب کے کنارے کھڑے کھڑے، بے قیمت ادا کیے وہ منافع حاصل کرتے ہیں اور منافع دوسروں کو پہنچاتے ہیں۔ شعر کہتے ہیں یا گنگناتے ہیں، وہ صرف ہمیں کو نصیب ہے۔ نزدیک جانے والوں کو خاک دھول اور روڑے کنکری کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ شاعر خوش قسمت ہے، فنکار خوش قسمت ہے کہ کچھ سنتا ہے، کچھ دیکھتا ہے، کچھ سوچتا ہے اور لہلہاتا ہے۔ فن، نغمہ، رنگ، آہنگ دنیا کو دے دیتا ہے اور کچھ ان سے طلب نہیں کرتا ہے۔ مجھے وہ بے چینی ہے کہ معصوم خوشی پہلے مطلوب نہیں تھی تو قدم قدم پر ملتی تھی۔ اب مطلوب ہے تو ڈھونڈے نہیں ملتی۔ اور نہیں مل سکتی۔ کہ سانپ نکلا چلا جا رہا ہے، لوگ صرف لکیر پیٹتے ہیں۔ ہوا گزر جاتی ہے، لوگ گرہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوا کو کیا پکڑیں گے۔

ہوا کو تو ہم پکڑے ہوتے تھے۔ جب اس کی سرسراہٹ سنتے تھے اس کی گنگناہٹ محسوس کرتے تھے، اس کی نزاکت کو چھوتے تھے، اس کی خوشبو سونگھتے تھے، اب اسی کی یاد میں شاعری کرتے ہیں، تصویریں بناتے ہیں۔ جو ہمارے پاس ہے وہ راکٹ پر سفر کرنے والوں کے پاس یا دوربین لیے بیٹھے رہنے والوں کے پاس کہاں ہے۔ وہ ذہنوں سے فراموش ہو جائیں گے لیکن شاعر، مصور، فنکار سو سال، ہزار سال بعد بھی زندہ رہے گا۔ جو دوربین سے نہیں ملا، راکٹ سے نہیں ملا، وہ ہزار سال بعد بھی لوگوں کو ملتا رہے گا۔ جب دنیا والوں کے پاس کچھ نہیں تھا، اس وقت بھی فنکار ہی ان کو سب کچھ دیتا تھا اور جب اگلے زمانے میں کچھ نہیں رہے گا، اس وقت بھی فنکار ہی ان کو سب کچھ دے گا۔ فنکار قدرت کا نمائندہ کل بھی تھا، آج بھی ہے تو وہی ہے اور کل بھی وہی رہے گا۔ جب تک قدرت ہے، فطرت ہے، فنکار بھی ہے۔ قدرت جب اپنا بوریا سمیٹ لے گی، اسی بوریا میں فن بھی رہے گا اور کہیں نہ رہے گا۔

اسی احاطے میں پھول چنتے چنتے شعور و فکر کے رنگ میرے اوپر برس کر چھاتے گئے اور میں...... ان ہی اوسارے آنگنوں میں پلتی رہی اور سکون کی ایک دولت میرے اندر جمع ہوتی رہی اور ان ہی خوشبوؤں میں رقص کرتے کرتے میں نے زندگی کو گلے سے لگالیا۔

جن دنوں کی بات میں لکھ رہی ہوں، وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ وہ ماحول، وہ وقت، رنگین لہر کی چادر تانے ہوتے تھے۔ راہ چلتے مسافروں کو کچھ عجیب طرح کا سکون حاصل تھا۔ زندگی بسر کرنا آسان تھا اور یہ نہیں کہ مرجانا مشکل تھا۔ مرجانا بھی آسان۔ اب تو نہ جینا آسان ہے نہ مرنا۔ جدھر دیکھو علم کی روشنی ہے مگر سچ پوچھیے تو صحیح القلب علم کی روشنی سے کوسوں دور، ٹوٹے دشتوں اور شکستہ لہجوں کو لیے لوگ بے مقصد چل رہے ہیں۔ نہ کوئی حاصل ہے نہ وصول۔ ایک وہ وقت تھا کہ رنگ، نسل، زبان اور مذہب دیکھے بغیر لوگ محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں سگے بھائیوں سے بھی بڑھ کر کام آتے تھے۔ ماں باپ، بھائی بہن کا لحاظ، خیال اور عزت کر کے بھی لوگوں کو تشفی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کے لیے مرنے مٹنے کو تیار رہتے تھے۔ نہ ہی ان دنوں بے تحاشہ قتل و غارت کی خبر آتی تھی، نہ چوری کی اور نہ ڈکیتی کی۔ اگر کوئی بری خبر آئی بھی تو اسے بھی بڑوں نے سنا۔ ہم لوگوں کے کانوں کان تک کبھی ایسی خبر نہ پہنچ سکی۔

پٹنہ ایئرپورٹ پر اتنے دنوں کے بعد لوگوں کی ایسی خستہ حالت دیکھ کر میں بے حد بے چین ہو گئی۔ میں نے پروین سے

کہا کہ سامان جیسے ہی ہوائی جہاز سے آجائے، یہاں سے نکل چلو۔ پروین اور ان کے شوہر ایئر پورٹ پر ادھر اُدھر سامان کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور ہم تینوں اپنی ہی سرزمین پر اپنے وطن میں بالکل انجان بنے ہوئے کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر میں سامان آ گیا۔ ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ کر پاٹلی پترا پروین کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ پروین کے گھر میں اُترتے ہی جیسے جان میں جان آ گئی۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا یہاں سے وہاں تک پروسا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کیا۔ شام کو ہی کچھ لوگ ملنے آ گئے اور پھر رات کا کھانا کھا کر ہم لوگ سو گئے۔

بستر پر جاتے ہی پھر عدالت گنج کی یاد ستانے لگی۔ اپنے شہر میں تو آ ہی چکے تھے مگر ایک بے قراری تھی اور پروین دوسرے دن ہمیں عدالت گنج لے کر جانے والی تھیں۔ چھبیس گھنٹوں کی تکان کی وجہ سے بستر پر جاتے ہی ہم سبھی بے خبر سو گئے۔ صبح کو نیند ٹوٹی تو باہر سے چڑیوں کی چہچہاہٹ، مرغے کی بانگ اور کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آوازیں بہ دستور آتی رہیں اور میں...... بستر پر لیٹی لیٹی ان آوازوں کے مزے لیتی رہی۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے افریقہ کے کسی گھنے جنگل کے بیچوں بیچ بستر لگا ہوا ہے یا جنوبی امریکہ کے کسی Rain forest میں آنکھ بند کر کے لیٹی ہوئی ہوں۔ سر سبز پتوں سے گھری ہوئی درختوں کے درمیان بہت ہی سکون سے بیٹھی ہوئی ہوں۔ در حقیقت آنکھ کھولنے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ صبح میں بہت دیر تک، میں خاص طور پر اسی بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی اور اس ماحول سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ دس بجے کے قریب ناشتہ کیا۔ دائیوں اور نوکروں کا ریل پیل تھا۔ ہندوستان میں تو کھاتے پیتے گھروں میں ہر کام کے لیے الگ ایک نوکر ہوتا ہے۔ جس چیز کی خواہش ظاہر کی، وہ چیز میرے سامنے تھی۔ بہت دنوں بعد ہندوستان جانے پر یہ سب چیزیں نئی نئی لگ رہی تھیں۔

پروین نے ڈرائیور صاحب کو بلوانے کے لیے کسی نوکر کو بھیجا تا کہ ہم لوگ عدالت گنج جائیں اور پٹنہ میں دوسرے رشتہ داروں سے بھی مل لیں۔ ڈرائیور صاحب گاڑی لے کر آ گئے پھر ہم لوگ روانہ ہوئے۔ ہم سے پوچھنے لگے، "حجور (حضور) یہ عدالت گنج کدھر ہے؟" میرے لیے بھی سچ پوچھیے تو وہ شہر نیا ہو گیا تھا۔ جہاں پر چٹیل میدان تھا، وہ جگہ اب مکانوں سے پٹی پڑی تھی۔ ہر جگہ پرچون کی چھوٹی چھوٹی یا دوسری چیزوں کی دکانیں کھل گئی تھیں۔ یوں بھی ہندوستان میں کسی کا کوئی پتہ (address) یا ٹھکانا تو ہوتا نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ اندازے سے ہی سفر کرتے ہیں۔

میں نے بے چین ہو کر ڈرائیور صاحب کو پتہ بتانے کی کوشش کی۔ "ڈرائیور صاحب، عدالت گنج تو پٹنہ اسٹیشن سے

Mt. Carmel, Patna (India) میرا سب سے پہلا اسکول

پیچھے: طلعت جعفری، سکھوا (گھر کا کام کرنے والا)، سید مسعود (منجھلے بھیا)، سید اسلم (چھوٹے بھیا)، میری امی (بی بی راشدہ خاتون)، صوفیہ انجم تاج،
میرے ابا سید عبدالعزیز (عدالت گنج کوارٹر میں)
زمین پر: رسولن (جو عدالت گنج کی باہر والی کوٹھری میں رہتی تھی) کا بیٹا میر
جواب ٹرک چلاتا ہے۔

بہت نزدیک ہے۔'' اشوک سنیما سے تو عدالت گنج بے حد قریب تھا۔ ''چلیے ڈرائیور صاحب، پہلے اشوک سنیما ہی چلیے۔''

ڈرائیور صاحب گاڑی چلاتے رہے، لیکن اس طرف کے علاقے کا مجھے کوئی سراغ ہی نہیں مل رہا تھا۔ ہر سین بالکل انجان سا تھا۔ بے ترتیب، جیسے کبھی پہلے دیکھا ہی نہ ہو۔ ایکدم اجنبی، انجان! جہاں پر کبھی سناٹا ہوتا تھا، وہاں ہزاروں لوگ چل رہے تھے۔ کار میں بیٹھے بیٹھے ایک لمحہ ایسا آیا کہ میں بالکل ہی بے بسی محسوس کرنے لگی۔ ڈرائیور صاحب کو جو سمجھ میں آ رہا تھا، وہ کر رہے تھے۔ آخر میں انھوں نے گاڑی روک کر ایک پرچون کی دکان والے سے پوچھا، ''بھئی عدالت گنج کس طرف ہے؟'' تو اس شخص نے بتایا، ''پہلے بائیں، پھر داہنے، پھر تلاؤ آئے گا، پھر پیپل کا درخت، جہاں پر ایک چھوٹا سا مندر ہے۔'' میں اچھل کر بولی، ''ہاں ڈرائیور صاحب، یہ شخص پورا پتہ صحیح بتا رہا ہے۔ اسی سے ٹھیک طرح سے پوچھ لیجیے۔''

ڈرائیور صاحب پھر گاڑی چلانے لگے۔ ویسے ہی ویسے گاڑی چلی، پہلے بائیں، پھر داہنے، اس کے بعد تالاب، اور اس تالاب پر افق کے عکس کے ساتھ جھکا ہوا پیپل کا وہ بہت ہی پرانا، بوڑھا درخت جس نے نہ جانے کتنوں کو اپنے سائے کی آغوش میں سکون بخشا تھا۔ چلتے ہوئے اور ٹھہرے ہوئے مسافروں پر اپنی ٹھنڈک کا خزانہ لٹاتا رہتا تھا۔ اپنی شاخوں کی سرسراہٹ سے بھجن کی لے میں لے ملاتا ہوا وہ درخت اب بھی پوری توانائی سے کھڑا تھا۔ پھر اس کے پچیس گز کے بعد ہم لوگوں کا گھر...... وہی گھر یعنی محلے میں داخل ہوتے ہی داہنی طرف کو پیلا پیلا گھر...... وہی گھر جو پیار و محبت کا ایک گہوارا تھا۔ جس گھر سے کبھی ننگے پاؤں، کبھی چپل پہن کر، بے خوف و خطر باہر کھلی ہوا میں نکل جاتی تھی، جہاں ننھے منے قہقہوں کی گونج تھی۔ جہاں سے زندگی شروع کی تھی، جہاں توتلے الفاظ کا آغاز ہوا تھا۔ نہ جانے کتنی آوازوں کے عکس میرے سامنے رقص کرنے لگے۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ پیپل کا درخت میرے گھر سے قریب ایک میل دور ہوگا اور اس بار جب میں نے اس کی دوری کا اندازہ لگایا تو ایسا لگا کہ بیس گز سے زیادہ دور وہ درخت نہیں تھا۔ گاڑی سے تو دو سیکنڈ میں اس درخت کے پاس سے کوارٹر تک پہنچ گئی۔ ایسی بے بسی تھی کہ کچھ بول ہی نہ پائی۔ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ...... ''ارے ارے ڈرائیور صاحب، ذرا آہستہ چلائیے......'' یہی تو وہ چھوٹا سا میدان تھا جہاں میں دن اور رات اچھلتی کودتی تھی، جہاں میری دوستوں کا ایک جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ قسم قسم کے کھیل اس میدان میں کھیلتی تھی۔ بے مقصد بھی اسی میدان کے ایک کونے میں بیٹھ کر وقت گزارتی تھی۔ میرے گھر سے لگا ہوا ایک فینس تھا جس پر قسم قسم کی تتلیاں آ کر بیٹھتی تھیں اور جب بھی ہم لوگ تتلیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے تو گلی کا کوئی لڑکا پکار کر کہتا، ''بھاگ ری تتلیا، تو ہر (تمھاری) جان مارا ہو (مارتی ہے)'' اور پھر تتلی

بچ بچ اڑ جاتی۔

کاش! میں وہاں پر اُتر کر تھوڑی دیر کے لیے کھڑی ہو جاتی۔ وہاں کی فضاؤں کا، ہواؤں کا، جائزہ لے سکتی۔ کچھ سوچتی، کچھ آنکھیں کھول کر کونے کونے کی چیزوں کو دیکھتی، کسی کو پکار کر کچھ پوچھتی۔

ڈرائیور صاحب نے تو ایک ہی سانس میں پیپل کے درخت کے پاس سے اس پیلے گھر کے سامنے گاڑی لا کر کھڑی کر دی۔ اور میں ...... میں تو ہائے ہائے بھی نہ کر سکی۔ بالکل خاموشی سے، ایک حسرت کو دل میں لیے اس مکان کو دیکھتی رہی۔ جیسے کچھ بولنے کی سکت ہی نہ ہو۔ خدا جانے کیوں میں سراپا منجمد سی ہو کر رہ گئی۔ پروین بولی، ''کیا منجھلی امی گاڑی سے اُترنے کا ارادہ نہیں ہے؟'' پھر بھی میں گونگی سی گاڑی ہی میں بیٹھی رہی۔ پھر ڈرائیور صاحب بولے، ''یہی گھر ہے حجور (حضور) اُتریئے نا!''

گھر تو وہی تھا۔ اس بار گھر کے چاروں طرف دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ اس لیے گھر کا نقشہ بدلا بدلا سا تھا۔ لیکن اس چہار دیواری کے اندر سے میرا وہ پیلا مکان مجھے جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک طرف برآمدے کی سیڑھیاں اور دوسری طرف سیمنٹ کا ڈھلوان جیسا اترنے کا راستہ، جس پر ہم دن بھر میں نہ جانے کتنی بار کبھی اوپر جاتے اور کبھی نیچے اترتے تھے۔ پہلے جو چیزیں اتنی بڑی بڑی لگتی تھیں، وسیع لگتی تھیں، وہی چیزیں جیسے اب سکڑ کر چھوٹی ہو گئی تھیں۔ باہر کے برآمدے کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریوں میں ٹماٹر اور کچھ بڑے بڑے پپیتے لگے ہوئے تھے۔ کچھ اور سبزیاں ان کیاریوں میں بھی تھیں جہاں چھوٹے بھائی جان قسم قسم کے خوشبودار پھولوں سے بہت ہی خوبصورتی سے اپنا باغبانی کا شوق پورا کرتے رہتے تھے۔ ان کو پھولوں کا اس قدر شوق تھا کہ اپنی فرصت کا ایک ایک منٹ اسی گھر کو پھولوں سے سجانے میں صرف کرتے تھے۔ ہر موسم کے الگ الگ پھول لگائے جاتے۔ ان پر گھنٹوں تبصرہ ہوتا۔ ہر گزرنے والے کے پاؤں جیسے خود بخود چلتے چلتے رک جاتے۔ تھوڑی دیر کے بغیر کوئی بھی آگے کبھی نہیں بڑھتا تھا۔ پوجا پاٹ کے لیے، حتیٰ کہ کبھی کبھی پجاری تک کے لیے، جو بغیر پوچھے ہی رام رام کرتے ہوئے آہستہ سے کوئی پھول توڑ لیتے، جیسے کہ یہ ان کا اپنا ہی گلشن ہو۔ ہم لوگ دیکھتے مگر کبھی نہیں ٹوکتے۔ کہا بھی یہی جاتا ہے کہ پوجا کا پھول ہمیشہ چوری ہی کا ہوتا ہے۔ سب مذہبوں کے لوگوں کے دلوں میں ایک harmony چھائی ہوتی تھی۔ لوگ اس وقت مذہب کی روح کو پہچانتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت لوگوں کے مذہب اور عقیدت، سب کچھ مختلف ہوتے تھے۔ خاص طور پر پٹنہ تو پٹنہ کی طرح تھا۔ لوگوں کے گھروں میں کسی مخصوص اصول، کسی

نپے تلے طریقے کے تحت سارا کام ہوتا تھا۔ رہنے سہنے کا انداز جدا تھا۔ پانی کے گھڑوں کو کیوڑے سے بسا کر پانی بھرا جاتا تھا۔ شام کو پیتل اور تانبے کے بدھنے کو روز مل مل کر چمکایا جاتا۔ پھر آنگن کے باہر برآمدے کے کسی خاص کونے میں اس کو رکھا جاتا۔ فریج تو امیروں کے گھروں میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت کے لوگ تو ٹھنڈا پانی گھڑے کے سوندھے اور خوشبو دار پانی کو ایک نعمت سمجھتے تھے اور اسی کو پینے کے عادی تھی۔ میری نظر کے سامنے تو ویسی ٹھنڈک، ویسی خوشبو، ویسی سوندھی مہک کسی تاریخ کی طرح ذہن میں لہراتے ہوئے طواف کرنے لگتی ہیں۔ معمولی سی معمولی بات میں، معمولی سی معمولی چیز میں ایک عجیب سی لذت، ایک خاص سکون ملتا تھا۔

میں تو پختہ مکان میں رہی۔ پختہ سڑکیں دیکھیں، کاریں دیکھیں، رکشا دیکھا۔ اسکوٹر اور ٹیمپو دیکھا۔ شخپورہ جاتے ہوئے کئی قسم کی سواریوں کو دیکھا۔ بعض دیکھنے والوں سے سنا جو حافظے میں ہے، جب دیہات سے اوسط درجے کے گھرانے کے لوگ چار کہاری ڈولیوں اور کھٹولی پر تنہا سفر کرتے تھے۔ عقیقوں اور ختنوں کی تقریب میں دور جانا ہوا تو تندرست اور تیز بیلوں کی گاڑی پر نیچے پوال بچھا کر اس پر دری بچھائی جاتی۔ اس سفید چادر کے درمیان میں ڈھولک اور پانچ چھ عورتیں یا پھر مراثنیں ہوتیں۔ اوہار سے ڈھنپی ہوئی بیل گاڑی کے اندر سے مراثنوں کی تیز اور سریلی آواز ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ باہر کے بازاروں اور دیہات کی گلیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو پرستان کی آواز لگتی کہ اس وقت نہ ریڈیو تھا، نہ دیہاتوں میں موسیقی اور رقص خانے تھے۔ تقریبات ہی میں کسی کسی کی اچھی آوازیں دل کے پردوں پر تیز ہلچل مچا دیتی۔ اس وقت کی زبانیں اس ہلچل کو اپنی زبان میں بیان کرنے سے قاصر تھیں۔ دل ہواؤں میں اڑتا مگر ہواؤں میں اڑنے کی کیفیت بیان میں نہیں آتی۔ معصوم زندگیاں لذت اور سرور، شیرینی اور چاشنی سب محسوس کرتی تھیں لیکن اسے باہر نہیں لاسکتی تھیں۔ اس لیے اس زمانے کی زندگیاں مجسم شیرینی، مجسم رنگینی، مجسم نرمی، مجسم محبت اور مجسم پیار تھیں۔ اب تو بول کے، کہہ کے، تقریر کر کے، تحریر لکھ کر بہت کچھ خارج ہو جاتا ہے۔ جو بچتا ہے اس میں اتنی توانائی نہیں کہ ایک بول کے ذریعہ ایک نگاہ کے ذریعہ، ایک ادا کے ذریعہ یک بیک بھڑک کر ایک زندگی سے نکلے اور دوسری زندگی میں اتر جائے۔

مستورات آنے والوں کی بلائیں لیتی تھیں یعنی دونوں انگلیاں پھیلا کر آنے والوں کے سر کو تھامتیں اور ہاتھوں کو سر، گردن اور بازوؤں سے گزار کر اپنے سر پر لگا کر انگلیوں کو موڑ کر اپنے سر پر دباتیں تو تیز چٹاخ کی آواز ہوتی۔ یہ محبت کی، خلوص کی، پیار کی، ربط اور تعلق کی آواز ہوتی جسے دل محسوس کرتا اور پیار کی پونجی بنا کر دل کے اندر حفاظت سے رکھ لیتا۔ اور یہ

پیار بے کہے، بے سنائے، بے افسانہ اور قصہ بنائے پورے محلے یا بستی میں چھایا ہوتا۔ ملتے تو یوں ملتے جیسے سب کچھ اندر کا باہر نثار کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ آمادگی بغیر کہے محسوس کر لی جاتی۔ مکان میں سیمنٹ، بالو اور پتھر کے بُرادوں کا پلستر نہ ہوتا، گوری مٹی کی دیوار ہوتی، موٹی دیوار ہوتی، ڈیڑھ ہاتھ، کم از کم دو فٹ چوڑی دیوار خالص مٹی اور گارے کی۔ تیز سے تیز لُو اور جھرک بھی اس میں سرائیت نہیں کر سکتی۔ کسی دن ان دیواروں کو چکنی مٹی سے لیپ پوت دیا جاتا اور اس کے اندر پتلی چادر زمین پر بچھا کر دوپہر کی لُو والی گرمی میں کھانا کھا کر آرام کرتے تو کبھی خنکی سے چادر اوڑھنے کو جی چاہتا۔

مٹی سے بنے ہوئے بدن میں مٹی کے اجزا پوری سادگی، پیار اور خنکی سے سما جاتے اور دل کے ساتھ پورا جسم روحانی اور مادی توانائی سے بھرپور ہو جاتا اور اندر ایک نور جگ مگ جگ مگ کرنے لگتا۔

ابھی تک میں کار ہی میں بیٹھی تھی۔ پروین اور ڈرائیور صاحب ہنس رہے تھے تو یک بیک جیسے میں چونک گئی۔ دونوں ایک ساتھ بولے، ''یہی تو آپ کا عدالت گنج کا کوارٹر ہے۔ اُتریے نا، جائیے نا، یہی ہے نا No.1, A-lane''

اور میری حالت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ اس کو بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ میں نے پروین سے کہا، ''تم جاؤ، میں تمھارے پیچھے پیچھے آتی ہوں۔'' پروین اور ڈرائیور صاحب نے وہی کیا۔

دونوں اس کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے آگے بڑھے۔ ایک نام کی تختی باہر برآمدے میں لگی ہوئی تھی۔ میں دور سے اس نام کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کسی مسلمان کا نام تھا، کوئی احمد صاحب تھے۔ جیسے ہی کسی نے دروازہ کھولا، میں بھی فوراً کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی اور اس پتھر بنے ہوئے اپنے قدم کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ دونوں ان صاحب سے کچھ کہہ رہے تھے اور بار بار میری ہی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اسی دوران میں میری نظر ان کھڑکیوں اور ساتھ والے دروازے اور مکان کے سامنے والی زمین اور ان سیڑھیوں کا نظارہ کرنے میں مصروف تھی۔ اور میں یہ دیکھتی ہوئی، سوچتی ہوئی، آگے بڑھ رہی تھی کہ اللہ آج میں اپنے گھر میں قدم رکھوں گی۔ برآمدے کی ان پھیلی پھیلی سی سیڑھیوں کو دیکھوں گی۔۔ ابا کے کمرے میں بھی شاید جا سکوں۔ باجی کے کمرے کی کھڑکی تو باہر ہی سے نظر آ رہی تھی۔ پھر بیچ والا کمرہ جس کو امی نے ڈرائنگ روم بنایا تھا، اس کا دروازہ کھول کر اپنا منھ نکال کر احمد صاحب ان دونوں سے بات کر رہے تھے۔ اور میں اپنے قدموں کو آہستہ آہستہ اٹھا کر ان لوگوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ تینوں خدا جانے کیا باتیں کیے جا رہے تھے اور مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اب میں برآمدے تک پہنچ گئی تھی اور پروین کو بتانے لگی، ''میری پیشانی پر جو یہ زخم کا داغ ہے پروین، میں جب چھوٹی تھی تو یہیں پر گر گئی تھی اور ہمیشہ ہی میں اس جگہ پر گر جاتی تھی۔ بہت خون نکلا تھا۔ امّی رونے لگی تھیں۔ جلدی جلدی مجھے ایک بنگالی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تھا۔ بلکہ سر میں دو ٹانکے بھی لگے تھے۔''

مجھے بچپن کی ساری باتیں یکے بعد دیگرے یاد آتی چلی گئیں۔ احساسِ مسرت اور ملے جلے جذبات سے میں اسی برآمدے میں کھڑی کھڑی خاموشی سے تھرتھرا رہی تھی۔ اپنی اس حرکت سے مجھے خود سے تھوڑی کوفت بھی ہو رہی تھی۔ مگر انسان کو کبھی کبھی اپنے جذبوں پر خود بھی قابو نہیں رہتا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ آج چالیس برسوں کے بعد پہلی بار میں اس دالان میں کھڑی ہوں جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ پلی بڑھی، اس گھر کے کونے کونے کو جانتی تھی۔ یہ وہی گھر ہے جہاں میں کھڑی ہوں۔ چالیس برسوں کے بعد وہی ماضی کی وسیع دنیا سمٹ کر جیسے وقت کے ایک نقطے میں سما گئی تھی۔ پچھلی یادوں کے مقابلے میں ہر چیز چھوٹی لگ رہی تھی۔ اس علاقے کے سارے لوگ میری اس حالت سے بے خبر تھے۔ بالکل ہی انجان تھے۔ میں اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ وہ صاحب جو شاید گھر کی مالکن سے اجازت لینے ایک منٹ کے لیے اندر چلے گئے تھے، انھوں نے دروازے سے پھر باہر منھ نکالا اور کچھ کہا۔ میں نے سنا نہیں مگر پروین میرے بہت قریب آئی اور بولی، ''منجھلی امی، وہ لوگ گھر کے اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں!'' ڈرائیور صاحب ان صاحب سے کچھ بولتے ہی جا رہے تھے۔ میرے خیال میں کسی حد تک التجا کیے جا رہے تھے۔ مگر کچھ ہو نہیں سکا۔ ہم تو یہ سنتے ہی کانپ گئے۔ مکان کے چاروں طرف غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ چلو اگر انھوں نے اندر نہیں جانے دیا تو کم از کم باہر کی فضا ہی کو اپنے اندر سمو لیں۔ مگر یہ سب کچھ جیسے ایک منٹ میں ختم ہو گیا۔ ہم تینوں مایوس ہو کر اپنے قدموں کو دھیمی چال سے اٹھاتے ہوئے گاڑی کی طرف جانے لگے۔

میرے وہ قدم...... جو اپنے اس پیلے مکان کی طرف اٹھے تھے، اب مایوسی سے لوٹ رہے تھے۔ پیلی خستہ دیوار پر چڑھتی چنبیلی کی طرف برآمدے آنگن میں اترتی سیڑھیوں کی طرف، جس پر ہم بھائی بہن اچھل کود کر پلے تھے۔ اس آنگن کے ایک کونے میں، جہاں امی اور ابا اکثر بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ یعنی امی اس چاندنی بچھی ہوئی چوکی پر کبھی سبزی کاٹتی ہوئی، کبھی پھولوں کا ہار گوندھتی ہوئی، کبھی ہارسنگھار کی پیلی ڈنٹھیوں کو الگ کرتی ہوئی اور ابا اس چوکی کے بہت ہی قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوتے تھے۔ گھر کیا تھا ایک سلطنت تھی۔ کبھی دو بچوں میں لڑائی ہوئی تو اسی مسند پر فائز ہو کر یہ دونوں فیصلہ

کرتے۔

میں تو اپنے گھر کے آنگن کو صرف دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے قدموں سے چل کر ان سیڑھیوں سے آنگن میں اترنا چاہتی تھی۔ غسل خانے کی اس پیلی دیوار کو جس پر چنبیلی کی لت چڑھی تھی اور جو اپنے اندر سورج کی پہلی کرن کو پیوست کر کے ہم سبھی کو روشنی دیتی تھی۔ اسے اپنی نظروں سے چھونا چاہتی تھی۔ آنگن میں اس بہتے ہوئے پیار کے جھونکوں کا کوئی پرانا نشان دیکھنا چاہتی تھی۔ جس آنگن میں میرے خوابوں نے جنم لیا تھا، جس آنگن میں بجلی کے چلے جانے کے بعد لالٹین کی روشنی میں کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ بارشوں کے ٹپ ٹپ کرتے نغموں میں وہ ساری دھنیں جو دل میں آوازوں کے الاؤ کی طرح روشن ہیں، ان کو بس چند لمحوں کے لیے ہی اسی آنگن کے بیچ کھڑی ہو کر سجا لیتی، جھوم لیتی! ان روشنیوں کو، وہاں کی فضا میں پور پور اُتار لیتی۔ مگر یہ سب کچھ نہیں ہو سکا۔

یہ درست ہے کہ وقتی طور پر مجھے شدید مایوسی کا احساس ہوا۔ جیسے کوئی بے حد قیمتی جان سے بھی عزیز کھویا ہوا کھلونا دوبارہ ہاتھ میں آتے آتے کوئی چھین کر لے گیا ہو۔ محرومی اور بے بسی کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن ایک بار پھر اپنی یادوں کے سجے سجائے، جہانِ تصور کے آراستہ و پیراستہ خزانے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو یوں لگا جیسے میرے بچپن کا وہ گھر جوں کا توں موجود ہے۔ یہ بھی خیال آیا کہ اگر میں اندر جا کر دیکھتی اور مجھے سب نقشہ بگڑا ہوا دکھائی دیتا تو میری یادوں کی عمارت ڈھے جاتی۔ مجھے تو اس گھر کی موجودہ اینٹ گارے اور پیلے روغن کی بنی ہوئی عمارت سے زیادہ عزیز اپنا وہ تصور ہے جس میں وہ گھر آج بھی سجا سجایا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

سچائی کچھ تو وہ ہوتی ہے جسے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے یا دنیا اسے سچائی بناتی ہے مگر وہ اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ یہ مجبوری ہے۔ لیکن وہ شخص مجبور نہیں ہے جس کے دل میں سچائی ہو، جس نے کچھ مشاہدہ کیا ہو، لیکن مشاہدہ سے زیادہ اس کا دل خود بڑی سچائی کا مرکز ہوتا ہے۔ دل کبھی مان لے، یہ بہت مشکل کام ہے۔ بلکہ ناممکن کام ہے۔ دماغ ماؤف ہو سکتا ہے، فکر مرعوب ہو سکتی ہے، لیکن دل مرعوب نہیں ہوتا۔ کچھ سچائیاں انسان دل میں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا اپنا نظریہ ہے، اپنا عقیدہ ہے۔ اور اپنا مخصوص مشاہدہ ہے۔ دل ان تمام قوتوں سے بھرپور ہے۔ ان اسلحوں سے آراستہ اور مسلح ہے۔ دل خدا کا گھر ہے جیسے خدا یقین ہی کی پونجی ہے، اس لیے انسان کا مجموعی یقین خود اس کے دل کی پیداوار ہے۔ حضرت امام غزالی

فرماتے ہیں کہ شیطان نے ایک دن مجھ سے مناظرہ کیا، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ خدا نہیں ہے۔ میں نے اسے ایک دلیل دی۔ شیطان نے اس دلیل کو اپنی دلیل سے رد کر دیا۔ میں نے دوسری دی، اسے بھی اس نے اپنی دلیل سے رد کر دیا۔ اس طرح میں نے تین سو ننانوے دلیلیں خدا کے وجود کی دیں۔ شیطان نے ان سب کو اپنی دلیل سے رد کر دیا۔ تو میں نے آخری دلیل دی کہ میں خدا کو بے دلیل مانتا ہوں۔ شیطان اس کو رد نہ کر سکا۔ تو دل، دلیل جانتا بھی ہے مگر ضروری نہیں ہے کہ اس کی پونجی دلیل کی تابع ہو۔ وہ خود بادشاہ ہے اور خود سب سے بڑا صاحب دلیل ہے۔ تو میرے دل نے مشاہدے، تجربے اور اپنے عقیدے کی بنیاد پر جو تصور، جو نظریہ اپنایا ہے، وہ غیر متزلزل ہے۔ اسے کوئی ہلا نہیں سکتا۔ اسے کوئی مرعوب نہیں کر سکتا۔ دل کسی کے رعب میں نہیں آ سکتا۔ میں جو سوچتی ہوں اپنے دل کی آنکھوں سے جو دیکھتی ہوں، جو پرکھتی ہوں، جو جانچتی ہوں، وہ حرفِ آخر ہے۔ وہی سچ ہے۔ اس کے علاوہ میں اور کوئی سچائی نہیں جانتی۔ دنیا کی تمام شاعری، بلکہ تمام فنونِ لطیفہ کا انحصار تصور اور تخیل پر ہی ہے۔ تصور، تخیل کی ماں ہے۔ تصور ہی ہر آرٹ کا خالق ہے۔ تصور چاند ہے جو تمام بادلوں کے نرغے میں آ جاتا ہے، پھر صاف چمک دار نمایاں ہو جاتا ہے۔ ہر بادل کے بعد اس کی چمک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تصور جب حالات کے نرغے میں آتا ہے تو بظاہر اس پر اندھیرے سے چھانے لگتے ہیں۔ مگر جس طرح بارش ہر پھول، ہر غنچے، ہر پتے کو اور صاف، رنگین اور آب دار بنا دیتی ہے، تصور کی برگ دار سے ابھر آتا ہے، ہر طوفان سے تحت مند نکل آتا ہے اور سیلاب سے تازہ اور توانا برآمد ہوتا ہے۔ تصور ہمالہ پہاڑ ہے جس پر ہو کے آتش فشاں بھی گزرتا ہے، سالہا سال برف کا سیلاب برف کا سمندر اسے ڈھانکے رہتا ہے مگر آتش فشاں ختم ہو جاتا ہے۔ برف کا سیلاب اپنی دبوچ سے نہ اسے فنا کر سکتا ہے، نہ کمزور۔ ہمالہ قائم ہے، سیلاب اور طوفان گزرتے رہتے ہیں۔ میں اسی تصور کی مالک ہوں جس سے حالات کے سیلاب گزرتے رہتے ہیں۔ بے یقینی کا ماحول چھا جاتا ہے اور پھر چھٹ جاتا ہے۔ بادل آتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ چاند پر کوئی نقش نہیں بٹھا سکتے۔ اس کا کوئی نقش مدھم نہیں کر سکتے۔ زندگی کا تصور لافانی ہے اور تمام حالات فانی اور گزراں ہیں۔

☆☆☆

(۷)

ایک گلاب کے پودے کے لیے میں ایسی بے چین ہو جاؤں گی یہ میں نے سوچا تک نہ تھا کہ ایک پودا ہی تو تھا جو کسی بھی نرسری سے تھوڑے ہی پیسوں میں بہ آسانی خریدا جا سکتا تھا۔ میں روز شام کو اس ننھے سے پودے کی جڑ میں پانی ڈالتی اور پھر اس کی پتیوں پر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کرتی۔ دن بھر کی تپش کو سہہ کر وہ ننھا پودا جیسے میرا منھ تکنے لگتا اور میں اسے مسکرا مسکرا کر ٹھنڈے پانی سے نہلاتی، اسے شاداب کرتی، تو چند منٹوں میں ہی وہ پودا تر و تازہ ہو جاتا۔ ابا اور امی کے انگلینڈ جانے سے پہلے میں نے اس پودے میں ایک بہت ہی خوبصورت سا سفید گلاب کھلا ہوا دیکھا تھا۔ وہ پھول اس قدر خوبصورت تھا اور اتنے بڑے سائز کا تھا کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ میں امی اور ابا کی باغبانی پر بس ایک سرسری نظر ہی ڈالتی تھی، اس گلاب کو دیکھ کر اس دن چونک گئی تھی۔ اس گلاب نے وہیں پر مجھے روک لیا تھا اور جیسے مسکرا کر کہہ رہا ہو، ''آؤ اور میرا حسن دیکھو! میرے پیدا کرنے والے کی تعریف کرو! میری جڑوں کی جو دیکھ ریکھ کرتا ہے، اس کی تعریف کرو! میرے اندر کی پتیوں کے پیچ و خم کی، ان کی لچک، ان کی خوشبو کی تعریف کرو!'' اور میں...... میں تو سچ مچ اس گلاب کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

ابا اور امی جب انگلینڈ، امریکہ اور کناڈا کے ٹور پر نکلے تھے تو جاتے وقت پٹنہ اسٹیشن پر میرے قریب آئے، مجھے گلے سے لگایا اور آہستہ سے بولے، ''پودوں کی بہت حفاظت کرنا انجم...... خاص کر اس سفید گلاب کے پودے کی۔ دیکھو اس گلاب کی جڑ میں یاد سے روز پانی ڈالنا۔ کبھی کبھی گلاب کے چاروں طرف کی مٹی کو گوڑ کر ذرا ہلکی کر لینا اور ہمیشہ جڑ کے چاروں طرف پانی ڈالنا'' وغیرہ وغیرہ۔ میں جو کہ سر سے پاؤں تک اسٹیشن پر امی اور ابا کی جدائی کے تصور سے کانپ رہی تھی،

بے جان ہو رہی تھی، آنسوؤں کی نہ رکنے والی لڑیوں سے الجھی الجھی تھی۔ ابا اور امی کی ہر کہی ہوئی بات پر بغیر سوچے سمجھے ''جی جی'' کیے جا رہی تھی۔ میرے دل میں جیسے ایک ہول سا تھا۔ امی میری کیفیت کو بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ ماں جس قدر اپنے بال بچوں کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ بار بار امی میرے بہت قریب آتیں اور کہتیں، ''اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ سبھی لوگوں کے ماں باپ ادھر اُدھر گھومنے پھرنے جاتے ہیں نا؟ کیا کہتی ہو نہ جائیں؟'' ''نہیں نہیں، امی آپ ضرور جائیں۔ مگر میں آپ لوگوں کے بغیر کیسے رہوں گی؟ یہ چھ ماہ میرے کس طرح کٹیں گے امی؟'' امی کے سمجھانے کے بعد خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

برداشت کرنے کی کسی نے کوئی بھی ٹریننگ نہیں دی تھی اور شاید اس کی کوئی ٹریننگ ہوتی بھی نہیں ہے۔ وہ تو اللہ کی دین ہے جو وہ کسی کسی کو دیتا ہے۔ میں نے اس وقت بہت برداشت کیا۔ دل کی اس وقت جو کیفیت ہو رہی تھی، اس پر قابو پا کر خود کو سمجھایا اور پھر زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ خاموشی سے ان دونوں کو ٹرین پر چڑھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ امی اندر ٹرین میں جا کر بیٹھ چکی تھیں۔ ابا ٹرین کے دروازے پر کھڑے تھے اور مجھے بے بسی کی حالت میں کھڑا دیکھ رہے تھے۔ ٹرین نے زور کی سیٹی بجائی اور ادھر میرا دل کانپ گیا۔ بہت ہی آہستہ آہستہ ٹرین چلنے لگی اور میں بے بس سی، اپنے ہی شہر میں جیسے بے سروسامان سی، دلگیری سی، کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس وقت بس دل یہی چاہ رہا تھا کہ کیسے ان دونوں کو روک لیں اور کسی طرح سے نہ جانے دیں۔ مگر اس چلتی ہوئی ٹرین پر ابا کا سراپا چھوٹا ہوتا گیا اور پھر وہ اتنی دور چلے گئے کہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں اپنے چچا یعنی چھوٹے ابا (سیّد عبدالمجید) کے بازو کو پکڑے پکڑے اسٹیشن پر نڈھال سی چلتی رہی۔ وہ نہ جانے مجھے کیا کچھ سمجھاتے رہے۔ میں وہی ''جی جی'' کرتی رہی اور اسٹیشن سے باہر کار تک پہنچ گئی۔ گھر واپس آ کر برآمدے کی چوکی پر بہت ہی بے دم سی ہو کر بیٹھی رہی۔ امی اور ابا کے بارے میں سوچتی رہی۔ ابا کی ثقیل اردو کو یاد کرتی رہی۔ ''دیکھو، انجم ذرا میرے جوتے میں پالش لگا دینا۔'' پھر اپنے ہاتھ میں جوتے کو لے کر سمجھایا، ''ادھر لگانا، اُدھر لگانا۔ خصوصاً یہاں پر ضرور لگانا۔''

فٹ بال کا میچ دیکھ کر آئے تو پوچھا، ''کیسا میچ تھا ابا؟'' تو بولے، ''ارے میچ کیا دیکھا، صابن کھایا!'' ''امی، ابا کیا بول رہے ہیں؟ وہاں سے صابن کیوں کھا کر ابا آ گئے؟'' امی صرف ہنستی رہیں۔

بڑے بھیا کو شکار کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ہمیشہ ہرن یا نیل کے شکار پر جاتے تھے۔ جب بھی وہ شکار پر جانے

لگتے تو ابا ضرور پکار کر کہتے: "ارے بھائی، نیل تو لاؤ گے ہی، مگر اس کا قلب بھی ضرور لانا۔" یہ سب سن کر ہم لوگ بے تحاشہ ہنستے۔

ابا کی چھوٹی سی نوکری میں بھی بہن بے حد خوش وخوشحال رہتے تھے۔ گھر کا انتظام امی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ آج تک ہمارے رشتہ دار، دوست، احباب، عدالت گنج اور اس کے حسین ماحول کو یاد کر کے خوش ہوتے ہیں، اور ان دنوں کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ اپنی جگہ پر وہ ایک چھوٹی سی جنت تھی۔ اس کوارٹر میں دادیہال اور ننیہال دونوں طرف کے لوگ آتے تھے۔ وہ جگہ پٹنہ اسٹیشن سے بہت قریب تھی، اس لیے لوگوں کا ہم لوگوں کے گھر پر آنا جانا بھی بہت آسان تھا۔ ابا اور امی ہمیشہ ریل گاڑی کا وقت دیکھ کر دسترخوان پر کھانا چنواتے تھے کہ شاید کوئی آ جائے۔ کوئی ایک دن، کوئی دو دن، کوئی ہفتوں کے لیے اور اگر کوئی علاج کروانے کو آتا تو پھر مہینوں کے لیے ہی۔

ابا زیادہ تر خاموش رہتے، اور اگر کچھ بولتے تو بہت ہی ٹھوس بات کہتے۔ ان کو دنیا کی گہما گہمی سے زیادہ مطلب نہیں تھا۔ سبزی اور پھل کا کثرت سے استعمال کرتے۔ ہمیشہ ان کی زبان سے یہی سنا کہ: "سبزی اور پھل کھاؤ، اس سے یہ فائدہ ہے، وہ فائدہ ہے۔"

میرے ابا پیشے سے تو وکیل تھے مگر اردو، فارسی اور انگریزی پر پوری دسترس حاصل تھی۔ اردو اور فارسی مجھے ابا ہی نے پڑھایا۔ کسی بھی شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تو ابا اسے بہ آسانی سمجھا دیتے تھے۔ گھر کے سبھی لوگ ابا سے اردو، فارسی اور انگریزی پڑھ لیتے تھے۔

امی اور ابا کی یادیں، ان کی باتیں، میں ان دو جڑی چوکیوں پر بیٹھی بیٹھی سوچتی رہی۔ آنگن کے ایک کونے میں انار کا درخت سر اٹھائے کھڑا تھا جس پر گزرتے لمحوں نے نہ جانے کتنی باتیں لکھ چھوڑی تھیں۔ وہ بھی میری طرف بے بسی سے تک رہا تھا اور ان بے رحم ساعتوں سے نظریں چرا کر خود اپنا نوحہ گر بنا ہوا تھا۔

میں اسی برآمدے میں کافی دیر تک بیٹھی رہی۔ سورج آہستہ آہستہ پچھم کی دیوار کا سہارا لیتا ہوا آنگن میں اتر رہا تھا۔ میرے آگے سناٹا تھا، مگر آج سناٹا بے زبان نہیں تھا۔ امی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ابا اپنے مخصوص انداز میں کہے جا رہے تھے، "ابھی نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی بہت گرمی ہے۔ ابھی کمرے کے اندر ہی رہو...... چلو یہ کتاب پڑھ لو، ایک کوئی مضمون ہی لکھ لو، وقت کٹ جائے گا۔"

گرمی کے زمانے میں ہم لوگوں کے گھر کا صرف ایک کمرہ بہت ٹھنڈا رہتا تھا۔ اسی ٹھنڈے کمرے میں ابا مسہری پر سوتے تھے اور دن کے قریب بارہ بجے، جس وقت گرمی اپنے پورے شباب پر ہوتی، ہم لوگ اس کمرے کی زمین کو پہلے ٹھنڈے پانی سے پوچھا لگاتے اور اپنے اپنے کمرے سے آ کر زمین پر ہی بستر لگاتے اور ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر دوپہر کے کھانے کے بعد سو جاتے۔ وہ دوپہریں بھی بے حد لمبی ہوتی تھیں۔ طرح طرح کی گپیں، لطیفے، سلائی، کشیدہ کاری، چمکی اور گوٹے کے کام، ڈرائنگ، پینٹنگ سب کچھ اسی کمرے کے فرش پر ہوتا تھا۔ دماغ میں بس یہی ساری چیزیں بسی رہتی تھیں۔ روز نئے نئے ڈیزائن، رنگ اور دھاگوں میں الجھی رہتی تھی، اس لیے دماغ بھی ان ہی ریشم جیسے رنگین دھاگوں میں، نقش و نگاری میں اور رنگوں میں رنگا رہتا تھا۔

شام جب قریب آتی تو ابا سے کمرے کے باہر جانے کی اجازت مانگتے، مگر ابا تو جلدی اجازت ہی نہ دیتے اور وقت...... وقت تو جیسے کٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ بڑی بڑی مشکلوں سے پانچ ساڑھے پانچ بجے کمرے سے نکلنے کی اجازت ملتی۔ پھر ہم لوگ گھر کا کونا کونا ٹھنڈے پانی سے بھگوتے۔ برآمدے اور آنگن کی کھلی فضا میں نکل کر خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ پھر ابا اور امی دونوں مل کر باہر کے ایک ایک گرد آلودہ درختوں کو پانی سے دھوتے اور یہ قریب قریب ہر روز ہی کا معمول رہتا۔

دونوں روز صبح سویرے اٹھتے۔ صبح کے پانچ بجے جو کہ ہم لوگوں کے لیے آدھی رات ہوتی تھی۔ پہلے نماز پڑھتے، پھر چائے بنتی۔ رات میں ہی بوا (کام کرنے والی) آنگور نکالا ہوا چنا بھیگے کپڑے میں لپیٹ کر ناشتے کے ٹیبل پر رکھ دیتیں اور ساتھ میں گھر کا پھلا ہوا کھیرا، پپیتا اور امرود بھی ہوتا۔ یہ پہلا ناشتہ باغ میں جانے کے قبل کا ہوتا۔ اس ناشتے کی خبر ہم لوگوں کو کبھی نہیں ہوئی، اس لیے کہ اس وقت ہم سبھی محوِ خواب ہوتے تھے۔ ناشتے کے بعد دونوں باغ میں جاتے اور ساتھ میں زمین کوڑنے کا سارا سامان یعنی کھرپی وغیرہ سب ساتھ ہوتی۔ باغ میں جانے کا کپڑا اور جوتا، دونوں کا الگ الگ ہوتا تھا۔ صبح سے لے کر دس بجے دن تک یہ لوگ باغ میں ہوتے اور باغبانی کرتے۔ جب تک جسم میں صبح کے دھوپ کی چن چنی نہ اُترنے لگتی، یہ لوگ باغ میں ہی رہتے تھے۔ پھر قسم قسم کے پھل پھول اور سبزیوں سے لدے پھندے یہ دونوں گھر میں داخل ہوتے۔ سبھی کو پکارتے، سب کو نیند سے جگاتے۔ اس کے بعد دوسرے ناشتے کی تیاریاں شروع ہوتیں۔ یعنی آلو کی بھجیا، روٹی، انڈے کا آملیٹ اور امرود کی جیلی والا ناشتہ۔ یہ ناشتہ ہم سب لوگ ایک ساتھ کرتے۔ اس وقت اس ناشتے سے

اچھی خاصی کوفت ہوتی تھی۔ میں اکثر امی سے پوچھتی، ''امی اس بھیگے روٹی کا ناشتہ کس نے ایجاد کیا تھا؟'' اور اب...... اب تو اسی ناشتے کو ترستی ہوں۔ اسی ہنگامے، اسی منظر کے لیے بے قرار رہتی ہوں۔ ابا کھانے پینے پر ہمیشہ ایک بار ضرور لیکچر دیتے تھے، خاص کر ابا جب یہ کہتے تھے، ''کریلا کھایا کرو یہ بہت ہی زیادہ مفید سبزی ہے۔ اس سے خون صاف ہوتا ہے۔'' اور ہم لوگ یہ سب سن کر منھ چھپا چھپا کر ہنستے تھے۔ دل ہی دل میں سوچتے تھے، یا اللہ میرے ابا کو کہاں سے ایسی ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے اور یہی سوچتے، یہ کریلا بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ کڑوا...... ایسا کڑوا کہ جان نکل جائے۔ جب میں لندن آئی تو ایک دن زمانے کے بعد ٹی وی کے ایک پروگرام Nation Wide پر دکھایا جا رہا تھا کہ کریلا ضرور کھاؤ، یہ ہندوستانی دکان میں ملتا ہے اور یہ diabetic لوگوں کے لیے خاصا مفید ہے۔ میں یہ سن کر دنگ رہ گئی۔ مجھے اپنے ابا کی ہر کہی ہوئی بات کا یقین تھا مگر صرف انہی کریلا کے بارے میں مجھے کبھی یقین نہ آتا تھا۔ آج میں نے دل ہی دل میں اس پروگرام کو دیکھ کر ابا کے حضور سر خم کر دیا تھا۔

میں ان ہی سارے خیالات کے ساتھ برآمدے کی چوکی پر بیٹھی رہی۔ گرچہ وہ یادیں گلوں کی صورت میرے ارد گرد خوشبو بن کر مہکتی رہیں۔ میرے آگے پیچھے ناچتی رہیں، مگر اس وقت میں نڈھال ہی سی رہی۔ کسی سے ایک گلاس پانی مانگا اور پانی پی کر اپنے اندر کچھ طاقت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ گھر کی ساری چیزوں کو حسرت سے دیکھتی رہی۔ امی اور ابا کے بغیر آنگن اور برآمدے کی ہر شے اپنی کشش کھو چکی تھی۔ لیکن وہی بے رنگ، بے نور چیزیں، جن پر ان دونوں کی یادوں کے سو سو نقش موجود تھے۔ مجھے امی اور ابا کی اور بھی یاد دلاتی رہیں۔ میں اس جگہ یعنی اپنے گھر کے کونے کونے میں پھرتی رہی۔ پھر مجھے ایسا کرنے میں سکون ملنے لگا۔ میں اپنے دل کو اور بھی سکون پہنچانے کے لیے ہلکے ہلکے گرد و غبار کو سب چیزوں پر سے صاف کرنے لگی۔ وہ پورا دن میں نے جیسے تیسے گزارا اور مغرب ہوتے ہی اپنے ماں باپ کو تصور میں لا کر ان کی آغوش میں سو گئی۔ دل اور دماغ پر کچھ اس قدر بوجھ تھا کہ میں اسی تکان سے گہری نیند میں چلی گئی۔

صبح سویرے نیند ٹوٹی۔ وہی چڑیوں کی چہچہاہٹ، مرغے کی بانگ، نل سے گرتے ہوئے تھوڑے تھوڑے پانی کی آواز، جسے کھول کر رات میں بالٹی میں چھوڑ دیا جاتا تھا، کانوں میں آتی رہی۔ اس کے دو تین منٹ کے بعد یاد آیا کہ امی اور ابا یہاں نہیں ہیں۔ اٹھتے ہی مجھے اس سفید گلاب کا خیال آیا۔ میں فوراً کھڑی ہوگئی۔ جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اس گلاب میں

پانی ڈالنے کو باغ میں گئی۔ اور پھر اس دن کے بعد سے صبح اٹھتے ہی روز گلاب کی جڑ میں پانی ڈالتی رہی۔ اور پھر یہ میرا معمول بن گیا کہ روز صبح میں اٹھ کر ابا اور امی کے لگائے ہوئے پودوں کو شاداب کرتی، تب کہیں جا کر کسی دوسرے کام کو شروع کرتی۔ دو چار روز کے بعد اسی طرح ایک دن میں نے اس سفید گلاب کی جڑ میں پانی ڈالنے کے لیے ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ دیکھا کہ وہ سفید گلاب کا پودا بالکل جڑ سے ہی غائب ہے۔ دل سن سے ہو گیا۔ ادھر اُدھر بے چینی سے دیکھنے لگی۔ شام کو جا کر پتہ چلا کہ پروفیسر حسن عسکری جو کہ ہم لوگوں کے ہی محلے میں رہتے تھے، ان کے گھر کا ایک نوکر اس گلاب کو جڑ سے اکھاڑ کر لے بھاگا ہے۔ خدا جانے یہ بات کہاں تک سچ تھی۔ میرے دل کا کیا پوچھنا تھا۔ نڈھال ہو گیا، جیسے بالکل بے دم ہو گئی۔ ابا کی غیر موجودگی میں ان کے گلاب کے پیڑ کا اس طرح غائب ہو جانا بس قدرت کا فیصلہ تھا۔ میں نے یہی سوچ کر اس حادثے کو قبول کر لیا تھا۔ گرچہ میں کئی دن تک اداس رہی مگر آہستہ آہستہ اپنے دل کو سمجھاتی رہی۔ کبھی کبھی یہ خیال بے چین کر ہی دیتا تھا کہ ابا کو اب کیا جواب دیں گے۔

وقت گزرتا گیا۔ ابا کے واپس آنے کے دن بھی قریب آ رہے تھے۔ میں نے بھی اس گھر میں امی اور ابا کے بغیر جینا سیکھ لیا تھا۔ صباح (میرے شوہر) بھی ان ہی دنوں ایک سال کے لیے پٹنہ میں میڈیکل کی آگے کی پڑھائی پڑھ رہے تھے۔ ویسے بھی ابا اور امی کی واپسی تک تو مجھے پٹنہ میں رہنا ہی تھا۔

تھوڑا بہت اب گھر کو سجانے لگی۔ آنگن کے چھوٹے درختوں کو چھانٹنا، گملوں کو گیروے رنگ سے پینٹ کر کے سارے پودوں کو پانی کی پھواروں سے روز شاداب کرتی۔ چلو، سفید گلاب کا پودا نہ سہی، مگر باقی درختوں کی شادابی کو دیکھ کر تو ابا خوش ہوں گے۔

ابا کا خط آیا تو پتہ چلا کہ وہ ہندوستان واپس آنے کے قبل ہی حج پر جانا چاہتے ہیں اور اس کے بعد وہ ہندوستان واپس آئیں گے۔ پندرہ دن کی اور بات تھی۔ ابا اب حج کرنے کو روانہ ہو گئے۔ یہ پندرہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ جہاں ان لوگوں کے بغیر اتنے دن گزار ڈالے، چند روز اور سہی۔ دو تین ہفتے سے پھر نہ ابا کا، نہ امی کا کوئی خط ملا۔ بس وہی ایک خط کناڈا سے چلتے وقت ملا تھا کہ اب ہم لوگ کناڈا سے سعودی عرب کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ اور بڑے بھیا کا ایک خط South Wales, U.K. سے آیا تھا کہ "امی اور ابا مکہ معظمہ پہنچ گئے ہیں اور قریب پندرہ دنوں میں وہ لوگ تمہارے پاس ہوں گے۔" اس خبر سے میں بے حد خوش ہوئی کہ میرے ماں باپ اس وقت اس سرزمین پر ہیں جہاں جانے کے لیے

دونوں ہی بے حد بے چین رہتے تھے۔ اور پھر میں اپنے تصور میں دونوں کو لا کر سوچنے لگی کہ اللہ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ابا نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی ہوگی۔ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں نمازیں ادا کی ہوں گی۔ روضۂ پاک کی زیارت کی ہوگی۔ یہ سب سوچ سوچ کر میں خوش ہوتی اور ان لوگوں کی قسمت پر رشک بھی کرتی رہی۔ چلو اس ٹرپ میں حج بھی ہو گیا اور دنیا بھی دیکھ آئے۔ ان ہی پندرہ دنوں کے دوران میں نے کئی خواب دیکھے جن کو دیکھ کر میں تھوڑی پریشان رہتی تھی۔

ایک شام گھر میں کچھ گہما گہمی نظر آئی۔ کاشانہ سبزی باغ سے ڈاکٹر شفیق ماموں (مرحوم) کی بیگم یعنی ممانی جان بھی آئی ہوئی تھیں۔ رات میں میرے گھر آ کر کافی دیر تک ہم سے باتیں کرتی رہیں۔ دس بجے کے قریب ہر کوئی اپنے اپنے بستر پر چلا گیا۔ میں بھی جلدی ہی سو گئی۔ اسی دن خواب میں دیکھا کہ میں ایک شادی میں گئی ہوئی ہوں، جہاں ہزاروں لوگوں کا مجمع ہے اور مجھے کوئی آ کر کہہ رہا ہے کہ تم یہاں ہو؟ اور تمھارے ابا ہسپتال میں ہیں۔ میں اسے بے قراری میں دوڑی دوڑی ہسپتال چلی گئی۔ وہاں پہنچی تو دیکھا کہ ابا ایک پلنگ پر بالکل بیمار لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے سرہانے کیتلی میں پانی کھول رہا ہے۔ اس کیتلی کی ٹونٹی سے پانی کس طرح کھول کھول کر گر رہا تھا، اس کی گرمی کو میں اب تک محسوس کر رہی ہوں۔ میں اپنے ابا کے سینے سے لگ گئی، اور کہنے لگی، ''ابا آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ آپ اتنے بیمار ہیں؟'' اس وقت مجھے ابا کے پاس بے حد سکون مل رہا تھا۔ میں کبھی ان کی پیشانی پر بوسے دیتی، کبھی ان کا ہاتھ سہلاتی۔ ان کے پلنگ سے لگ کر میں زمین پر بیٹھی انھیں دیکھتی رہی، باتیں کرتی رہی، روتی رہی۔ یک بیک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھے پکار کر کہا، ''آپ کا فون آیا ہے۔'' میں یک دم اپنے خواب سے بیدار ہو گئی۔ اللہ کا شکر ہے یہ خواب ہی تھا۔ یہی سوچتی ہوئی میں اٹھی اور اپنی آنکھوں کو ملتے ہوئے فون کے قریب پہنچی۔ فون کے پاس ہی چند کرسیاں تھیں جن پر چھوٹے ابا، بڑی اماں، ممانی جان اور گھر کے کچھ اور لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔ فون اٹھایا تو میری بھابھی کی امی کی آواز آئی، ''ہیلو انجم، کیسی ہو؟ آج کا اخبار دیکھا تم نے؟'' میں نے جواب دیا، ''میں تو سوئی ہوئی تھی۔ ابھی تو اخبار نہیں دیکھا ہے۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''چچا کے بارے میں تم کو خبر ہو گئی؟''

میں نے کہا، ''کیا خبر، کیسی خبر؟''

پھر میں بہت ہی بے قرار ہو کر چھوٹے ابا کی طرف دیکھنے لگی۔ چھوٹے ابا میرے قریب آئے اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا، ''کیا ہوا چھوٹے ابا؟''

انھوں نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا کہ بھائی صاحب کا انتقال ٹھیک حج کے بعد مکہ معظمہ میں ہو گیا۔

میرے پیروں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ چکرا کر وہیں مسہری پر بیٹھ گئی۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آنے لگا۔ جیسے میرے ہاتھ سے کوئی شیشہ گر کر چور چور ہو گیا۔ میرے اندر کی ساری خوشیاں یک لخت میرے سامنے بکھر گئیں۔ ایک سیکنڈ میں جیسے میری دنیا بدل گئی۔ اتنی شدت کی تکلف ہوئی کہ جیسے میں وہیں پہ بیٹھی بیٹھی پگھلنے لگی۔ ابا ہمیشہ کے لیے ہم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ لوگ مر بھی جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے...... ہاں سنا تھا کہ انسان مر جاتا ہے ایک نہ ایک دن، مگر ابا بھی کبھی ہمیں ایسے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس طرح سے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سارے لوگ میرے قریب آگئے تھے۔ میں بے حال و پریشان ہو کر روتی ہی جا رہی تھی۔ میرے سارے بھائی بہن وطن سے باہر تھے۔ صرف میں ہی پٹنہ میں تھی۔ سارے لوگ، رشتہ دار ہم سے ہی ملنے کو آتے۔ سب کے پاس غم سے چور اپنے آپ کو اٹھا کر لے جاتی۔ کوئی سر پر ہاتھ رکھتا، کوئی سینے سے لگاتا۔ لوگ صبر کی تلقین کی ہدایت دے کر روانہ ہو جاتے۔ اور وہ وقت ایسا تھا کہ صبر مجھ سے میلوں دور تھا۔ پتہ بھی نہیں تھا کہ صبر کیسے آتا ہے۔ اور صبر کیسے کیا جاتا ہے۔ یہ سب مجھے محاورے کی باتیں لگتیں، کتابی باتیں لگتیں۔

مجھے رہ رہ کے وہ سفید گلاب یاد آتا رہا۔ اسی سفید گلاب کی طرح یک بیک جیسے کوئی میرے ابا کو بھی مجھ سے چھین کر لے گیا۔ اور میں بے بسی سے، اپنی خالی نظروں سے، اِدھر اُدھر دیکھتی رہ گئی۔ وہ لمحہ ایسا تھا جس وقت دل اور دماغ جیسے منتشر سا تھا، اتنا منتشر کہ ابا کے قرب کے لمحات بھی جلدی جلدی ذہن کے پردے پر نہیں آرہے تھے۔ کسی کی یادوں سے ربط قائم کرنے کے لیے بھی ایک سکون چاہیے۔ مگر یہاں تو دل ایسا بے چین ہو رہا تھا جیسے اسے کبھی چین ہی نہیں ملے گا۔ جس طرح گلاب کے چلے جانے کے بعد کچھ بھی نہ پتہ لگا یا۔ قدرت کے فیصلے پر سر خم کر دیا، اسی طرح ابا کی موت کی خبر سن کر کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیسے ختم ہو گئے۔ کون سی یک بیک ایسی بیماری ہو گئی۔ بس اللہ کا حکم ہوا اور ابا ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اور میرا دل میرے ابا کے وجود کی ایک تصویر بن کر رہ گیا۔

امی جدہ میں اپنے گروپ کے ساتھ تھیں اور اتنے بڑے غم کے بوجھ کو تنہا اٹھائے پھر رہی تھیں۔ چھ بال بچوں میں ایک بھی ان کے ساتھ نہ تھا۔ وہاں انھوں نے بہت ہمت سے کام لیا۔ دل و دماغ غم سے چور چور تھے، مگر خود کو سنبھالے رہیں۔ دو چار روز کے بعد بڑے بھیا انگلینڈ سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے اور امی کو پٹنہ واپس لانے کے لیے سعودی عرب پہنچ گئے۔ بڑے بھیا کو دیکھ کر امی کو بے پناہ سہارا ملا۔ پھر چند دنوں میں ہی امی جدہ سے بھیا کے ساتھ پٹنہ پہنچ گئیں۔

سارے رشتہ دار اور دوست امڈ پڑے۔ غم اور خوشی میں جس طرح لوگ آجاتے ہیں، دونوں ہی حالات میں وقتی رونق تو ہو ہی جاتی ہے۔ گھر لوگوں سے اٹا پڑا تھا مگر میں بالکل تنہا سی ادھر اُدھر چلتی پھرتی رہی۔ امی کو دیکھ کر کسی حد تک سکون ملا تھا مگر میں نہ جانے کتنے دنوں تک دالان، آنگن اور کمروں میں بے ارادہ چلتی رہی۔ میں نے کناڈا امی کو کئی خطوط روانہ کیے تھے اور ہر خط میں یہ تاکید ضرور کرتی تھی کہ امی، آپ بیت اللہ شریف کے صحن میں جب طواف کے لیے جایئے گا تو حرم پاک کو چوم کر حضورِ خداوندی میں آپ دونوں حاضری کے لیے جایئے گا تو ابا کو کمزوروں کے لیے مخصوص ڈولی / وھیل چیئر میں لے جایئے گا اور پھر اسی سے ان کو طواف بھی کروایئے گا۔ مجھے دل ہی دل میں ابا کی بہت فکر رہتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ابا بہت کمزور ہیں اور خاص کر بھیڑ بھاڑ میں وہ کہیں خود کو سنبھال ہی نہ پائیں۔ کہیں ادھر اُدھر نہ ہو جائیں۔ طرح طرح کے خیالات سے میرا دل پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ مگر میں جیسے دم سادھے ہوئے پٹنہ کے مکان میں ان پندرہ دنوں کو کاٹ رہی تھی۔

ابا کی موت کو کئی بار خواب میں دیکھ چکی تھی، مگر خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے ان خوابوں کو دیکھتے ہوئے بھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ میرے ابا سچ مچ ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جائیں گے۔ اس پاک سرزمین کو پسند کر لیں گے جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن تھا، ان کا سایہ تھا۔ اس سرزمین پر آپؐ کے قدموں کے کبھی نشان تھے، وہاں کی خاک نے آپؐ کے قدموں کو چوما تھا، اس سرزمین پر ہی آپؐ کے منھ مبارک سے نکلی ہوئی باتیں، وہاں کی ہواہیں، فضا میں لہرائی تھیں۔ وہی تو اللہ کا گھر ہے اور اسی سرزمین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں۔ ان کی خوش نصیبی پر سارے لوگ عش عش کر رہے تھے۔ میں بھی کر رہی تھی مگر مجھ سے میرے ابا کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت تو ایسا ہی لگتا تھا کہ مجھے تو شاید کبھی صبر نہیں آئے گا اور واقعی ایک حد تک صبر آنے میں بہت دیر لگی۔

ابا کی شفقت اور خاموشی سے محبت کرنے کا انداز بہت ہی نرالا تھا۔ زندگی میں کبھی بھی انھوں نے ہم لوگوں کو بیٹا کہہ کر نہیں پکارا۔ کبھی بھی ارادتاً گلے نہیں لگایا۔ یہ سارا کام ان کی بس نظریں کرتی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ہم سبھی بھائی بہن کو ان کی نظروں کو پڑھنے کا ہنر سکھا دیا تھا۔

۱۹۹۵ء میں جب میں مکہ معظمہ گئی تو جنت المعلا جو کہ خانہ کعبہ سے چند قدموں پر ہے، وہاں اپنے ابا کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئی۔ قبرستان میں خاص کر عورتوں کا داخلہ منع ہے، اس لیے میں نے اس قبرستان کے گیٹ پر کھڑی کھڑی اپنے ابا کے لیے فاتحہ پڑھا۔ آنسوؤں سے وہاں کی خاک کو بھگوتی رہی۔ ابا کی شکل، ان کا سراپا، ان کے بات کرنے کا نرم لہجہ مجھ

سے آملا۔ زندگی میں تو کبھی گلے نہیں لگایا، مگر اس وقت ایسے لگا جیسے ابا مجھے اپنے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہوں...... تم آئی ہو بیٹی...... اس طرح بغیر خبر کیے ہوئے وہیں رُک جانے سے جیسے انھیں بھی خبر تھی کہ میرے بچوں پر کیا بیتی ہوگی۔ اور آج...... آج تو میں اسی در پر پہنچ گئی تھی جہاں انھوں نے ٹھہر جانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ وہی جنت المالا جہاں حضرت خدیجہؓ آرام فرما ہیں اور نہ جانے کیسی کیسی شاندار ہستیاں آرام فرما ہیں۔ وہی جگہ اللہ تعالیٰ نے میرے ابا کے لیے چُن رکھا تھا۔ جہاں خانہ کعبہ کے چاروں طرف طواف کرتے وقت کی دعائیں، فرشتوں کے جھومنے اور گانے کی آوازیں آتی ہوں گی۔ الحمدُ للہ! جہاں قبر کی شکل کا کوئی تابوت بنا ہوا نہیں تھا۔ ہر جگہ پر برابر زمین تھی، کسی کی بھی قبر کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ہر انسان ایک جیسا تھا، نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا۔ یعنی نہ امیر نہ غریب۔ سب ایک جیسے تھے۔ تھکی تھکی آنکھوں کو جو بار بار پیمانوں کی طرح چھلک رہی تھیں، انھیں سنبھالے ہوئے، محبت کے اس تجربے کو سمیٹے ہوئے آخر مجھے اس پھاٹک سے مڑ کر واپس آنا پڑا۔ اپنے ابا کو چھوڑ کر اللہ کے حوالے کر کے آنا پڑا۔ کاش میں تھوڑی دیر اور رُک سکتی! مگر کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔

ابا جب انگلینڈ جا رہے تھے اور میں ان کو رخصت کرنے کے لیے پٹنہ اسٹیشن پر گئی تھی تو اس وقت کے منظر کو، ابا کی ہر حرکت کو، وہ جو کچھ بھی بولے تھے، کس طرح مجھے گلے لگایا تھا، وہ سب کچھ اپنی نظروں میں محفوظ کر چکی تھی اور وہ سب کچھ آج تک اسی طرح محفوظ ہے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، ہر وقت ان کو اپنی آنکھوں میں بند کر کے اپنے سینے سے لگائے رہتی تھی۔ ابا بس اب نہا دھو کر کُرتا پائجامہ پہن کر برآمدے کی طرف آنے والے ہیں...... اب صبح ہوئی ہے تو امی کے ساتھ باغ میں کام کرنے کو جانے والے ہیں۔ اذان ہوتی تو لگتا کہ اب آکر چوکی پر جائے نماز بچھا کر نماز ادا کریں گے۔ وقت بدلتا رہا، ہر لمحہ بدلتا رہا، جنگلوں کے منظر بدل گئے، جہاں جنگل تھے وہاں شہر کا شہر بس گیا، پوری دنیا کا موسم بدل گیا، مگر ابا کا سراپا، ان کا ایک مخصوص انداز قوسِ قزح کی صورت میرے ذہن سے لپٹا ہوا جیسے پہلے تھا، ویسے ہی آج بھی ہے۔

صبح سے شام ہوتی رہی۔ روز سورج نکلتا رہا اور ڈوبتا رہا، لیکن ابا کی یاد میرے سینے سے چپکی رہی۔ ہر پل اور ہر لمحہ ان کی یاد میرے ساتھ ہے۔ وہی یادیں مجھے زندگی کا ہر راستہ دکھاتی ہیں۔ میری انگلی پکڑ کر مجھے غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح سمجھنے کا درس دیتی ہیں۔ ان ہی لمحوں کو یاد کر کے میں اپنی اصلاح آپ کرتی ہوں، اپنی تربیت آپ کرتی ہوں۔

ایک دولت تو مجھ سے چھن چکی تھی، مجھ سے رخصت ہو گئی تھی، مگر دوسری میرے پاس تھی۔ امی میری زندگی میں

ایک خوشگوار چھاؤں کی طرح میرے ساتھ ساتھ تھیں۔ میں اپنے سسرال سے ہر پندرہ بیس دنوں کے بعد گیا سے پٹنہ آتی جاتی تھی امی میرے دل کی حالت سمجھتی رہیں، میرے دکھ کا اندازہ لگاتی رہیں، میری بے رنگ گفتگو سے تھوڑی پریشان بھی رہتیں۔ مجھے کبھی کبھی صبر کی تلقین کی ہدایت بھی دیتی رہیں، اور خود بھی سراپا صبر و شکیب کی پتلا بنی رہیں۔ سفر میں ان کا ہم سفر ان سے بچھڑ گیا تھا اور خالی ہاتھ وہ واپس اپنے گھر آ گئی تھیں۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا دکھ تھا۔ سعودی عرب میں گزارے ہوئے وقتوں، لمحوں کو تفصیل کے ساتھ آہستہ آہستہ ہمیں بتاتی رہیں۔ ابا نے کب کیا کہا تھا، کب کس بات پر کیا بولے تھے، وہ سب کچھ امی نے مجھے بتایا۔ مجھے ابا کے بارے میں جان کر بے حد سکون ملتا تھا۔

ایک واقعہ یہ بتایا تھا کہ جدّہ ایئرپورٹ سے مکہ معظمہ جانے کے لیے جب امی اور ابا بس میں سوار ہوئے تو ایک بوڑھی عورت اپنے بہت ہی ضعیف شوہر کو ایک ٹوکری میں رکھ کر بس میں بیٹھی تھی۔ امی نے اس عورت سے پوچھا، ''تمھارے شوہر کو کیا ہوا ہے؟'' وہ بولی، ''بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے اسے ڈھو رہی ہوں۔ اس بار لے کر آئی ہوں کہ یہیں ختم ہو جائے گا تو اس کے حق میں اچھا رہے گا۔'' پھر اس نے ابا کو دیکھ کر پوچھا، ''کیا یہ آپ کے شوہر ہیں؟'' تو امی نے بتایا، ''ہاں، ہم لوگ پہلی بار حج کرنے جا رہے ہیں۔''

ابا کناڈا سے آئے تھے تو صحت بھی اچھی ہو گئی تھی اور چہرہ صحت کی سرخی سے چمک رہا تھا۔ ابا کے انتقال کے بعد پھر امی جب بس میں مکہ معظمہ سے ایئرپورٹ کے لیے چڑھنے لگیں تو وہی بوڑھی عورت اور اس کا ضعیف شوہر دونوں بس میں پہلے ہی چڑھ چکے تھے۔ اس نے اشارے سے ابا کے بارے میں پوچھا تو امی نے بتایا کہ وہ تو ختم ہو گئے۔ اس عورت نے اپنے شوہر کو دکھایا کہ دیکھو اس کو پھر واپس لے جا رہی ہوں، یہ سب خدا کا نظام ہے۔ قدرت کے فیصلے ہیں اور ان فیصلوں کے نفاذ کو اسی طرح مان لینا ہوتا ہے۔ جس طرح ڈاکٹر کی دی ہوئی کڑوی دوا تو ہم تسلیم کر لیتے ہیں، گرچہ وہ بے مزہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی کی مرضی سے ہر کام ہوتا ہے۔ وہ مالک ہے وہ جسے چاہے زندہ رکھے، جسے چاہے اپنے پاس بلا لے!

ہر انسان کو اس دنیا میں اپنی ماں ہی سب سے زیادہ پیاری لگتی ہے۔ زیادہ تر لوگ اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ مجھے بھی ان ہی لوگوں کی طرح اپنی امی بے حد پسند تھیں۔ ان کے محبت کرنے کا انداز بھی انوکھا تھا۔ ان کی بے غرض محبت نے میرے دل میں جیسے پر پرواز جوڑ دیے تھے اور پھر میں ان ہی پروں سے بادلوں کے ساتھ فضاؤں میں اُڑتی رہتی تھی۔ وہ اپنے بھی بچوں پر جان چھڑکتی تھیں۔ اگر میں کبھی دو دنوں کے لیے بھی شہر سے باہر گئی تو اس انجان شہر میں

بھی میرے دل میں ایک سکون سا رہتا تھا کہ امی موجود ہیں اور میں یہاں سے جا کر سیدھے ان کے پاس جاؤں گی اور پھر ان کی انتظار کرتی ہوئی نگاہوں سے مجھے وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی میں عادی ہوں، جو مجھے بچپن سے ہی بخشتی آ رہی ہیں۔

امی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے، اپنے بازوؤں کی محنت سے، ہم سبھی بھائیوں اور بہنوں کو پالا پوسا ہی نہیں، بلکہ تازہ پھل اور تازہ سبزیوں کو خود اُگا کر اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلاتی تھیں۔ یہ بات لکھنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ کسی اور ماں نے اپنے بازوؤں کی محنت سے اپنی اولاد کو نہیں پالا ہے۔ مگر ایسی ماؤں کی تعداد کم ہے جنھوں نے کھیت میں جا کر، باغبانی کر کے، پھل اور سبزیوں کو اُگا کر، چھیل کر، کاٹ کر، پکا کر، دسترخوان پر رکھا ہو۔ پھل اور سبزیوں کی خوبیاں بتاتیں، کون سے پھل کا کیا فائدہ ہے، کن سبزیوں کے کھانے سے کون کون سی بیماریاں نہیں ہوتی ہیں؟ نوکر اور دائی کے رہتے ہوئے بھی امی کو ہر کام کو خود کرنے کا بے حد شوق تھا۔ کسی بھی وقت وہ آرام سے نہیں بیٹھتی تھیں۔ کام کرنے کی جیسے ان کو عادت تھی۔ کوئی بھی مہمان آیا، سلام اور کلام کے بعد منٹوں میں ایک سے ایک پکوان بن کر دسترخوان پر آ گئے۔ نہ کوئی ہنگامہ نہ چیخ پکار، نہ کوئی الجھن اور نہ ہی کوئی مشکل۔ اگر گھر کا کوئی کام نہیں رہا تو گھر کا کوئی کونا ان کو گندا نظر آنے لگتا تھا، اور پھر منٹوں میں وہ کونا جو پہلے سے ہی صاف ستھرا تھا، وہ اور صاف ہو گیا، چمک گیا۔

پورے گھر کو، پورے خاندان کو اس خوبصورتی سے سنبھال کر رکھتی تھیں کہ دوسرے لوگ ان کی ہر بات میں مثال دیتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ لوگ ہم لوگوں کے یہاں بلا تکلف آتے تھے۔ کچھ لوگ تو ان سے سلیقہ سیکھنے کو آتے تھے۔ سلائی کڑھائی کی ماہر، میری امی تو نفاست پسند چھوٹے بھیا (سید اسلم) کی قمیض ایسے سیتی تھیں کہ کالج میں چھوٹے بھائی جان سے ان کے دوست پوچھتے تھے، ''یار، تمہارا درزی کون ہے؟ ذرا ہمیں بھی بتانا۔'' اور چھوٹے بھیا جواب دیتے، ''میرا کوئی درزی نہیں ہے، بلکہ ایک درزن ہے جو کہ میری ماں ہے!''

امی عدالت گنج پٹنہ میں رہیں یا سلطان گنج پٹنہ (جہاں ابا نے اپنا مکان بنوایا تھا) میں رہیں، لوگوں میں اور اپنے ملنے والوں کے حلقے میں، یا رشتہ داروں میں بہت مشہور و معروف رہیں۔ خاص کر غریب لوگ تو امی کے پاس آتے ہی رہتے تھے۔ غریب پروری کی وجہ سے اور ان کی ایمان داری کی وجہ سے۔ جس رکشے پر بیٹھتی تھیں، اس رکشے والے کو گھر لا کر پیٹ بھر کر کھانا کھلواتیں، پھر اسے پیسے دیتیں۔ سارے دادھیال اور ننھیال کے لوگ اور رشتہ دار کام سے، علاج کے لیے،

☆ میرے دادا (سید اظہر حسین)

☆ بڑے ابا (سیّد عبدالحفیظ)

☆ چھوٹے ابا (سیّد عبدالمجید شمس)

کورٹ اور کچہری کے لیے پٹنہ آتے تو ہم لوگوں کے یہاں ہی ٹھہرتے تھے۔ خدمت کی ضرورت پڑتی تو خدمت بھی کرتیں۔ گیا سے، ارول سے، شیخو پورہ سے یا پھر پاکستان سے جو بھی آتا، وہ ہم لوگوں کے یہاں ہی ٹھہرتا، اور جو بھی مہمان آتا وہ میزبان کے خلوص اور پُر جوش استقبال کو دیکھ کر، اگر اسے ایک دن ہی رہنا ہوتا تھا تو وہ دو دن رہ جاتا تھا۔

امی جس سے بھی ملتیں، پیار سے ملتی تھیں اور جس کی بھی باتیں سنتیں تو اپنے دل و دماغ کے دروازوں کو کھول کر سنتیں اور یہی وجہ تھی کہ اس چھوٹے سے مکان کی کشادگی لوگوں کی نظروں میں بڑھ جاتی تھی۔ پھر لوگ ان کی شفقت اور محبت کے قریب رہنا چاہتے تھے۔ محلے میں کسی کے بھی گھر میں اگر موت ہوتی تو امی نہ جانے کس طرح سب سے پہلے مردے کو نہلانے کے لیے پہنچ جاتیں۔ اپنے طور پر جس قدر بھی اس خاندان کو آرام پہنچا سکتیں، وہ سب کچھ کر گزرتیں۔ اپنی باتیں پورے وثوق سے کہتیں اور اگر انھیں یہ محسوس ہوتا کہ یہی ایمان کی بات ہے تو ایک منٹ کے لیے بھی نہ رکتیں۔ اخلاق میں سچائی اور ایمان میں پختگی ہوتی تھی۔ اسی لیے ہر ضرورت مند یا جو دکھی ہوتا، وہ امی کے پاس ہی آتا اور وہ اس شخص کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کوشاں رہتیں، مگن رہتیں۔

آج میں نے اپنی ماں کی تعریف کرنے کی نہیں ٹھان لی ہے۔ ہر کوئی اپنی ماں کی تعریف کرتا ہے۔ ہر کسی کو اپنی ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا پتہ ہوتا ہے، اس کے ہاتھوں کے لمس کی سرشاری کی لذت، اس کی نرم مزاجی کا سکھ ملتا ہے۔ مگر میری ماں نہ جانے کتنوں کی ماں تھیں۔ وہ دوسروں کے دکھ میں برابر کی شریک ہوتی تھیں۔ کتنوں کی دودھ ماں بن گئیں، کسی کی اپنی ماں بن گئیں، ہندوؤں کی ماتا جی بن گئیں، حضور، سرکار کی آواز باہر کے برآمدے سے آتی ہی رہتی اور پھر یہ ماتا جی باہر کے دروازے کے پاس کھڑی کھڑی نہ جانے کتنوں کا دکھڑا سنتیں، کتنوں کو سہارا دیتیں۔ اپنی باتوں سے تشفی دیتیں، گھر میں تو بس ہر گھڑی چلتی ہی رہتیں۔ امی کی چپل کی ایک خاص آواز ہوتی اور وہ آواز گھر کے برآمدوں میں، آنگن میں، باورچی خانے میں، کمروں میں، ایک کسی مشن پر گردش کرتی رہتی اور وہی گردش کرتی ہوئی آواز ہم لوگوں کے لیے ایک ایسی نور افشاں طناب کی طرح تھی جس کی چمک اور خوشبو میں ہم سبھی بھائی بہن آج تک گرفتار ہیں۔ اور میں تو اس طناب میں پھیلی ہوئی خوشبو کی بندش سے آزاد بھی نہیں ہونا چاہتی ہوں۔ وہاں کی برستی ہوئی افشاں سے خود کو نہلانے لگتی ہوں، خاص کر اس وقت جب میں کوئی دراز کھولتی ہوں اور اس میں سے امی کی کنگھی، تیمم کرنے کی مٹی، آنکھوں کے سرمے کی سلائی یا کسی کیوڑے تیل کی شیشی یا ان کی سوتی ساری میں کلف دینے والا اسٹارچ، یا شیخو پورہ سے آئے ہوئے غریب لوگوں کے خطوط کا پلندہ

سید عبدالاحد احمد

شہر بانو

بڑی باجی عاصمہ سراج اور چھوٹے بھائی (سراج الہدیٰ)

سید مسعود

مہر بانو

منجھلی بہن (طیبہ جعفری)

قمر بانو

سید اسلم

بڑے ابا کی نواسی سلطانہ بانو

صوفیہ انجم تاج

نکلتا، تو وہ یک بیک سامنے جیسے خود آ کر کھڑی ہو جاتیں۔ اور میں ان ہی یادوں کی خوشبوؤں تلے آج تک پل رہی ہوں۔

امریکہ میں ہم بھائی بہنوں کے ساتھ وہ بیسوں سال سے ہیں۔

ان کا یہاں رہنے کو دل کب چاہتا تھا، ان کو اپنے گھر کی یاد ستاتی تھی۔ وہاں کی سبزی والی، قسم قسم کے فقیر، محلے کے غریب لوگ جوان کو ''بیگم صاحب'' کر کے مخاطب کرتے تھے۔ ان ہی لوگوں میں ان کا دل اٹکا ہوا ہوتا تھا۔ مگر یہ تو ایک جانی پہچانی ہوئی حقیقت ہے کہ عمر کے ایک حصے میں ماں باپ پھر بال بچوں کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں۔ ابا کے انتقال کے بعد ہم لوگ ان کو پٹنہ کے اس بڑے مکان میں تن تنہا کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ ہم ہی لوگوں کی خواہش کی وجہ سے وہ یہاں امریکہ آ کر رہ گئی تھیں۔ مگر ہر دوسرے روز کبھی پٹنہ اور کبھی شیخپورہ خط روانہ کرتیں۔ پھر ان خطوط کے جواب کی منتظر رہتیں۔ شیخپورہ میں نانا کے نام پر ایک ''شرافت انگلش اسکول'' کھلوایا۔ یہ سارا کام یہیں سے بیٹھی بیٹھی خط کے ذریعہ اور فون کے ذریعہ کرتیں۔ ہر وقت ان لوگوں کا تذکرہ، اسکول کے بچوں کی فکر میں صبح سے شام کرتیں۔ اگر یہاں سے کوئی ہندوستان جانے والا ہوتا تو پنسل، قلم اور بچوں کے لیے candy جاتی۔ وہاں سے پھر ان کے منیجر خط لکھتے۔ بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اور یہ سب جان گرامی بے حد خوش ہوتیں۔

ان کی اسسٹنٹ میری منجھلی بہن (طیبہ جعفری) تھیں جن کے دل کے سچے جذبے سے عام لوگ، رشتہ دار، غریب طبقے کے افراد سب کے سب واقف ہیں۔ میں اکثر اپنی منجھلی بہن کو کہتی، ''تم تو بھئی دوسری مدر ٹریسا ہو''۔ جاں نثاری کا ان کے اندر ایک خاص جذبہ ہے۔ میری ماں کی طرح میری منجھلی بہن کے اندر دین داری بھی ہے اور دنیا داری بھی۔ دونوں ماں بیٹی شیخپورہ کے ایک ایک آدمی کا حساب کتاب مل کر کرتیں، باتیں کرتیں، کسی کسی پر دونوں غصہ کرتیں اور کسی کو سراہتیں۔ میری منجھلی بہن پر امی کی شخصیت کا عکس مجھے صاف نظر آتا ہے۔

یہ تو سچ ہے کہ ہر انسان روح اور جسم کا مرکب ہوتا ہے۔ اگر انسان کھانا کھاتا ہے تو اپنے جسم کو طاقت دیتا ہے اور اگر کسی کو کھانا کھلاتا ہے تو اسے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ ''روح'' دینے کا نام ہے اور ''جسم'' لینے کا نام ہے۔ روحانی کام کرنے کے لیے انسان کو سوچنا پڑتا ہے، فکر کرنا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو سوچنا پڑتا ہے، بلکہ خود کو کھنگالنا ہوتا ہے، تب انسان جو کچھ بھی کرنے کے لیے قدم بڑھاتا ہے اس میں کامیاب ہوتا ہے۔ میری بہن کو بھی اس طرح کے روحانی کاموں کو انجام دینے میں ایک خاص لذت ملتی ہے۔ ایسی لذت تو کبھی کو ملتی ہے، مگر کوئی اس کام کو اٹھ کر وقت پر کر دیتا ہے

جاوید میری گود میں، پیچھے شمو باجی، ان کے پیچھے سید مسعود، چھوٹی بہن برقعے میں،
کوئی دلہا پیچھے، ذکیہ خاتون (امی کی ممیری بہن)

بڑے بھیا (سید الاحد احمد) Bay of Bengal میں کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوائی تھی
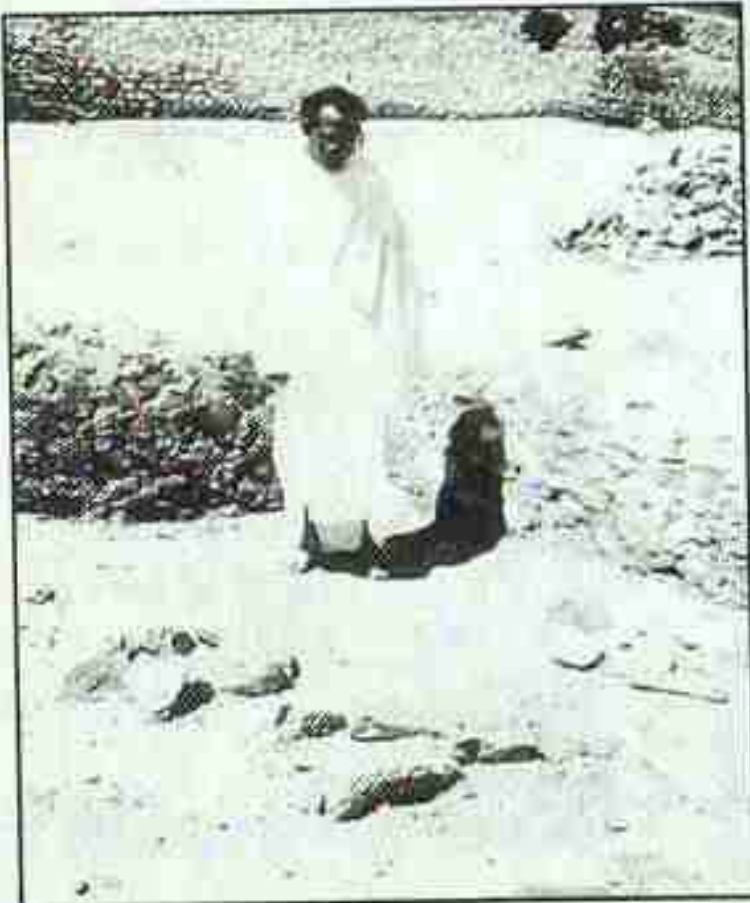
(دائیں سے:) (منجھلے بھیا) سید مسعود، انجم تاج،
میری امی (بی بی رابعہ خاتون)، جاوید میاں
(باجی کی گود میں)، طیبہ جعفری (منجھلی بہن)

ابا کی قبر سعودی عرب میں (جنت المالہ)

اور کوئی ساری زندگی اس کے بارے میں سوچتا ہی رہتا ہے۔ مگر وہ کام کر نہیں پاتا ہے۔

آیئے اسی عدالت گنج کی خوشگوار فضا میں وہاں کے آسمان کی نیلگوں وسعت میں گونجتی ہوئی، گیت گاتی ہوئی ایک شخصیت کا نام لے لوں۔ صداقتوں کے امین، صحیفۂ حق کے نامہ بر یعنی خواجہ منہاج جو میرے ابا کے ساتھ کام کرتے تھے، اسی عدالت گنج کوارٹر میں رہتے تھے۔ بچپن سے میں ان کو دیکھتی اور ملتی آرہی ہوں۔ ان کی زبان سے ایسے ایسے دلچسپ اور محبت سے لبریز جملوں کی ادائیگی ہوئی ہے جسے میں اکثر چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے یاد کرتی ہوں اور واقعی ان جملوں کو یاد کر کے میں کبھی مسکرانے لگتی ہوں اور کبھی بے تحاشہ ہنسنے لگتی ہوں۔ آج کل وہ اپنی بڑی لڑکی رخشی جاوید کے ساتھ کناڈا میں مقیم ہیں اور ایک بہت ہی خوشگوار ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ کان سے ٹھیک سے سنائی نہیں دیتا ہے اور بینائی بھی اتنی کچھ اچھی نہیں ہے مگر مائیکروسکوپک گلاس سے کتابوں اور رسالوں کے ورق ورق کو کھنگال دیتے ہیں اور پڑھ کر اس عمر میں بھی بہت ہی صحت مندانہ تبصرہ کرتے ہیں:

روشنی مجھ سے گریزاں ہے تو شکوہ بھی نہیں
میرے غم خانے میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں
(اقبال عظیم)

یہ تو سچ ہے کہ ہم کبھی مسائل کی اس بھیڑ بھاڑ میں ہانپتے کانپتے چلتے ہوئے منہاج بھائی کے فکر و نظر اور گفتگو کی متوالی خوشبو سے اپنے دکھ درد کو بھول کر اس میں جھومنے لگتے ہیں۔ ان کی زبان سے ادا کیے ہوئے ہر الفاظ ان کے دل کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان کی مسکراتی ہوئی شخصیت کا جادو دیکھ کر ہر شخص حیرت و تحیر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب میں کناڈا ان سے ملنے گئی تھی تو اپنی نئی نئی embroidery کی مشین پر منہاج بھائی کے لیے تولیے پر ان کا نام اردو میں لکھ کر تیار کیا تھا۔ جب انھیں اس تحفے کو پیش کیا تو ان کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ "کا بابو مرے نا دوگی (کیا مرنے نہیں دوگی)" تو ہر طرف سے قہقہے کا ایک شور بلند ہوا۔ اسی ٹرپ میں پھر کہنے لگے، "بابو ہم مر جائیں گے تو ذرا میری بیٹی کے گھر تم دونوں آجاؤ گی۔ ہم نے کہا کہ ایسے کیوں بول رہے ہیں، خدا نہ کرے ایسا ہو۔ تو بولے کہ "ہاں ارے مرنا تو ہے ہی، آجاؤ گی ذرا رونق ہو جائے گی۔"

میں اپنے تین بڑے بھائیوں کی شخصیت کی ہلکی سی جھلک پیش کرنا چاہتی ہوں۔ بڑے بھائی جان شروع ہی میں ڈھاکہ چلے گئے تھے اور پھر واپس آ کر انگلینڈ چلے گئے۔ منجھلے بھائی جان تو بہت پہلے ہی انگلینڈ ہجرت کر گئے تھے۔ مگر چھوٹے بھیا میری شادی کے بعد امریکہ آئے۔ ویسے بڑے بھائی جان اور منجھلے بھائی جان دونوں کی ایک خاص ادا، مسکرانے کا انداز، ڈانٹنے کا طریقہ، تھوڑا تھوڑا مختلف ہے۔

بڑے بھیا کی شخصیت تو ایسی ہے کہ ان کو شیر، نیل، ہرن اور مچھلیوں کے شکار سے ہی میں ہمیشہ منسلک کرتی ہوں۔ دل کے سخی، غریب پرور، دوستوں رشتہ داروں کی محبت کے خریدار۔ بہادر ایسے کہ جیسے دنیا کی کسی چیز سے انھیں ڈر نہ ہو۔ اندھیری رات ہو، بیچ کی رات میں چور لٹیرے سے مقابلہ کر لینا، اس سے بھڑ جانا، یہ ان کے کردار کی خصوصیات ہیں۔ سانپ کے سر کو کچل کر رکھ دینے والے بھیا، ہر دل عزیز، سب کے پیارے، سب کے دلارے، ہمیشہ دوسروں کے بارے میں سوچتے۔ ان کا پورا نام تو سید عبدالاحد احمد ہے مگر پیار سے پورے خاندان والے، دوست اور رشتہ دار احدو کہتے۔ ہر کوئی یہی چاہتا کہ احدو ان کے گھر جائیں۔ شیخوپورہ میں جب بھی کسی کے گھر جاتے، تو ایک آدمی ان کے ساتھ اس انتظار میں کھڑا رہتا کہ اب میرے گھر جائیں گے۔ غریب پرور ایسے کہ نوکروں سے ان کی پکی دوستی رہتی۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب میری شادی طے ہوگئی تھی تو امی نے بھیا کو روپے دیے کہ جہان آباد سے جا کر شادی کے لیے کچھ بکرے لے آئیں۔ واپس آئے تو نہ بکرے ہی لائے اور نہ روپے ہی واپس لائے۔ امی نے جب پوچھا کہ روپے کا کیا ہوا تو بولے کہ وہاں کوئی بہت ضرورت مند تھے، کوئی بیمار تھے، ان کی تکلیف مجھ سے دیکھی نہ گئی، تو میں نے وہ پیسے ان ہی کو دے دیے۔ سال میں نہ جانے کتنی بار شیخوپورہ، ارول، کاکو اور شاہو بگہہ جاتے اور سارے امیر اور غریب رشتہ دار اور محلے والوں سے مل کر آتے۔ کبھی کسی کو ساتھ لے آتے۔ کسی سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے چلے آتے۔

سب سے بڑے بچے ہونے کی وجہ سے خاندان والے جتنا ان کو جانتے تھے، دوسروں کو اتنا نہیں۔ انگلینڈ گئے۔ انجینیئرنگ میں ایم ایس سی کیا۔ جس مزاج والے بھیا کو ہم لوگوں نے انگلینڈ روانہ کیا تھا، وہی مزاج لے کر واپس آئے۔ اسٹیشن سے جیسے ہی آتے اور گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے مل جل کر جب فارغ ہوتے تو سیدھے آنگن میں بچھی ہوئی پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور کہتے، ''اس پلنگ کو میں کارڈف میں بہت miss کرتا ہوں۔''

اس سے پہلے جب وہ عدالت گنج سے مشرقی پاکستان (یعنی بنگلہ دیش) انجینئرنگ پڑھنے گئے تھے اور واپس چھٹیوں میں آئے تھے تو ہم لوگ عدالت گنج کوارٹر کے برآمدے سے کھڑے ہو کر اسٹیشن کی طرف سے آتے ہوئے دیکھتے تھے اور دوڑ کر ان سے لپٹ جاتے تھے۔ "بھیا آ گئے۔"...... بھیا کے ساتھ ایک بکس ہوتا اور ایک بڑی سی گٹھری۔ میں پوچھتی، "بھیا آپ میرے لیے کیا لائے ہیں؟" تو صرف مسکرا دیتے۔ میں یہ سوچتی کہ ابھی مسکرا رہے ہیں، آخر اس گٹھری میں سے تو ضرور میرے لیے کچھ نکلے گا۔ مگر جب وہ گٹھری کھلی تو...... تو ایک پوری کھلی ہوئی، بمعہ پیچ اور بولٹ کے سائیکل ہوتی۔ میری تو بس طبیعت ہی مکدر ہو جاتی، "بھیا یہ کیا اٹھا کر لے آئے؟"

"اگلی بار جاؤں گا تو تمھارے لیے بہت پیاری سی گڑیا لاؤں گا۔" یہی کہہ کر اپنا چھٹکارا کراتے۔

یوں بھی بھیا کو کسی بھی شے کو کھول دینے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ پوری کی پوری گاڑی کھول دیتے اور پھر اس گاڑی کے نیچے آدھا جسم باہر نکال کر لیٹے خدا جانے کیا درست کرتے رہتے تھے۔ ان کو گاڑی کے پرزوں کو کھولنا اور واپس لگانا بے حد پسند تھا۔

پندرہ سال پہلے بڑے بھیا ہم لوگوں کی محبت میں امریکہ آ گئے تھے اور انھیں اپنی فیلڈ میں بہترین نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر یک بیک ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ دوسرے ہی دن ہارٹ کا آپریشن ہوا۔ ہوش آیا تو دائنی طرف فالج نے حملہ کر دیا۔ دایاں پیر اور دایاں ہاتھ بے دم ہو گیا۔ ساتھ میں زبان پر بھی کنٹرول نہیں رہا۔ ان کی بیماری کو اب بارہ تیرہ سال ہو گئے ہیں۔ میرے بھیا وہ والے بھیا نہیں رہے۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ وہ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ خود سے ہی اپنی ضرورتوں کو، لنگڑا کر ہی سہی، پورا کر لیتے ہیں۔ دنیا کا سب سے بہادر انسان، سب سے ہمت والا شخص اس وقت دنیا کا سب سے کمزور آدمی بن گیا۔

رکشے والا پوچھ رہا تھا کہ ارے اس دولہے نے سہرا کیوں نہیں باندھا ہے۔ کسی نے ہنس کر جواب دیا کہ ارے یہ دولہا نہیں ہے۔ یہ دونوں بھائی انگلینڈ جا رہے ہیں۔ یعنی میرے منجھلے بھیا (سید مسعود) اور میرے چچیرے بھائی (سید حسنین مجید)، ان دنوں انگلینڈ گئے تھے جس وقت لوگ اکا دکا ہی انگلینڈ جاتے تھے۔ دونوں کو گھر بیٹھے بیٹھے وہاں نوکری ملی تھی۔ جانے کا جب دن آیا تو امی، چھوٹی اماں، بڑی اماں، سب کی سب دلگیر ہو رہی تھیں اور ہم بہنوں کی اداسی کا تو کیا پوچھنا۔ میں تو بہت ہی چھوٹی تھی۔ مگر پٹنہ اسٹیشن کا منظر یاد ہے جب دونوں بھائیوں کو لوگوں نے اس قدر ہار پہنائے تھے کہ

رکشاوالا سمجھ بیٹھا کہ دلہا جارہا ہے اور یہ سارے لوگ براتی ہیں۔ایک دوسرا رکشے والا بھی یہ بول اٹھا تھا کہ ''ہائے دلہوا (دلہا) کا سہرا کا (کیا) ہوا۔''

منجھلے بھیا بہت ہی کم عمری میں انگلینڈ چلے گئے تھے۔اس لیے امی اور ابا ان کی طرف سے کافی فکرمند رہتے تھے۔مگر جلد ہی دونوں بھائی وہاں کی آب وہوا، رہن سہن، کھانے پینے سے مانوس ہو گئے اور اتنی جلدی مانوس ہو گئے کہ ہم سبھی کو تعجب ہوتا تھا۔ایک کے بعد ایک خط آنے لگا جس میں ملک کی تعریفیں، لوگوں کی تعریفیں اور پھر ساری باتیں تفصیل سے لکھی ہوتی تھیں۔ہم سبھی بہنوں کو روز ہی پوسٹ مین کا انتظار رہتا اور جب ان لوگوں کا خط آتا تو ایک آدمی زور سے پڑھتا اور ہم سبھی اس کے چاروں طرف بیٹھ کر ایک ایک جملہ غور سے سنتے اور پھر اس پر تبصرہ ہوتا۔پھر خط کی سطروں کو دہراتے دہراتے اس قدر بے اختیار ہو جاتے کہ آپس میں بات کرتے کرتے آبدیدہ ہونے لگتے۔ان کے خطوط اور یادیں ہی بس اس وقت ہم لوگوں کی زندگی کا سرمایہ تھیں۔

اپنے پاؤں پر جلد ہی کھڑے ہو گئے۔وہاں کی زندگی اور وہاں کے ماحول کے ساتھ رہ کر بھی خود کو بھولے نہیں کہ وہ کس جگہ سے، کس بستی سے اور کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔مجھے آج تک منجھلے بھائی جان کا چہرہ، جو میں نے پٹنہ اسٹیشن پر دیکھا تھا، یاد ہے۔ماشاءاللہ ایک شہزادے کی طرح لگ رہے تھے۔نئے نئے سوٹ میں ملبوس منجھلے بھیا مستقبل کے روشن ہونے کی ڈھیر ساری امیدوں کو سنبھالے ہوئے سفر کے آغاز کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ٹرین کے دروازے پر دونوں بھائی ہار پہنے ہوئے کھڑے تھے۔ہم سبھی بے بس ہو کر پٹنہ اسٹیشن پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔اور ٹرین ہم لوگوں کی آنکھ سے اوجھل ہو گئی۔

دونوں بھائیوں کے دل میں ایک تمنا تھی کہ انگلینڈ جا کر ''کچھ کر کے'' دکھائیں۔انگلینڈ خواب دونوں ہی کے دل میں رچا بسا ہوا تھا اور اس قدر رچا بسا تھا کہ آخر دونوں چلے ہی گئے۔ویسے بھی:

Where there is a will, there is a way

منجھلے بھیا ہم لوگوں سے بہت تاخیر کے بعد ملنے آئے۔خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔اپنی حیثیت کے مطابق امی اور ابا نے گھر میں ان کے آرام کی ساری چیزیں مہیا کی تھیں۔مجھے یاد ہے ان کے آنے کے بعد ایک دن منجھلے بھائی جان کو بخار آگیا تھا۔امی اور ابا دونوں بے حد پریشان۔امی ابا کو کہہ رہی تھیں کہ کل رات آپ بہت دیر تک باہر خنکی میں اس کے

ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ اور ابا کہہ رہے تھے، ''جی نہیں آپ نے اس کو بازار کی پاپڑی کھلا دی تھی۔'' اور منجھلے بھیا ہنس ہنس کر کہتے جا رہے تھے، ''ہم تو بھائی بالکل ٹھیک ہیں۔'' ایک مدت پر منجھلے بھائی جان سے ملی تھی، مگر ان کا چہرہ ماشاء اللہ پہلے سے بھی زیادہ چمک رہا تھا۔ لندن کے کپڑے، وہاں کی ٹائی، جوتا، وہاں کا پورا رنگ اور انداز دیکھ کر ہم سبھی ان پر اندر ہی اندر فدا ہوتے رہتے۔ ان کی چمکتی ہوئی شخصیت سے ہم سبھی لوگ ہمیشہ متاثر رہتے تھے۔ منٹوں میں ماحول کو ایسا خوشگوار بنا دیتے کہ ہر طرف اجالا پھیل جاتا۔ آج تک وہ ایک بڑے بھائی نہیں، ایک دوست کی طرح ہم لوگوں سے بے تکلفی سے باتیں کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کی محبت میں وہ اٹھ کر انگلینڈ سے امریکہ آگئے اور ماشاء اللہ ہم سبھی کے ساتھ خوش باش ہیں۔

چھوٹے بھائی جان (سیّد اسلم) کے ساتھ میں سب سے زیادہ رہی۔ وہ میری شادی کے بعد امریکہ آئے تھے۔ امی کے ہاتھوں کے سلے ہوئے شرٹ کو پہننے والے چھوٹے بھیا، پھولوں اور پودوں کی پتی پتی سنوارنے والے چھوٹے بھیا، جنھوں نے سبز موسم میں زرد موسم ہملوگوں کے عدالت گنج کوارٹر کی فضا میں خوشبوؤں کو بسا دیا تھا۔ وہ کسی بھی موسم میں بہار کے موسم کو مجبور کر دیتے تھے کہ وہ آئے اور اپنے جادوئی لمس سے اس گھر کے اندر رنگ و نکہت بکھرا دے۔ مسافر جب سڑک پر رک رک کر پھولوں کو دیکھتے تھے اور خدا کی قدرت کی تعریف کے بعد اس مالی کو بھی گھر کے اندر سے بلاتے تھے اور ان کو داد و تحسین سے مالا مال کرتے تھے۔

عدالت گنج کوارٹر سے جب ہم لوگ سلطان گنج اپنے مکان میں آئے تو اس جگہ کو بھی انھوں نے چھوٹی سی جنت بنا دیا۔ کالج میں اپنی دوستوں کو اپنے گھر کی وہ تصویر دکھاتی جو پھولوں سے آراستہ تھی تو ہر کوئی پوچھتا، ''اتنے حسین پھولوں سے سجا ہوا مکان سلطان گنج میں بھی ہے؟'' شیخپورہ جاتے تو آم والی کوٹھری کے مالک بھی وہی بن جاتے۔ باغباں جو ٹھہرے! لوگ آم کو جب طریقے سے پکڑتے تو انھیں بتاتے کہ آم یوں پکڑا جاتا ہے، یوں سونگھ کر بتایا جاتا ہے کہ آم پکا کہ نہیں۔ ایسے کاٹا جاتا ہے اور کھا کر دکھاتے کہ یوں کھایا جاتا ہے۔ پھر ہم سبھی خوب ہنستے۔ امی، ابا اور ہم لوگوں کے ساتھ وہی رہے۔ انھوں نے ہی ہم لوگوں کی دیکھ ریکھ کی۔ انھوں نے ہی مالی بن کر پھولوں کو تر و تازہ رکھا اور گھر کے لوگوں کی رکھوالی کی۔ میری شادی کے بعد امریکہ آگئے۔ چھوٹے ابا (سید عبدالمجید) ان دنوں امریکہ میں تھے اور کسی ڈاکٹر صاحب کے یہاں چند ہفتوں کے لیے مقیم تھے۔ چھوٹے ابا نے چھوٹے بھائی جان کو اپنے پاس ملنے کو بلایا کہ چند دنوں کے لیے وہاں ان کے پاس آجائیں۔ جب چھوٹے بھائی جان آئے تو ڈاکٹر صاحب اتنی بے تکلفی سے نہیں ملے، جیسے ایک غیر ایک غیر سے ملتا ہے۔

گنگا کی سیر کرتے ہوئے
(آگے دائیں طرف سے) بنّی دادا، ملاح کا لڑکا، قمر بانو، سلطانہ بانو، سید مسعود،
صوفیہ انجم تاج، مہربانو، معصومہ اطہ
پیچھے: میرے ابا (سید عبدالعزیز) اور چھوٹے بھیا (سید اسلم)
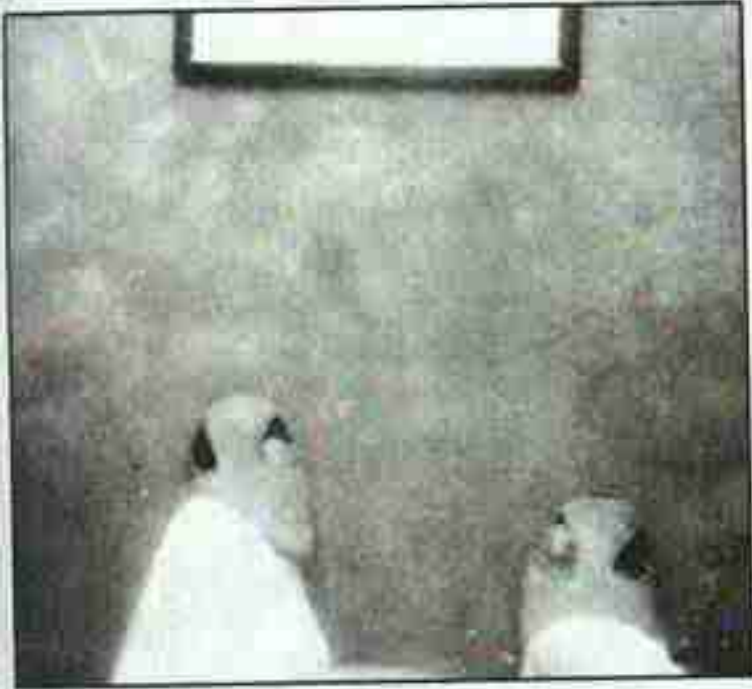
حسنین بھیا کی ایک شرارت جنھوں نے دوسرے بچّوں کی اس طرح فوٹو لی تھی

(دائیں سے) (باجی) عاصمہ سراج، (کرسی پر) امّی اور ابّا،
(پیچھے) بڑے بھیا سید عبدالاحد احمد، (میری ظفری بہن) حمیدہ۔
فرش پر: (مرحوم) صبیحہ عزیز، سید مسعود، سید اسلم۔

(دائیں سے) حسین مجید، سید مسعود، عاصمہ سراج، سید حسن (سلطان گنج میں)

مگر صبح اٹھ کر اس مالی نے جوان کے پائیں باغ چمن میں ان کے لگائے ہوئے بے ترتیب پھولوں کو ایک ترتیب دے دی، گلاب کے چاروں طرف کی مٹی کو کوڑ کر ہلکا کر دیا اور اسے تر و تازہ کر دیا، نئی کیاریاں بنا کر بے ترتیب پودوں کو ایک قطار سے سجا دیا تو ڈاکٹر صاحب ان کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ چھوٹے بھائی جان کو کہیں جانے ہی نہ دیں اور کہنے لگے کہ "اسلم صاحب، آپ یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے اور اسی شہر میں رہیں گے۔"

آج ہم لوگوں کا پورا خاندان جو یہاں امریکہ میں مقیم ہے، وہ اسی مالی کی بدولت ہے، یعنی صرف چھوٹے بھائی جان اور چھوٹی بھابھی کی بدولت ہے۔ دونوں ہی اپنے دل و جگر کی دولت کو لٹاتے رہے، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ دوسرا انھیں کیا لوٹا رہا ہے۔

میرے پاس ان کی دی ہوئی جو دولت ہے، وہ بے پناہ میٹھی ہے۔ جیسے میرے پور پور میں شیرینی گھلی ہوئی ہو۔ جیسے میری زندگی کے پودے کے رگ و پے میں وہ جیون امرت بن کر دوڑ رہی ہو۔ اس سبز ننھے پیکر نے میرے گھر کے ذرے ذرے کو روشن کر دیا ہے۔ میرے خشک ہونٹوں پہ بارش جیسے امرت کی سبز بوندوں نے جینے کا حوصلہ دیا اور مجھے...... مجھے تو جینے کا ایک بہانہ مل گیا۔ میرے گفتگو کے پھیکے رنگ کو چمک ملی۔ میرے الفاظ کو تازگی اور نغمگی مل گئی۔ ایک انوکھی نرالی منفرد سوچ ملی۔ اور اب...... اب تو میری صبح اور شام میں رقص کرتی ہوئی بہار اپنا گھر بنا چکی ہے۔ میری بھیگی ہوئی آنکھوں کے خلاؤں میں عکسِ موجۂ گل کی خنکی اور ٹھنڈک بس گئی ہے۔ مصوری کے فن میں تر و تازہ رنگ ابھرنے لگے ہیں۔ میری پنسل سے اُبلتے ہوئے نقش زیادہ اجاگر ہو گئے ہیں۔ دائروں میں گولائی اور وسعت آ گئی ہے اور زندگی بہتر طریقے سے جینے کا ہنر سیکھ گئی ہوں۔ میں اپنے خداوند کریم سے ہر وقت، ہر لمحہ یہ دعا مانگتی ہوں کہ جس رنگ و نکہت کو میرے آنچل میں بسایا ہے، وہ سبک لمس میرے آنچل پر پھیلے ہوئے نقوش اور دائروں کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنائے رکھے۔ آمین!

ابا اور امی نے مجھے درختوں کے رنگ اور روپ، چھوٹے بڑے پودوں اور جھاڑیوں کو پہچاننے کی ٹریننگ دی تھی۔ کون سے درخت کی پتیاں جھڑنے والی ہیں، کس درخت میں پتیاں کب اور کس ماہ میں نئی نکلنے والی ہیں۔ آسمان کا رنگ کیسا ہو رہا ہے، آج بادل نے آسمان پر کیسے کیسے نقش بنائے ہیں۔ اکثر لوگ رکشے اور گاڑی پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اور آسمان کے سامنے ہوتے ہوئے بھی انھیں یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ آج آسمان کا رنگ کیسا ہے۔ پیڑ پودوں

کے سامنے ہوتے ہوئے بھی انھیں یہ نظر نہیں آتا ہے کہ شاخوں پر پتے ہرے ہیں یا پیلے۔ میں نے یہی ٹریننگ اپنے بیٹے کو دینے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم کہیں بھی باہر جاتے ہیں تو وہ مجھے آسمان دکھاتا ہے،''اماں، دیکھو بادل کا رنگ gray ہو رہا ہے۔''

جن دنوں میں لندن میں رہتی تھی، وہاں سے ایک بار گھومنے کے لیے اور اپنے بھائی بہنوں سے ملنے کے لیے ڈیٹرائٹ آئی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ایسی ہی کسی دوپہر کو چھوٹی بھابھی کی کسی دوست نے ہم سبھی کو جھیل کے کنارے بار بی کیو کی دعوت دی تھی۔ ہر شخص باہر گھاس پر جھیل کے کنارے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ Lake Eric میں لوگ تین تین چار چار منٹ کے لیے بوٹ پر چڑھ کر آتے اور واپس چلے جاتے۔ پھر کھانا پینا اور گپیں ہوتیں۔ جس طرح سے عام طور پر دعوتوں میں ہوا کرتا ہے۔ اسی دوران ایک صاحبہ میرے نزدیک آئیں اور انھوں نے مجھ سے پوچھا،''آپ کبھی لندن میں بوٹ پر چڑھی تھیں؟'' بخدا مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے ان کو کیا جواب دیا تھا، مگر ٹھیک اسی پل میں اس جگہ سے میں بہت دور دوسری بستی میں چلی گئی تھی۔ وہ دوسرا ہی محلہ تھا، جہاں بنی داوا رہتا تھا۔ جہاں ابا کی آواز گونجتی رہی تھی؛''ارے میاں بنی! رات میں ہی کھچڑی پکانے کا سارا سامان اکٹھا کر لو ورنہ صبح میں بڑی مشکل ہوگی۔ ہم لوگوں کو کشتی سے گنگا اُس پار کے لیے چار بجے صبح ہی روانہ ہونا ہے۔''

''اسلم تم نے بندوق صاف کی؟ کارتوس کہاں ہے۔''

''دیکھو گرم کپڑوں کی بہت ضرورت ہوگی، سوئٹر کوٹ کمبل ساری چیزیں رکھ لو۔''

''دیکھو تھوڑی سوکھی کھانے کی چیزیں بھی رکھنی ہیں۔''

میں اور میری منجھلی بہن پورے گھر میں دوڑ دوڑ کر سامان اکٹھا کرتے اور صبح گنگا اُس پار جانے کی تیاری میں کوئی بھی کوتاہی نہ کرتے۔ چھوٹے بھائی جان تو خوب مصروف نظر آتے۔ اور ہم لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ ابا بھی آہستہ آہستہ سب انتظامات میں لگے رہتے اور بنی داوا الگ مصروف۔ اُدھر امی برآمدے کی چاندنی بچھی ہوئی چوکی پر بیٹھ کر یہ سب دیکھتی جاتیں اور بولتی جاتیں،''آپ نے آخر ان لوگوں کو اتنی چھوٹ کیوں دی ہوئی ہے۔ یہ ساری لڑکیاں دن دن بھر گنگا میں کشتی پر گھومیں، یہ کیا تک ہے؟ عاصمہ (بڑی باجی) بیچاری تو عدالت گنج میں ساتھ والے گھر میں بھی جانے کے لیے آپ کی اجازت لیتی تھی، اور ان لوگوں کے یہ مزے!''

ابا یہ سب سن کر خاموشی سے مسکراتے رہتے۔ چھوٹے ابا کی لڑکیاں قمر بانو، مہر بانو اور بڑے ابا کی نواسی سلطانہ، سب کی سب اپنے گھر میں گنگا کے اُس پار جانے کی تیاری میں مصروف رہتیں۔ رات کو نیند کسے آتی؟ جوں توں کر کے صبح ہوئی، یعنی تین بجے کا بھور، ہلکا پھلکا ناشتہ ہوتا۔ صبح اٹھ کر بھی تھوڑا سا بچا کھچا سامان جو رات کو نہیں رکھا گیا تھا، خاموشی سے دبے پاؤں چلتے ہوئے رکھا جاتا۔ ہم دونوں بہنیں، دونوں بھیا چچیری بہنیں مہر بانو اور قمر بانو اور سلطانہ دن بھر کے پروگرام کے لیے گھر سے نکل جاتے۔ پہلے قریب آدھ میل تک تو پیدل چلنا ہوتا تھا، یعنی گنگا کے ساحل تک۔ اس پتلی اور ٹیڑھی میڑھی گلی کو ہنستے، کھلکھلاتے، کھسر پھسر کرتے ہوئے راستہ پار کر کے کشتی کے پاس پہنچتے۔ یکے بعد دیگرے سب لوگ کشتی میں بیٹھتے۔ کشتی خوب ہلتی، ڈولتی۔ خاص کر سوار ہونے کے وقت۔ مگر اس کے ڈوبنے کا ڈر کسی کو بھی نہ ہوتا۔ بنی داوا کشتی کے بالکل پیچھے بیٹھ کر کیتلی میں گرم پانی چڑھاتے، چائے بناتے، پھر کچھڑی اور بھرتا پکانے کی تیاری کرنے لگتے۔

اور ہم سب ملاح کے پتوار سے ہٹاتے ہوئے پانی کی آواز سے ندی میں جو ایک پُر اسرار ماحول بنا ہوتا، اس کی خنکی، اس کی خوبصورتی، اس کے سکوت اور اس کی خاموشی کو دیکھتے جاتے۔ کبھی کبھی بیچ میں جیسے بس کوئی ضروری بات کہتا۔

ہم کبھی کو آدھی رات کی اس خاموشی میں پتوار کے دھیمے دھیمے گیت نے کچھ اس طرح کا سرور بخشا تھا کہ ہم لوگ ایک خاص کیفیت میں ڈوب جاتے۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی دلفریبی اور شوخی، روح، دل اور دماغ کو تر و تازہ کرتی جاتی تھی۔ شہر کا ہنگامہ، رکشہ، ٹم ٹم، سائیکل کی ٹن ٹن، لوگوں کی بھیڑ، ان کی چیخ و پکار سے جیسے دور، بہت دور ہوتے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آگے جانے کے بعد کوئی پھولوں اور چاند ستاروں سے سجی سجائی ایک بستی ملنے والی ہے۔ جہاں بدمست ہوائیں ہوں گی، مچلتی پھواریں ہوں گی۔ جہاں کی ہر منڈیر اور جھروکے پر درد سے خالی ہشاش بشاش چمکتے چہرے ہوں گے۔ جہاں ہر سوال کا ایک دلچسپ جواب ہوگا، جہاں بھوک کی روتی شکل کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ جہاں پیاس کو کوئی جانتا نہ ہوگا۔ سب برابر ہوں گے۔ ہر مذہب کے لوگ رہتے ہوں گے۔ سڑک پر کوئی بچہ بلکتا نہ ہوگا۔ ''اللہ کے نام پر دے دو'' کی کوئی فریاد نہ ہوگی۔ جہاں نرم لہجے ہوں گے۔ محبت اور پیار کی افشاں کے چھڑکاؤں کے زیر سایہ پُر نور چہرے ہوں گے۔

اس ماحول کے جادو سے کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ مگر خاموش رہنے میں ایک آرام اور سکون مل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سب اپنی اپنی دنیا میں جا کر اپنے تصور کے قصر جنت میں دیے جلا رہے ہوں۔ کبھی کبھی بیچ میں ابا کے ہاتھوں کو اک جنبش ہوتی، یعنی وہ کمبل اٹھا کر ہم بہنوں کو اوڑھانے کی کوشش کرتے۔ کسی کے سوئٹر کا کالر درست کرتے اور اپنے مخصوص

انداز میں، ایک پیار بھری نظر سے سب کو دیکھتے۔

پانچ بجتے بجتے یک بیک چڑیوں کے کئی غول درختوں سے نکل کر دامنِ آسمان پر بکھر جاتے اور اپنی چہچہاہٹ کے گیت بکھیرنے لگتے۔ جنگل سے جانوروں کی قسم قسم کی آوازیں آنے لگتیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدے میں گر رہے ہوں۔ ٹہنیاں تک سوئے فلک دست بہ دعا اٹھائے رہتیں۔ جگنوؤں کے جھنڈ رخصت ہو رہے تھے۔ صبح کے آثار نظر آتے ہی یک بیک ایسے لگنے لگتا کی پانی کی سطح پر دھواں تھرتھرا رہا ہے اور پھر...... اسی دھوئیں کے عقب سے اس بہتی ہوئی ندی پر ایک آواز گونجتی، جیسے زمین و آسمان کے بیچ میں کوئی پکار رہا ہو، ''با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔'' ایک سرخ مگر نارنجی مائل لکیر ابھرتی اور ابھرتے ابھرتے بہت ہی آہستگی سے پہلے آدھا سورج جیسا بنتا۔ اسی وقت ہم کبھی یک زبان ہو کر بولتے کہ دیکھو سورج نکل رہا ہے۔ حالانکہ یہ منظر ہم لوگوں نے بہت بار دیکھا تھا مگر جب بھی پانی کی سطح پر اس طرح سے سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھتے، تو ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہو جاتے۔

ایک ایک منٹ میں سورج ابھرتا جاتا اور اپنی شاندار گولائی کا احساس دلاتا جاتا۔ پھر ایک وقت ایسا آتا کہ وہ گول سورج اپنے پورے آب و تاب سے، آسمان پر، جو ایک بدلتے ہوئے رنگ سے بھرپور کینوس تھا، مسکرانے لگتا۔ سورج کے ساتھ ساتھ ہم سب لوگ پوری طرح جاگ جاتے۔ کروٹیں لینے لگتے۔ باتیں کرنے لگتے۔ انگڑائیاں لی جاتیں، یہاں تک کہ روشن سویرا بڑے اہتمام سے پوری کائنات پر چھا جاتا۔ سورج کی پیشانی پانی کی خاموش سطح پر آہستہ آہستہ جھلملانے لگتی، اور اس کا سرخ رنگ پانی پر بکھر بکھر کر دور دور تک پھیلتا چلا جاتا۔ آج بھی میں گنگا کی سطح کو، وہاں کے سرخ سورج کو، اس کی بڑی سی گولائی کو، اور اس گولائی کے عکس کو، تصور میں ایسے لا سکتی ہوں جیسے واقعی وہ سورج میری نظروں کے سامنے ہو۔ جیسے جیسے آسمان پر سورج چڑھتا جاتا، اس کی سرخی میں کمی آتی جاتی، اس کی روشنی اور گرمی پھیلنے لگتی اور پھر...... پانی میں اس کا عکس بھی بدل جاتا۔

ملاح کشتی چلاتا رہتا۔ اس کا بس ایک ہی کام رہتا۔ یعنی دونوں پتواروں کو کھیتے رہنا۔ صبح میں دو تین گھنٹوں تک ہم لوگ اسی کشتی میں رہتے۔ دیر تک، شروع میں کشتی ساحل سے کچھ قریب ہی رہتی، مگر دن ڈھلتے ہی گنگا کے اس پار جانے کا پروگرام بنتا۔ ملاح وہی کرتا جو ہم لوگ چاہتے۔ ہم لوگوں کی باتیں سُن سُن کر مسکراتا اور ویسے ہی مسکراتے مسکراتے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا...... وہ منزل کیا تھی؟

ریت کا ایک ٹیلہ یا ٹیلوں کا ایک گروپ جیسے 'ٹیلولا' کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک جزیرہ نما جگہ جہاں کچھ اونچی اونچی گھاس فخر سے اپنا سر اٹھائے ہوتی جیسے کہہ رہی ہو کہ اس سنسان جگہ کے مالک ہم ہیں! کہیں کہیں پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اُگی ہوتیں اور پھر اس کے آگے ایسے لگتا کہ بس میلوں تک ریت ہی ریت ہو۔ کشتی سے اُتر کر ہم لوگ اسی جگہ پر گھنٹوں اچھلتے کودتے رہتے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک بار ہم لوگوں کو ایک پورا skeleton انسان کا نظر آیا تھا جو کہ پٹنہ کے مردہ گھاٹ سے پانی میں بہتا ہوا وہاں تک آپہنچا تھا۔ پہلے تو اسے دیکھ کر ہم بھی چیخ اٹھے تھے، پھر جب دل ذرا مضبوط ہوا تو اس کے قریب گئے اور وحشت کی انتہا یہ تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر تصویر بھی کھنچوائی گئی۔

بھیا اور دوسرے بڑے لوگ دور جا کر شکار میں مگن ہو گئے۔ بنی داوا اپنی کھچڑی میں لگے رہے۔ ابا زیادہ تر خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے ایک جگہ پر بڑے ہی سکون سے بیٹھے رہتے۔ چار پانچ گھنٹوں تک ہم لوگ اس ریت والے جزیرے پر سیر سپاٹے میں مگن رہتے۔ پھر کشتی پر سوار ہو کر سفر کو آگے بڑھاتے۔ اب بنی داوا کے ہاتھوں سے برتنوں کی ڈھن ڈھن کی آواز آنا شروع ہو جاتی۔ ابا پوچھتے، ''کیا بنی، پہلے چائے پلاؤ گے نا؟''

''ہاں حضور، بس چائے تیار ہی ہے۔''

دونوں بھیا لوگ پھر سے اپنی اپنی بندوقوں کو اٹھا کر ٹھیک ٹھاک کرنے لگے۔ اور وہ چھے (ایک چڑیا) آبی پرندے تھوڑے تھوڑے پانی میں ساحل پر پھدکتے پھر رہے تھے، ان پر بے دردی سے بندوق کا نشانہ بٹھانے لگے۔

مجھے یاد ہے، میں نے کہا تھا، ''بھیا، ان آزاد پنچھیوں کو آپ لوگ آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے ہیں؟'' تو جواب ملا، ''اللہ تعالیٰ نے، انجم بی بی، پرندوں کو اور کچھ جانوروں کو جنگلوں میں، سمندروں اور دریاؤں میں مچھلیوں کو، ہم لوگوں کے واسطے ہی پیدا کیا ہے۔ تو پھر میں اس نعمت کو کیوں ٹھکراؤں؟'' مجھے جیسے لاجواب ہی کر دیا۔

ابا ملاح کو پٹنہ سٹی کی طرف جانے کو کہتے اور پھر وہاں سے واپس یعنی پٹنہ سٹی کی طرف سے ساحل کے کنارے کنارے، ہم لوگ کشتی میں سلطان گنج کی طرف آتے۔ راستے میں سبز گھنے جنگل تھے جو دیکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ صرف اونچے اونچے درخت ہی نہیں، بلکہ ان درختوں پر لپٹی ہوئی سبز بیلیں درختوں کی شکل وصورت کو کچھ اس طرح بدل دیتیں کہ وہ دیکھنے میں آرٹ کے نادر نمونے نظر آتے تھے۔ ایک عجیب سا حسن۔ ہم لوگوں کی کشتی خراماں خراماں چلتی جاتی اور ہم لوگ ایک دوسرے کو انگلی اٹھا اٹھا کر عجیب وغریب چیزیں دکھاتے رہتے۔ جنگلوں کے بیچ بیچ میں کبھی پرانے ٹوٹے ہوئے

مکانات اور قلعے اپنی تاریخ کی رنگارنگی کا احساس دلاتے۔ قلعوں کی ان سرخ ٹوٹی دیواروں پر رقص کرتی ہوئی سبز جنگلی لتوں کے چڑھنے سے ایک خاص طرح کی خوبصورتی پیدا ہوتی تھی، جس کا نظارہ ہم لوگ کافی دنوں تک اپنی آنکھوں میں بسائے رہتے تھے۔ ان زرد پتوں کی ہری کہانیاں دل و دماغ پر جیسے چھا جاتی تھیں اور میں آج بھی کبھی کبھی آنکھ بند کر کے ان دیواروں کے نازک کاموں کو یاد کرتی ہوں جس کو وقت بھی بھرپور طرح سے دھندلا نہ کر سکا اور وہ شادمان گلیاں، ۔ وہ چہکتے بچے، مردوں کے کڑک دار کرتے، بیبیوں کے سنہری روپہلی کناری والے آنچلوں کے عکس، میری نظروں کے سامنے لہرانے لگتے۔ وہاں کے بے پناہ سکوت پر جو حسرتوں کا سایہ تھا، وہ راستے بھر مجھے اداس کرتا رہا تھا، میں یہ نہیں جانتی کہ میری دیگر بہنوں کو یا خاندان کے دیگر لوگوں پر ان مناظر کا کیا اثر ہوا ہوگا، مگر میں آج تک ان مکانوں کی کشادگی، اونچی دیواریں، بے در محرابیں اور ان چمکتی ہوئی جالیوں کو بھلا نہیں سکی۔

گھر پہنچتے پہنچتے رات کے گیارہ بج جاتے۔ ہم بھی تھک کر چور ہوتے، مگر اس تکان میں کچھ عجیب سی لذت ملتی۔ تکان کے مارے بُرا حال ہوتا مگر چہرے پر ایک مسکراہٹ رہتی۔ بھیا اور ابا تو اپنے شکار کی فکر میں لگ جاتے، ''اماں ذرا شکار کو جلدی سے پکوائیے ورنہ یہ خراب ہو جائے گا'' کہتے رہتے۔ اسی وقت پیاز چھیلی جاتی، اسے تیل میں سرخ کیا جاتا اور پھر شکار کا گوشت پکتا۔ امی تھوڑی خفا خفا سی رہتیں، مگر ساتھ ساتھ بھیا کی مدد بھی کرتی جاتیں اور بولتی بھی جاتیں۔ پھر وہی بات دہراتیں، ''بتائیے عاصمہ بیچاری کو تو گھر کے پڑوس والے گھر میں بھی نہیں جانے دیتے تھے اور ان لوگوں کے یہ سیر سپاٹے...... مجھے یہ سب کچھ ایک آنکھ نہیں بھاتا!'' بھیا تو اپنے شکار میں بے حد منہمک رہتے۔ ہمارے تینوں بھائیوں کو کسی بھی کام کو کرنے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ گھر کا کوئی بھی کام ہوتا، یہ تینوں کرنے کو بس تیار رہتے۔ ابا نے بھی ساری زندگی دائی نوکروں کے رہتے ہوئے اپنی گنجی اور لنگی خود ہی دھوئی۔ کچن میں بھیا امی کی مدد کر کے شکار کا گوشت راتوں رات تیار کر دیتے۔ ہم لوگ تھک کر چور بستر پر پڑے رہتے، مگر بس ایک رات کے آرام سے وہ پوری تکان غائب ہو جاتی۔ پھر دوسرے دن اسی سفر کی باتیں ہوتیں اور دل و دماغ جیسے بشاش سے ہو جاتے۔

اس سبزہ زارِ کنجِ عافیت میں جیسا بھی وقت گزرتا، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے تک کی خبر باجی کو پاکستان بھیجی جاتی اور وہ...... وہ دوسرے ملک میں اس رنگ و نکہت اور مجلسی ہنگاموں کی خبر سن کر تڑپتیں اور بے چین ہوتی رہتیں۔ جب ان کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑتا، یعنی تڑپ بڑھ جاتی تو خبر آتی، ٹیلی گرام آتا کہ باجی فلاں تاریخ کو آ رہی ہیں۔ ہم لوگوں

کے ساتھ کچھ وقت بِتا کر انھیں تھوڑا سا سکون ملتا، مگر پھر وہی رخصتی کا دن آ جاتا اور پھر پورا گھر آنسوؤں میں ڈوب جاتا۔ چھوٹی باجی بھی ہم لوگوں سے ملنے ہندوستان آتیں۔

یہ رشتے بھی کتنے خوبصورت ہوتے ہیں! کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میں صرف ان تصورات کے سہارے ہی جی سکتی ہوں۔ امی کی ساری توانائی باجی اور چھوٹی باجی کی یاد میں ختم ہو جاتی۔ ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے سے پتہ چل جاتا کہ باجی اور چھوٹی باجی کے بغیر ان کا زندگی بسر کرنا محال ہو رہا ہے۔ ان کا حال ان کے چہرے پر لکھا ہوا ملتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ حسب معمول بہ ظاہر نظر آنے لگتا تھا۔ ابا کو جس طرح سے وقت وقت پر خط لکھنے کی عادت تھی وہ ورثے میں باجی کو بھی ملی تھی۔ ہر دو ہفتوں تین ہفتوں کے بعد باجی کا تفصیلی خط آتا تھا۔ ابا، امّی اور ہم لوگوں کے قلبی سکون کے لیے بس خط ہی ایک ذریعہ تھا۔

۱۹۸۸ء میں امی کو ہم سبھی نے امریکہ بلوا لیا۔ امریکہ آنے کی خواہش امی کو ذرا برابر بھی نہیں تھی۔ مگر ہم لوگوں کی خواہش کے سامنے آخر کار انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

پٹنہ کے مکان کی مالک، کتنوں کی ''ملکینی''، ''ماتا جی''، ''اماں جی''، ''حضور'' اپنا گھر بار، باغ، کھیت، پھلواری، گاؤں، زمینداری، ساری چیزیوں کو چھوڑ چھاڑ کر اولاد کی محبت میں اٹھ کر امریکہ چلی آئیں۔ اللہ رسول کی باتوں پر ایمان رکھنے والی، ہر چیز پر نظر رکھنے والی، ہر معاملے کو سمجھنے والی، اخبار کی گدیا، سیاست کو جاننے والی، پورے خاندان کو سنبھالنے والی، ہر کسی کے دکھ میں شریک ہونے والی، مدد کرنے والی امی نے ہم لوگوں کی بات مان لی اور یہاں کی بے رنگ زندگی میں ہم لوگوں کے ساتھ رہنے کو آخر کار تیار ہو گئیں۔

ابھی بھی جو میں امی کو اپنے تصور میں لا کر لکھ رہی ہوں تو مجھے یک بیک ان کا چمکتا ہوا چشمہ یاد آ رہا ہے۔ میں نے ایم۔اے (سائیکولوجی) میں پٹنہ کالج میں داخلہ لیا تھا تو وہاں کالج کی ساری سرگرمیوں میں کافی حصہ لیتی تھی۔ ایک بار Ladies common room کا ایک فنکشن رکھا گیا تھا جس میں یہ طے پایا کہ قوالی کا بھی ایک پروگرام رکھا جائے گا۔ قریب بارہ لڑکیاں قوالی میں حصہ لینے کے لیے تیار ہو گئیں۔ شمیم افزا اور میں صرف مسلمان تھیں، باقی ساری لڑکیاں ہندو تھیں، جن کو اردو آتی تو نہیں تھی مگر شعر و شاعری اور قوالی کا بے حد شوق تھا۔ میں نے غزل پسند کی

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

امی نے تھوڑی مشکل سے اجازت دی۔ تیاری شروع ہوگئی۔ ساری لڑکیوں کا تلفظ ایک مہینے تک درست کرواتی رہی۔ راگ بتاتی رہی، قوالی گانے کا انداز سکھاتی رہی۔ ہتھوا مہاراج جو عظیم آباد کے بہت بڑے راجہ تھے، ان کی بہو بھی میرے ساتھ پڑھتی تھیں اور وہ بھی قوالی گانے کے لیے تیار تھیں۔ کبھی ان کے گھر پر، کبھی کالج میں دیر دیر تک پرکٹس ہوتی رہتی تھی۔ ان کے میاں بیچارے ہم لوگوں کو اپنی Fiat گاڑی میں سلطان گنج کی پتلی گلی سے گزار کر گھر پہنچاتے تھے۔ آخر وہ دن آ گیا جس دن قوالی تھی اور دوسرے بھی بہت سے پروگرام تھے۔ امی کو بتایا تھا کہ صرف خواتین ہی سامعین میں ہوں گی اور واقعی یہ سچ بھی تھا اس لیے کہ یہ Ladies Common Room کا فنکشن تھا۔ جیسے ہی اسٹیج پر بیٹھ کر میں نے اپنا شعر گا کر اور لہک لہک کر سنایا:

اس محفلِ کیف و مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

کہ سامعین کی قطاروں میں سے امی کا چشمہ چمکا۔ میرا تو دل دھک سے ہوگیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے سامعین کی طرف تو بالکل ہی اندھیرا ہو رہا تھا، مگر میں نے امی کے چشمے کے فریم کو اس تاریکی میں بھی پہچان لیا تھا۔ مردوں میں صرف پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے اور ان کے ساتھ ایک دو دیگر پروفیسر وغیرہ تھے جو کہ آگے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن آدھے پروگرام میں ہی اقبال ہوسٹل کے لڑکوں نے دروازہ توڑ دیا اور ہال کے اندر بلا جھجک آ گئے۔ پرنسپل صاحب نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اگر یہ لوگ بن بلائے اس بدتمیزی سے داخل ہو ہی گئے ہیں تو ان کو آنے دیجیے۔ قوالی کو آخری آئٹم میں رکھا گیا تھا۔ میں نے تو جس وقت سے امی کے چشمے کے فریم کو پہچانا تھا، اس وقت سے گھبرائی ہوئی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا تھا کہ آج تو ایک بڑی آفت گھر جانے کے بعد آنے والی ہے۔ قوالی کا بھی نمبر آیا اور بہت ہی شاندار قوالی ہوئی۔ اس قدر تالیاں بجیں اور اتنی واہ واہ ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اپنا سامان سمیٹ کر میں پہلے ہی سے گھر بھاگنے کو تیار تھی، لہٰذا فنکشن ختم ہوتے ہی امی کے ساتھ گھر چلی گئی۔ گھر پہنچ کر امی بہت ناراض ہوئیں اور میں اپنی صفائی میں جتنا کچھ کہہ سکتی تھی، کہہ

گئی۔

اس واقعے کے بعد دو تین دنوں تک کالج نہیں گئی، اس لیے کہ میرے ڈیپارٹمنٹ یعنی Psychology Dept. کے بھی کچھ لڑکے اقبال ہوسٹل میں تھے، اور آخر وہی ہوا۔ یعنی جب کالج واپس گئے تو ریمارکس تازہ تازہ تیار تھے۔ ''کیسی چھپی رستم نکلیں!'' وغیرہ وغیرہ۔

امی کو منجھلے بھیا تھوڑی تھوڑی سیاست امریکہ میں بھی سمجھاتے رہتے تھے۔ اور وہ بڑے غور سے ساری باتیں سنتیں اور ایک سے ایک کمنٹ کرتی جاتیں۔ پریزیڈنٹ کلنٹن کے زمانے میں ملک کی حالت بہت اچھی ہوگئی تھی اور لوگوں نے اسٹاک کے ذریعے نہ جانے کتنا پیسہ بنایا۔ ان ساری باتوں کی واقفیت امی کو تھی۔ جب کلنٹن کے اسکینڈل کا ہنگامہ ہوا تو ہمیشہ بھابھی کو کہتیں ''ارے بھائی میرے اکاؤنٹ سے کچھ پیسہ اس بے چارے کلنٹن کو بھیج دو، سنا ہے کہ اس کے پاس وکیل کو دینے کے لیے پیسہ نہیں ہے۔'' اور یہ سب سن کر سبھی لوگ بے تحاشہ ہنستے۔

امریکہ میں رہ کر امی کو ایک سکون تھا کہ وہ اپنے سبھی بال بچوں کے ساتھ تھیں، لیکن ان کا دل اور دماغ ہندوستان اور ہندوستان کے اس محلے میں لگا رہتا تھا جہاں ان کی دبلی بوا، جلّو کی نانی، بنّی دادا، ربّانی اور حلیمہ تھیں۔ حلیمہ کے بوڑھے میاں تھے جو مغرب ہوتے ہی اپنی جوان بیوی کو لالٹین لے کر لینے آجاتے تھے، وہی حلیمہ جو ہم لوگوں کے ساتھ اپنی زندگی کی پہلی فلم ''مغلِ اعظم'' دیکھنے گئی تھیں اور واپس جب فلم دیکھ کر آئیں تو ان کے میاں گھر کے دروازے کے پاس لالٹین سمیت کھڑے حلیمہ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب بھی حلیمہ کے میاں حلیمہ کو لینے آتے، تو وہ بیچ میں ہی کام چھوڑ کر ان کے ساتھ روانہ ہو جاتیں۔ گھاس کاٹنے والی، سبزی والی، اور جانے کون کون! وہ محلّہ، وہاں کی آب و ہوا، آنگن کی مٹی کی خوشبو اور اس خوشبو کے ساتھ ساتھ اس میں چنبیلی اور بیلے کی خوشبو کی ملاوٹ کو امی بھی یاد کرتیں۔

امّی کا دل میرے ہی گھر میں سب سے زیادہ لگتا تھا۔ میرے ساتھ ان کا دل کیوں لگتا تھا، یہ میں نہیں جانتی ہوں۔ وہ اپنا سارا کام خود ہی کر لیتی تھیں۔ اپنی دوائیں خود ہی نکال کر وقت پر کھا لیتی تھیں۔ اپنے کمرے کی ہر چیز کو جگہ پر خود ہی رکھ لیتی تھیں۔ میں جب بھی کھانا پکانے جاتی، تو وہ میرے ساتھ کچن میں آجاتیں اور سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ جاتیں۔ اور ادھر اُدھر کی بہت ساری باتیں کرنے لگتیں، جو مجھے بے حد پسند تھیں۔ جب ان کو شام کے وقت کچن میں آنے میں کبھی دیر ہو جاتی، تو میں جا کر دیکھتی کہ ابھی تک کیوں نہیں آئیں۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کی باتیں اس طرح کرتیں جیسے یہ کل

کی بات ہو۔ امی کا حافظہ اس قدر تیز اور مضبوط تھا کہ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا تھا۔ کھانا پکاتے وقت امی کا کچن میں آجانا اور کرسی پر بیٹھنا، پھر ہم سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا، میری زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ان لمحوں کی یاد میری دولت ہے۔ میں ان ہی کے لیے اپنے کچن کی کھڑکی کے سامنے والی چھوٹی سی زمین کے ٹکڑے میں ایک ٹماٹر، ایک مرچ، دو بیگن کے پودے اور دھنیا پودینہ لگاتی تھی۔ وہ جب لمبی سی دریچی کے نزدیک جا کر کرسی پر بیٹھ جاتیں تو وہ چھوٹی سی بگیا ان کو نظر آتی اور اسے دیکھ دیکھ کر بے حد خوش ہوتیں اور بولتیں، ''اجی ٹماٹر پک گیا ہے، جا کر توڑ لو۔ ذرا بیگن میں اور مٹی ڈالو۔ دھنیا کے پتے توڑ لو، نہیں تو پودا بڑا ہو جائے گا۔''

ایسی ہی ایک شام تھی جب امی آہستہ آہستہ کچن میں چلتی ہوئی آرہی تھیں میں نے دیکھا تو سلام کیا، بولیں، ''وعلیکم السلام۔'' اور پھر کئی منٹوں تک دعائیں دیتی رہیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ پیسے تھے جس کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں، ''تمھارا کچھ پیسہ میرے پاس تھا، جو تم اسے لے لو...... زندگی اور موت کا کیا بھروسہ۔!'' میں نے کہا، ''چھوڑیے امی۔ آپ اس قدر حساب کیوں کرتی ہیں؟'' مگر وہ بضد تھیں۔ میں نے وہ پیسے آخر کار ان کے سکون کے لیے لے لیے اور مسالے والے دراز میں رکھ دیے۔ بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں، کچھ شیخوپورہ کی، کچھ پٹنہ کی۔ سبھی کے ہندوستان سے آئے ہوئے خطوط کی، ان لوگوں کی دن رات کی پریشانیوں کی، شادی بیاہ کی فکر کرتی ہوئی دیر تک ان باتوں میں مشغول رہیں۔ پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے چلی گئیں۔

اس روز میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ میں قریب نو بجے ہی سونے کو بستر پر چلی گئی۔ دو گھنٹے سونے کے بعد میری طبیعت کافی بہتر لگی۔ رمضان کی چار تاریخ تھی، سوچا کہ چلو نیند نہیں آرہی ہے تو قرآن شریف کی تلاوت ہی کر لیں۔ جیسے ہی قرآن پاک ہاتھ میں لے کر بیٹھی ہی تھی کہ امی کی آواز آئی، ''انجم! میری طبیعت اچھی نہیں لگ رہی ہے۔'' میرا دل بس ایک دم جیسے دھک سے ہو گیا۔ میں قرآن شریف رکھ کر امی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ امی بستر پر لیٹی تھیں اور بے چین ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا تو بولیں، ''سینے میں بہت جلن ہے۔'' ایسی تکلیف امی کو اکثر ہو جایا کرتی تھی۔ میں ہمیشہ ہی ایسی حالت میں اپنے بھائی بہنوں کو مارے گھبراہٹ کے بلا لیتی تھی۔ دو چار گھنٹوں میں امی ٹھیک ہو جاتی تھیں اور پھر سب اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے۔ میں نے امی کی اسی علالت کو اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ پھر بھی میں نے جلدی سے اپنے شوہر کو بلایا۔ اسی وقت فوراً انھوں نے جلدی سے بلڈ پریشر دیکھا تو بولے کہ بالکل نارمل ہے۔ سینے کی جلن کے لیے

ایک دوا دے دی۔ مجھے تھوڑا اطمینان ہوا۔ میں اسی کمرے میں امی کے ساتھ والی مسہری پر لیٹ گئی۔ امی کے سینے کو سہلاتی رہی۔ ہاتھ سہلاتی رہی۔ پوچھتی رہی، ''اب کیسی طبیعت ہے امی؟''

''نا جی، نا اچھا لگ رہا ہے۔''

مجھ سے تھوڑی دیر یعنی آدھ گھنٹے بعد بولیں، ''اب ذرا سا بہتر لگ رہا ہے۔'' مجھے تھوڑا اور بھی اطمینان ہوا۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو باتھ روم لے گئی۔ واپس آ کر بستر پر جلدی سے لیٹ گئیں۔ رات اسی طرح کی تھوڑی بے چینی میں اور تھوڑے اطمینان سے کٹی۔

صبح سات بجے امی نے پھر باتھ روم جانے کو کہا۔ صبح میں میرے شوہر امی کے پاس آئے اور مجھے ہدایت دی کہ آج ان کا ECG ضرور کروا لینا۔ نو بجے آفس کھل جائے گا۔ یہ سب سن کر پھر مجھے کچھ سکون سا لگا۔ ایک ڈاکٹر دیکھ رہا ہے تو کیسے نہیں اطمینان ہوتا۔ کسی کام کے لیے مجھے کچن میں آنا تھا تو میں نے اپنے بیٹے اسعد سے کہا، ''تم نانا کے پاس رہو۔ میں ابھی کچن سے آتی ہوں۔'' میں نے جیسے ہی کچن میں قدم رکھا کہ اسعد میاں دوڑے دوڑے میرے پاس آئے، بولے ''نانا مجھے پہچان نہیں رہی ہیں۔'' میں بے تحاشہ دوڑ کر کمرے میں گئی۔ ''امی تو سو رہی ہیں بیٹا...... جانتے ہو بیٹا، یہ رات بھر بے چین رہی ہیں، اسی لیے سو رہی ہیں۔''

ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ رات بھر نہیں سوتی تھیں تو دن کے گیارہ بجے تک سوئی رہتی تھیں۔ اسی بیچ میں میری بھتیجی شازیہ گھر میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے بے حد تقویت ملی۔ وہ بھی میرے ساتھ امی کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہم لوگ قریب ایک گھنٹے تک امی کے پاس بیٹھے رہے اور ماڈرن آرٹ پر گفتگو کرتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ امی سو کر اٹھیں تو ہم دونوں ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ یک بیک شازیہ نے کہا کہ پھوپھی جان، دوا بہت دیر سے ایک ہی کروٹ سوئی ہوئی ہیں۔ ان کا چہرہ دریچی کی طرف تھا، اس لیے چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں چونک اٹھی۔ اٹھ کر امی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ بازو کو سہلایا۔ ہلکی آواز سے پکارتے ہوئے، ''امی...... امی'' چہرے کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کے باہر دھنک کے اوٹ سے پھوٹتی ہوئی کرنیں میری امی کے چہرے کے چاروں طرف پڑ رہی تھیں۔ چہرہ روشن ہو رہا تھا۔ پلک پلک میں روشنی پروئی ہوئی تھی۔ کرنوں میں لپٹا ہوا ممتا کا پیکر بستر پر سکون کی نیند میں ڈوب چکا تھا۔ نیلگوں پردوں سے چھنتی ہوئی شعاعوں نے ہوا کے خوشگوار جھونکے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا...... اور میری امی اپنے معبود حقیقی کے پاس ایک روشنی کا ٹکڑا

بن کر جا چکی تھیں۔ ''شازیہ! میری امی اب نہیں رہیں!!'' ایسے چپکے سے چلی گئیں کہ مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔ ایسے بھی کوئی ہمیشہ کے لیے جاتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ شازیہ الگ چیخنے لگی، ''پھوپھی جان دڈا کو اٹھائیں...... پھوپھی جان دڈا کو اٹھائیں۔''

اور میں...... میں اپنی خاموش زبان سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے یہ پوچھتی رہی، ''امی آپ کن راستوں پر نکل گئیں؟ میں اب اس دنیا میں تن تنہا کیسے جیوں گی؟ ہر موڑ پر آپ کی کمی لگے گی تو اس وقت میں کیا کروں گی؟ میری کچن کی کرسی پر ہر روز بیٹھنے والی، کل سے میرا کیا ہوگا؟'' 911 کو فون کیا۔ شاید آج کل کی کسی مشین کے ذریعے سانس واپس آجائے۔ سب آئے اور سب کچھ کیا گیا، مگر ۱۹ر نومبر ۲۰۰۱ء کو میری امی کو ہم سے جدا ہونا تھا، سو وہ جدا ہو گئیں۔ مجھے جیسے چپ سی لگ گئی۔ میری دنیا کو ویران کر کے میری امی مجھ سے بہت دور چلی گئیں تھیں۔!

ماں، مادر، مدر، ماتر، مم، ممی، مما...... اور نہ جانے دنیا بھر کی سینکڑوں زبانوں میں ایسے کتنے ہی الفاظ ہیں جو بچہ سب سے پہلے کہنا سیکھتا ہے اور جو اس کی ماں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ماں کی نشاندہی یعنی درجنوں لوگوں کے ہجوم سے ماں کی آواز کو، اس کے لمس کو، اس کی خوشبو کو پہچاننا تو بچہ دو تین ماہ کی عمر میں ہی سیکھ جاتا ہے، لیکن ماں کو بلانا، مم مما ماما ممی وغیرہ اصوات لب، lip sounds بچہ سب سے پہلے کہنا سیکھتا ہے۔ یہی ماں ہے جسے دنیا کی پرانی تہذیبوں میں تخلیق کرنے والی دیوی کا رتبہ دیا گیا، اس کی پرستش کی گئی۔ اور آج بھی کلیسائی فرقوں کے مختلف عقائد میں مریم کو عیسیٰ مسیح سے بھی بڑا رتبہ دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کروڑوں ہندو دیوی ماں کے مختلف روپ مورتیوں کی صورت میں گھڑ کر پوجتے ہیں۔ وہ ''جننی'' ہے۔ جنم دینے والی ہے۔ اس دنیا میں لانے والی ہے۔ مگر ایک نکتہ جس کی طرف بہت کم دھیان دیا گیا ہے، وہ باپ ماں اور بچے کے مثلث میں باپ کا کردار ہے جسے ''پالنہار'' یعنی پرورش کرنے والا شاید صرف اس لیے کہا گیا ہے کہ مرد معاشرے میں ''کمائی کرنے والا'' تسلیم کیا گیا ہے۔ شاید کہیں کچھ، کسی حد تک یہ بات صحیح بھی ہو، لیکن اکثر و بیشتر یہ بات غلط ہے۔ ماں ہی، جنم دینے والی بھی ہے اور ماں ہی پالنہار بھی ہے، پالنے والی بھی ہے۔ اور یہ بات صرف انسانوں کی دنیا پر ہی لاگو نہیں ہوتی۔ ہر نوع اور ہر قسم کے جانور، پرندے اس اصول پر کاربند ہیں۔ اس لیے ماں کا رتبہ سب سے اونچا ہے۔

میں سوچتی ہوں کہ انسان جس قدر عظمت، اہمیت، تقدس، محبت، سیرابی، آسودگی، راحت، آرام، سکون، گرمی، ٹھنڈک، اطمینان وغیرہ وغیرہ سینکڑوں ہزاروں الفاظ کو اس قسم کے مختلف زبانوں میں ہوں گے، اور اپنی زبان میں ان الفاظ کی کیفیت کو ہم جانتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، پہچانتے ہیں۔ ان سب کا وجود ان سب کی ہستی ماں کے وجود سے، ماں کی ہستی سے وابستہ ہے۔ ماں ہی ایک چاند ہے، ایک سورج ہے، جس سے یہ تمام شعاعیں نکلی ہیں اور ہماری یادوں کے وجود میں سمائی ہوئی ہیں، اور سمائی ہوئی رہیں گی۔ ماں ہی سے سیکھ کر ہم اس کو خدا کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی اور جن کا بھی ہمارے ساتھ رشتہ ہے، اس رشتے کو ہم نے ماں ہی سے حاصل کیا ہے۔ باپ کو بھی ہم ماں ہی کے وجود سے جانتے ہیں۔ بھائی، بہن، بیوی۔ چچا، چچی، ماموں، ممانی، غرض کہ جتنے رشتے ہیں سب کی نسبیں ماں کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔ ماں نہ ہوتی تو ہم نہ ہوتے اور ہم سے کسی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ایک شخص کا باپ نہیں ہوسکتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ نہ تھے۔ بہن بھی نہیں ہوسکتی ہے، بھائی بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ بیوی بھی نہیں ہوسکتی ہے کہ وہ شادی نہ کرکے شوہر بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ بہت سی عورتیں بغیر شوہر کے رہی ہیں، لیکن ماں کے بغیر کسی کا وجود ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ساری محبت، عظمت، تقدس، رشتہ، ناتہ ماں ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ انسان وطن کو بھی ماں کہتا ہے، دھرتی کو ماں کہتا ہے۔ ندی کو بھی، انسان پانی کی بھی پوجا کرتا ہے۔ دھرتی سیرابی دیتی ہے۔ آگ کی بھی پوجا کرتا ہے کہ وہ گرمی اور حرارت دیتی ہے۔ مٹی کی بھی پوجا کرتا ہے کہ اس کا وجود ہی مٹی سے ہے، ہوا کو بھی، اس لیے کہ ہوا ہی پر اس کی زندگی ہے۔ تو زندگی جس چیز سے پہلی بار یہ تمام تعلقات اور رشتے سکھلاتی ہے، وہ ماں ہے۔

خدا نے بھی ماں کی عظمت بتائی اور ماں کے قدموں کے نیچے آخری آرام گاہ چھپا دی۔ پہلی اور آخری آرام گاہ دونوں ماں ہی میں ہے۔ ماں کے پیٹ سے نکل کر قبر کے پیٹ میں اور آخر میں جنت کے پیٹ میں انسان جائے گا۔ اگر خدا کا وجود نہ ہوتا تب بھی انسان ماں ہی کو اپنے وجود کا ماخذ کہتا، اس کی پرستش کرتا۔ دنیا بھر کی پرستش اسی طرف منتقل ہوتی ہے۔ خدا جانے ماں کو قدرت نے کسی عظیم نیت سے پیدا کیا کہ خدا کے بعد کسی مرکز کے گرد اگر دنیا پھرتی ہے تو ماں ہی ہے۔ جیسے خدا کا درجہ اب تک نہ کھلا ہے، ماں کا درجہ بھی نہیں کھلا ہے۔ شاید جس وقت خدا کا درجہ صحیح طور پر واضح ہوگا، ماں کے درجے کا تعین بھی شاید اسی وقت ہوگا۔ خدا حیاتِ کائنات میں وہ گتھیاں ہیں جن کے کھولنے میں انسان ازل سے مصروف ہے اور ابد تک مصروف رہے گا۔ شاید ماں کی گتھی ہی اسی وقت کھلے۔

اپنی امی کی رحلت کے وقت تو یہ سب باتیں میرے ذہن میں نہیں آئیں، لیکن اب جب میں ان کی زندگی کے آخری دنوں پر غور کرتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک مثالی (آئیڈیل) ماں بن کر رہیں۔ اس میں ایک مرکزی نقطہ تو ان کی Core family کا تھا یعنی وہ، ان کے شوہر اور ان دونوں کے بچے، یعنی ہم لوگ۔ اس کے بعد ان کی extended family تھی جس میں ننھیال اور ددھیال کے سگے سمبندھی تھے، اور درجہ بدرجہ، رتبہ بہ رتبہ، ضرورت بہ ضرورت وہ ہر ایک کے ساتھ ایک مثالی ماں، مثالی بھابھی، مثالی بہن، مثالی خالہ یا پھوپھی کا سلوک روا رکھتی تھیں۔ اس کے بعد گھر محلّہ۔ گاؤں کے لوگ تھے۔ جن سے محبت کے رشتے تھے، جن سے پیار اور دلار کا تعلق تھا، جن کو وہ ضرورت مند سمجھتی تھیں۔ ان سبھی کے لیے بھی وہ ایک مثالی ماں تھیں۔

اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔!

میری امی (بی بی رابعہ خاتون)

شبنمی چادر

وہ ہلتا ڈولتا سا کونہ تیرے آنچل کا
اور اس میں جھانکتا سا تیرا نقرئی چہرہ
کبھی جو آ گیا نظروں کے سامنے میرے
میرے وجود کا سب بوجھ کر گیا ہلکا

اے میری ماں اے میرے دل کی چین صبر و قرار
تو یہ سمجھ کے گیا جا کر چھپی ہے زیر زمیں
کہ بھول جاؤں گی میں تیرا چاندنی سا وجود
نہیں نہیں، نہیں ہرگز نہیں کبھی بھی نہیں

میں گوشہ گوشہ میں گھر کی جہاں بھی پھرتی ہوں
ہر اک گوشہ تیری شخصیت سے تاباں ہے
ہر اک کتاب ہے تیری ہی زندگی کا ورق
ہر اک لفظ میں تیرا ہی درس چسپاں ہے

ہر اک طرف تیری ہی باتوں کا اُجالا ہے
تری زباں کا ہے ہر لحظہ جاگتا جادو
ترے خیالوں میں تیری ہی گنگناہٹ ہے
ہر ایک بول میں پوشیدہ ہے تری خوشبو

ترے سکوں کی قسم تیری خامشی کی قسم
میں تیرے پیار ہی کا گیت گنگناتی ہوں
تری ہی ڈانٹ کی موسیقیت میں جھومی ہوں
انھیں میں ڈوبتی ہوں پھر ابھر کے آتی ہوں

کبھی بھلا سکوں تجھ کو یہ کیسے ممکن ہے
چمکتے رہتے ہیں ہر وقت میرے دامن میں
تری جدائی کے اشکوں کے گوہر نایاب
اندھیری راتوں میں بُنتی ہوں چاندنی کے خواب

میں سنتی رہتی ہوں آہٹ ترے ہی قدموں کی
انھیں میں چھو سکوں مجھ میں کہاں یہ قدرت ہے
مگر تڑپ ہے کہ میں کاش ان کو چھو سکتی
کہ جن کے سائے میں پوشیدہ میری جنت ہے

تو مجھ کو چھوڑ کے پت جھڑ کے موسموں میں گئی
تری لحد کو میں پھولوں سے ڈھانپ آئی ہوں
اگرچہ ڈالی میں اک پھول بھی نہ باقی تھا
مگر ان آنکھوں میں پھولوں کا ڈھیر کافی تھا

انھیں کی شبنمی چادر بچھا کے آئی ہوں
میں رو کے آئی ہوں سب کو رُلا کے آئی ہوں

(۸)

میرے دادا سید اظہر حسین ایک غریب آدمی تھے۔ میر ابیگھہ، بہار، صوبۂ بہار، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد شاہو بیگھہ میں رہنے لگے جو کہ میر ابیگھہ سے قریب تھا۔ میری دادی، بی بی علیمن کو بچوں کی تعلیم وتربیت کی بہت زیادہ فکر رہتی تھی۔ آج ہم لوگوں کے خاندان کے لوگ جس مقام پر ہیں، وہ ان ہی کی جان لیوا محنت کا نتیجہ ہے۔ شاہو بیگھہ سے وہ پٹنہ شہر اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں آئیں۔ ان دنوں بانکی پور پٹنہ، گول گھر کے سامنے ڈھائی روپے ماہانہ کے کرایہ کا مکان لیا اور بچوں کا اسکول میں نام لکھوایا۔ اس گھر سے چل کر بڑے ابا، میرے ابا اور چھوٹے ابا اسکول جاتے تھے۔ ان تینوں کو پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق بھی تھا۔ اسی لیے اسکول میں اعلیٰ نمبروں سے پاس بھی ہوتے تھے۔

بڑے ابا ۱۹۴۰ء میں داروغہ ہوئے جو کہ اس زمانے کے لیے ایک اچھا عہدہ تھا۔ میرے ابا کو وکالت کرنے کا بے حد شوق تھا، سو وہ پٹنہ ہائی کورٹ کی نوکری کے بعد وکالت کرنے لگے۔ چھوٹے ابا نے جغرافیہ میں ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے۔ پٹنہ کالج میں صدر شعبہ جغرافیہ کے پروفیسر ہوئے اور پھر بعد میں کامرس کالج پٹنہ کے پرنسپل ہوئے۔ اس کے بعد بہت دنوں تک امریکہ میں University of Kentucky میں جغرافیہ کے پروفیسر رہے۔ میری ایک پھوپھی بھی تھیں جن کا نام انیس فاطمہ تھا جو انسو کہلاتی تھیں۔

میں نے اپنے دادا کو نہیں دیکھا۔ وہ میری پیدائش سے بہت پہلے انتقال کر گئے تھے، مگر میں ان کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ وہ ایک بہت ہی نیک اور سادہ انسان تھے۔ درحقیقت غریب لوگ سادہ ہی ہوتے ہیں۔ شاید پیسے اور اخلاق میں کوئی بیر ہے۔ جہاں پیسہ ہوتا ہے، وہاں اخلاق نہیں اور جہاں اخلاق ہوتا ہے وہاں پیسہ نہیں ہوتا۔ اور جہاں یہ

میری بھتیجی (چچازاد) بہن صالحہ خاتون، شادی کے بعد

چھوٹی اماں (زینب النساء)

دونوان چیزیں ملتی ہیں اس گھر کے افراد میں ضرور کوئی ایسی نرالی بات ہوتی ہے جو انھیں دیگر لوگوں سے ممتاز بناتی ہے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پنپتی ہیں وہ گھر بے پناہ برکتوں والا ہوتا ہے۔ میرے دادا کو دنیا داری نہیں آتی تھی۔ بچے گھر میں اور بچوں میں ہی بس مگن رہتے تھے۔ سادگی کی بہت ساری شکلیں ہوتی ہیں۔ وہ اس انتہا تک سادہ تھے کہ ایک بار کا واقعہ میری بڑی اماں (چچی) بتاتی تھیں کہ گاؤں میں کسی کا انتقال ہوگیا۔ دادا گھر پر آئے اور بولے، ''بھئی میری پوتی کو لاؤ (یعنی بڑے ابا کی لڑکی جن کا نام صالحہ تھا) اور میرا کھانا بڑھا دو۔ اب تو تم لوگ رونے دھونے میں لگ جاؤ گی۔'' شاید اس بات کو سن کر کوئی کچھ اور اندازہ لگائے، مگر بڑی اماں یہی کہتی ہیں کہ یہ ان کی معصومیت اور سادگی کی انتہا تھی۔ بڑی اماں ہمیشہ اپنے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے مخصوص انداز میں یہ سب کہانیاں ہم لوگوں کو سناتی تھیں، اور میں گھنٹوں وہاں بیٹھ کر کرید کرید کر بڑی اماں سے پچھلی باتیں پوچھتی رہتی تھی۔ ہم لوگ فرمائش کرتے جاتے، ''بڑی اماں کچھ اور سنایئے نا!''

مگر آج کا دور بہت ہی مختلف ہے۔ اب بڑے بوڑھوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنسنا بولنا معیوب سی بات سمجھی جاتی ہے۔ جوانوں کی پارٹیاں الگ، ہنسنا بولنا الگ، یہاں تک کہ درس اور مذہبی محفلیں بھی الگ ہوتی ہیں، جہاں بڑوں کا داخلہ قریب قریب ممنوع ہوتا ہے۔ ہم جب ہنستے بولتے، گاتے بجاتے تھے، تو بزرگوں کے سامنے، اس لیے کہ ہم جانتے تھے کہ ہمارے خوش ہونے سے وہ خوش ہوں گے۔ ہمیں خوش دیکھ کر ان کے دل کو ٹھنڈک حاصل ہوگی۔ درحقیقت ان آفتابی لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے میں الگ لطف تھا۔ ان لمحوں سے مجھے ایسی لذت حاصل ہوئی ہے کہ جس کو میں ضابطۂ تحریر میں بھی نہیں لا سکتی۔

بڑے ابا کی صرف ایک لڑکی تھیں جن کا نام صالحہ خاتون تھا۔ گھر میں سب سے پہلا بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ یوں بھی بہت زیادہ دلارا ہوتا ہے، اس لیے صالحہ باجی جب اس گھر میں پیدا ہوئیں تو دادا دادی اور ماں باپ کی بہت زیادہ پیاری تھیں۔ ہر شخص کی توجہ گھر میں ان ہی کو ملتی رہی۔ اور ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی بہت اعلیٰ ہوئی۔ بڑی اماں اور دوسرے لوگوں سے انھوں نے ڈھنگ، سلیقہ سیکھا اور یوں بھی فطری طور پر عادت کی بے حد اچھی تھیں۔ نازک سی اور نرم لہجوں میں باتیں کرنے والی۔ دیکھنے میں بے حد خوبصورت، لمبے لمبے بال، بڑی بڑی آنکھیں اور بڑی اماں کی طرح گوری۔ شادی بیاہ میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شوہر ڈاکٹر تھے اور ازدواجی زندگی بھی خوش گوار تھی۔ لیکن بڑی اماں اور بڑے ابا کی خوشی بہت دنوں تک نہیں رہ سکی۔ صالحہ باجی کی بچے کی پیدائش کے فوراً بعد طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ بچی تو تندرست ہوئی مگر

زچے کو کوئی بچا نہیں سکا۔ اللہ کا جو حکم تھا وہی ہوا اور اتنے سارے پیار کرنے والوں کو دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ بچی کا نام سلطانہ بانو رکھا گیا۔ ان ہی دنوں میں بھی پیدا ہوئی تھی، اس لیے امی میرے ساتھ ساتھ سلطانہ کی بھی دیکھ ریکھ کرتی تھیں اور سلطانہ کو اپنے کلیجے سے لگا کر رکھنے لگیں۔ سلطانہ کو دودھ پلا کر وہ اس کی دودھ ماں بن گئیں۔ بڑی اماں دلگیر ہو کر کہتیں، ''جب وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو اس ننھی سی جان کا کیا بھروسہ ہے۔''

بڑے ابا اور بڑی اماں بالکل ٹوٹ گئے تھے۔ ایک دو سال کے اندر ہی بڑے ابا اس دنیا سے بیٹی کے غم میں رخصت ہو گئے۔ بڑی اماں پر پھر ایک اور غم پڑا اور پچھلا غم جیسے اور بھی تازہ ہو گیا مگر نواسی کو دیکھ کر جینے کی خواہش نے ایک ہلکا سا سر اٹھایا اور ایک بار پھر بڑی اماں نے سلطانہ کی دیکھ ریکھ کرنی شروع کر دی۔ بڑی اماں سلطانہ کی دیکھ ریکھ میں اس قدر محنت کرتی تھیں کہ میں اپنی کم عمری میں بھی اس بات کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

سلطانہ نے ناشتہ نہیں کیا ہے...... اس بات کا شور پورے گھر میں صبح صبح مچا رہتا اور بڑی اماں اپنی بے حد سفید اور نفیس ساری کو سنبھالے ہوئے کبھی اپنے کمرے میں جاتیں، کبھی باورچی خانے میں اور کسی نہ کسی طرح سے سلطانہ کے ناشتے کے ہی سلسلے کی بات کرتی جاتیں۔ ایک بچے کو بہ خوبی یہ علم رہتا ہے کہ وہ کس کس طرح سے اپنی ماں کو پریشان کر سکتا ہے۔ لہٰذا سلطانہ بی بی بھی طرح طرح کے ناز دکھاتی ہوئی بڑی اماں کو پورے گھر میں دوڑاتی رہتی تھیں۔ بہ ظاہر بڑی اماں تھکی تھکی آواز میں کہتیں، ''اللہ، اس لڑکی نے پریشان کر دیا ہے۔ نہ ٹھیک سے کھاتی ہے نہ پیتی ہے، ہم کیا کریں!'' مگر در حقیقت وہ اس طرح سے دوڑنے اور سلطانہ کا تھک تھک کر کام کرنے میں بے حد خوشی محسوس کرتی تھیں۔

بڑی اماں کے کمرے میں ایک نعمت خانہ ہوا کرتا تھا اور اس نعمت خانے میں سلطانہ کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر کھانے پینے کی چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ ہم لوگ جب بڑی اماں کے کمرے میں جاتے تو بڑی اماں ہم لوگوں کو بھی مٹھائیاں، حلوے اور کلچے وغیرہ ضرور دیتیں۔ وہاں دو بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک بڑی اماں کے لیے اور ایک سلطانہ کے لیے۔ ہم لوگوں کی اکثر شامیں اسی کمرے میں گزرتی تھیں، جہاں سے بیٹھے بیٹھے باہر سے کمپاؤنڈ میں داخل ہونے والا ہر شخص نظر آتا اور پھر باہر جانے والا بھی اسی کھڑکی سے نظر آتا۔ بڑی اماں اپنے بستر پر بیٹھی بیٹھی ہم لوگوں کو بڑے ابا، ابا، چھوٹے ابا، دادی اور دادا کے بارے میں تفصیل سے بتاتیں اور ہم لوگ اس انہماک سے یہ سب سنتے جیسے کوئی الف لیلہ کی کہانی سنا رہا ہو۔

بچپن کے ان ہی لمحوں سے زندگی کا جیسے ایک ڈھانچا سا تیار ہوا۔ وہیں سے میرے تصور کی سفید دیوار پر رنگ و

روغن چڑھا۔ پیار اور محبت کی سبز بیلیں لہراتی ہوئی پھر اسی دیوار پر چڑھتی گئیں۔ مجھے ان ہی چھوٹی چھوٹی کچی کچی باتوں سے بڑی بڑی قوتیں ملیں۔ ان معمولی اور چھوٹے سے لمحوں کو اپنے دل میں قید کر لینے کو ہی فلسفہ کہتے ہیں۔ جس طرح سے ایک کمرہ بڑی اماں کا چھوٹے ابا کے گھر میں تھا، اسی طرح ایک کمرہ ہم لوگوں کے گھر میں نانی اماں کا تھا، جہاں میرا دل لگتا تھا۔ بے خوف وخطر وہاں گھنٹوں گپیں لگانا، گیت گانا، لطیفوں پر بے تحاشہ ہنستے جانا ایک معمول بن گیا تھا۔ لڑکپن کی یہی باتیں، داستانیں، گیت اور نغمے انسان کو ساری زندگی سہارا دیتے ہیں، طاقت دیتے ہیں۔ بڑی اماں تو ہر کسی سے محبت کرتی تھیں اور ہر کوئی ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ان کے محبت کرنے کا انداز بہت ہی مختلف تھا۔ اتنا مختلف کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی بے غرض محبت، جس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے۔ آج کل لوگ نئے نئے رشتے جوڑتے ہیں۔ منھ بولے بھائی، منھ بولی بہن، گاڈ مدر، گاڈ فادر، لیکن جو بنا بنایا رشتہ اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس کو نبھانے کی کوئی فکر نہیں۔ بڑی اماں تو رشتہ داروں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ انھیں محبت کرنے کی جیسے عادت تھی۔ آنکھوں دیکھی کہانیاں سنانے والی بڑی اماں اپنے کمرے میں سب چیزوں کو بڑے سلیقے سے رکھتی تھیں۔ کسی شخص کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی، بڑی اماں کے پاس وہ چیز موجود ہوتی تھی۔ مگر ان کا اصول یہ بھی تھا کہ ان کی چیزوں کو بس کام ختم کرتے ہی فوراً واپس کرنا ضروری تھا۔

سلطان گنج پٹنہ میں جس زمین پر ابا اور چھوٹے ابا نے مل کر مکان بنوایا تھا، اسی کے ساتھ ایک چھوٹی قطعۂ اراضی بھی تھا جس پر بڑی اماں نے اپنا گھر بنوایا تھا۔ مگر وہ گھر ہمیشہ کرائے پر اٹھا رہتا تھا۔ بڑی اماں ہمیشہ چھوٹے ابا کے ساتھ ہی رہیں۔ چھوٹے ابا ان کو اپنے گھر سے جانے نہیں دیتے تھے اور وہ اسی گھر میں اپنا پیار و محبت لٹاتی رہیں۔

بڑی اماں بالکل گوری چٹی تھیں۔ اپنے زمانے میں تو وہ ایک حسینہ رہی ہوں گی۔ اس عمر میں بھی ان کے کالے کالے لمبے بالوں کو ہر کوئی دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ ستر سال کی عمر میں بھی ان کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ اپنے بالوں کو کسی معمولی صابن یا مٹی سے دھوتی تھیں۔ لیکن ان کے بالوں کی رنگت اور چمک اپنی جگہ پر قائم رہتی تھی۔ ہم نے ہمیشہ ان کو سفید کوردار ساری ہی میں دیکھا۔ بہت ہوا تو چھوٹی چھوٹی پرنٹ کا شلوکہ (Blouse) بنوا لیتی تھیں۔ اکثر جب وہ اپنی میلی ساری کی طرف اشارہ کرتی تھیں، "دیکھو جی، میری ساری کیسی میلی چکٹ ہوگئی ہے۔" تو ہم لوگ تعجب سے دیکھتے تھے کہ یا اللہ یہ میلی ہے، یہ تو سفید براق ہے۔ ہر کام کو سلیقے سے اور آہستہ آہستہ کرتی رہتی تھیں۔ گھر کے ہر آدمی کو ہر بات کی یاد دہانی کرانا، سب کو ہدایت کرنا، ان کا ایک خاص انداز تھا جو کوئی اور ان کی جگہ لے ہی نہیں سکتا تھا۔

دائیں سے۔ شرکائے مجلس کے ساتھ علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی، حسن اکبری، فضل الرحمن عرف قاجو، محمد حسن عرف ممدو، ولی الحق وزیر حسن، محمد مصطفےٰ، اکرام الحق، ریاض الدین خیرات، حسن، محی الدین احمد، منشی رام اوتار لال، پاستدلو۔ یہ تصویر دسویں محرم ۱۹۳۷ء سے قبل کی ہیں۔

بائیں طرف سے۔ پروفیسر اختر اور بیوی، شرف الدین احمد کرسیوں پر۔ آفاق شرف، شکیلہ اختر (10 دسمبر ۱۹۴۰ء

علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی

ایک بار کی بات یاد آ رہی ہے۔ کسی نے مجھے یہ خبر دی کہ لکھنؤ سے کوئی ادیبہ چھوٹے ابا کی یہاں آئی تھیں جن کو شعر وشاعری کا بھی شوق تھا اور یوں بھی ایک دلچسپ شخصیت کی مالک تھیں۔ جس دن مجھے پتہ چلا کہ وہ آئی ہیں تو اسی دن مغرب کے بعد میں ان سے ملنے گئی۔ جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ وہ صاحبہ جو کافی بھاری بھر کم سی تھیں، پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ بڑی اماں بھی اسی پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ کر ان کو ہاتھ کے تاڑ والے پنکھے سے پنکھا جھل رہی تھیں۔ ہم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو بڑی اماں بولیں کہ "ارے بیٹھو جی انجم۔ ارے سنو سنو یہ ایسی اچھی اچھی شاعری کرتی ہیں کہ کیا بتائیں۔" پھر بڑی اماں خود ہی ان صاحبہ سے کہنے لگیں کہ "ہاں تو کیسے کہیے ہے (کہتی ہیں) سنایئے سنایئے نا۔ انجم کو شعر و شاعری کا بڑا شوق ہے۔" وہ صاحبہ بھی ایک خاص شخصیت کی مالک تھیں۔ عمر قریب قریب ساٹھ پینسٹھ کی ہوگی۔ بھاری بدن، چہرے پر منوں میک اپ اور ہم لوگوں کے باغ سے توڑا ہوا بڑا سا لال گلاب بالوں میں چمک۔ ہاتھا۔ لکھنوی لہجے کی مالک۔ میں خاموشی سے وہاں کی فضا کا جائزہ لیتے ہوئے پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ وہ خود شاعرہ نہیں تھیں لیکن دوسروں کے اشعار جھوم جھوم کر سنانے لگیں اور بڑی اماں کے ہاتھ کا پنکھا بھی داد دینے میں اور بھی زور زور سے چلنے لگا۔ اور وہ صاحبہ مارے خوشی کے نہ جانے کتنی غزلیں سنا گئیں۔ ہمیں بھی خوب مزہ آیا۔ اب تو بڑی اماں ان کی خدمت کر کے پریشان تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد پھر بڑی اماں کے پاس گئے تو دیکھا کہ پیالی میں دودھ لے کر ان صاحبہ کے سامنے کھڑی ہیں اور ان سے کہہ رہی تھیں...... "آپ کی ہر چیز بہت اچھی ہے، بات چیت، شاعری، مگر یہ منہ میں اتنا لال پیلا کا ہے کو لگا لیجیے ہے؟" یہ سن کر میں جو ہنستی ہوئی بھاگی تو پھر دوسرے ہی دن ملاقات ہوئی۔

اکثر صبح کے وقت برآمدے کی چوکی پر جب جاڑے کی دھوپ آ جاتی تھی تو بڑی اماں، چھوٹی اماں اور میری امی تینوں ایک ساتھ بیٹھ جاتیں۔ سبزی والی بھی سبزی بیچنے کو اپنی ٹوکری سر پر سنبھالتی ہوئی ٹھیک اسی وقت آ جاتی تھی۔ اور یہ تینوں سبزیاں پسند کر کے خریدتیں اور امی بھی سبزی خرید کر بڑی اماں اور چھوٹی اماں کے ساتھ مل کر سبزی بنا لیتیں۔ ان تینوں میں ایک سے ایک آپس میں گپیں چلتی تھیں۔ پھر جب سبزی بننے کا سلسلہ ختم ہوتا تو اردو کا اخبار آ جاتا جس کو زیادہ تر بڑی اماں زور زور سے پڑھتیں اور امی اور چھوٹی اماں بڑے دھیان سے سنتی رہتیں۔

ایک دن بڑی اماں اخبار پڑھ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں، "سنا منجھلی، شرمیلا ٹیگور نے جو نواب پٹوڈی سے شادی کیا ہے تو ان کی ساس بہو کی بڑی تعریف کریں ہیں (کرتی ہیں)۔ کہے ہیں (کہتی ہیں) کہ میری بہو اب بڑے مزے سے

علامہ سیّد کاظم علی جمیل مظہری

سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی

کلیم عاجز

ٹھیک ٹھیک قرآن شریف پڑھتی ہے اور سمجھتی ہے۔ بتایئے تو منجھلی (امی کو منجھلی کہتی تھیں) یہ فلم کی ایکٹریس کا (کیا) قرآن بھلا پڑھتی ہوگی؟ اور کاہے کو سمجھتی ہوگی۔ بتایئے ذرا کیسی کیسی بات ہے۔" ایسی ایسی نہ جانے کتنی باتیں یہ تینوں آپس میں کرتی تھیں۔ اور ہم لوگ اکثر ان لوگوں کی باتوں کو سنتے رہتے تھے اور بعد میں خوب ہنستے تھے۔

بڑی اماں اور میری امی نے کبھی بھی گیت نہیں گایا لیکن چھوٹی اماں بے حد حسین حسین سُر والی گیتوں کو گاتی تھیں۔ ہم لوگوں نے گیت ان ہی سے سیکھا۔ چھوٹی اماں جب اپنے خاص انداز سے ڈھول بجا کر گانے لگتی تھیں تو بڑی اماں اور امی دونوں ان کے ساتھ بیٹھتی تھیں اور دھیان سے پورا پورا گیت سنتی تھیں اور ایک کے بعد دوسرا گیت یاد دلاتی تھیں۔ پھر بیچ بیچ میں گیت پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے یہ تبصرے مجھے اس وقت بھی بھلے لگتے تھے اور آج بھی یاد کر کے جھوم جاتی ہوں۔ زندگی کیا تھی کسی دھن پر کوئی البیلی حسینہ اپنے آپ کو مٹکاتی چلی جا رہی ہو۔ ہر چیز سے جیسے سُر اور لے بندھا رہتا تھا اور اسی دھن پر ہر کام ہوتا تھا۔ اور اس وقت کے سارے لوگ سب بڑے اور چھوٹے کاموں پر ان ہی نغموں کی لے پر جھومتے جاتے تھے۔ بڑی اماں کی عزت، دائی اور نوکر سے لے کر گھر کا ہر فرد کرتا تھا۔ ان کی وجہ سے گھر کے ماحول میں ایک ایسی موسیقیت رہتی تھی کہ زندگی کیا تھی، بہار کا ایک موسم تھا!

اب بھی جب میں سلطان گنج جاتی ہوں اور میری نظریں بڑی اماں کے کمرے کی طرف اٹھتی ہیں تو میرے کانوں میں نہ جانے بہ یک وقت کتنی کھنکتی ہوئی آوازیں، کھلکھلاتی ہوئی ہنسی، شوخ لہجے اور گنگناتی ہوئی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ یہ آوازیں مجھے چند لمحوں کے لیے روک لیتی ہیں اور میں ...... میں ان خوشبوؤں اور ان آوازوں میں کچھ اس طرح گرفتار ہو جاتی ہوں کہ مجھ کو اپنے آپ پر بھی جیسے کوئی اختیار نہیں رہتا ہے۔ میں یہ سوچنے لگتی ہوں کہ سنہرے دن کبھی ٹھہر کر رُک کیوں نہیں جاتے ہیں؟ وہ دن گزر کر اس بے دردی سے ماضی کیوں بن جاتے ہیں؟

سلطانہ کی شادی کا وقت آ گیا۔ شادی ہوگئی اور کچھ دنوں کے بعد سلطانہ اور ان کے دلہا (مظاہر عالم) پاکستان روانہ ہو گئے۔ بڑی اماں کی زندگی سبھی لوگوں کے رہتے ہوئے سلطانہ کے بغیر ویران سی ہوگئی۔ سلطانہ کی جدائی ان سے برداشت نہ ہو سکی اور آخر کار اپنی نواسی یعنی اپنی زندگی سے قریب رہنے کی تمنا میں پاکستان روانہ ہو گئیں۔ ہم لوگ جب جب کراچی گئے ان سے ملنے کو جاتے بلکہ کبھی وہ کئی کئی دنوں کے لیے باجی کے یہاں ہی رہنے کو آ جاتیں، اور ہم لوگوں سے

ایسے بے تاب ہو کر ملتی تھیں، اس طرح سے سینے سے لگاتی تھیں، ان کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی تھی کہ اسے میں آج بھی محسوس کرتی ہوں۔ ہم بچی کے لیے ان کا پیار بہت ہی انوکھا تھا۔ ایسا انوکھا جسے الفاظ کا جامہ پہنانا آسان نہیں ہے۔ کراچی سے سلطانہ چند ہفتوں کے لیے ہندوستان رشتہ داروں سے ملنے گئیں، ان کی غیر موجودگی میں بڑی اماں کی آناً فاناً طبیعت خراب ہوئی اور خود کو اسی طرح سنبھالتی ہوئی اپنے معبود سے جا ملیں۔ سلطانہ روتی دھوتی ہوئی واپس آئیں، مگر جو وقت مقرر تھا اسے کون ٹال سکتا تھا۔ سلطانہ کیا اس بات کا قلق تو آج تک ہم لوگوں کو بھی ہے، سلطانہ کا کیا پوچھنا۔

میرے ابا تین بھائی تھے لیکن ان کی صرف ایک بہن تھیں۔ میری پھوپھی کے تین لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑے لڑکے کا نام علی امام تھا۔ منجھلے کا حارث امام اور چھوٹے کا وارث امام تھا۔ لڑکی کا نام باندی خاتون تھا۔ حارث بھائی کا انتقال تو پٹنہ ہی میں ہو چکا تھا مگر یہ تینوں بھائی بہن ہجرت کر کے بہت قبل ہی پاکستان روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی پھوپھی کو کبھی نہیں دیکھا۔ ان کا انتقال میرے ہوش سنبھالنے سے قبل ہو چکا تھا۔

امی کے ساتھ جب میں پاکستان گئی تھی تو علی امام بھیا اور باندی بوبو سے ملنے کراچی میں ان کے گھر گئی تھی۔ باندی بوبو کی شادی ہوئی تھی اور ان کی ایک لڑکی بھی تھی۔ مگر لڑکی کی پیدائش کے تھوڑے ہی دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور کچھ دنوں کے بعد شوہر بھی ان کو دنیا میں تن تنہا چھوڑ کر چل بسے۔ چھوٹے بھائی یعنی وارث امام بھائی کی شادی ہوئی اور ماشاء اللہ اپنے بال بچوں کے ساتھ ابھی بھی کراچی ہی میں مقیم ہیں، مگر علی امام بھیا نے شادی نہیں کی اس لیے دونوں بھائی بہن ساتھ رہتے تھے۔

علی امام بھیا اور باندی بوبو سے جب میں ملنے گئی تھی تو اس کا ایک ایک سین مجھے یاد ہے۔ گھر کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ بچی اور شوہر کے چلے جانے سے باندی بوبو کی بکھری بکھری سی شخصیت اور اس دکھ اور غم کے ماتم سے اس گھر کا ماحول ایک مدت گزرنے پر بھی سیہ پوش تھا۔ اُدھر نہ جانے کون سی مجبوری تھی جس کی وجہ سے علی امام بھیا نے شادی نہیں کی اور دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کا سہارا بنے ایک دوسرے کو سہارا دے رہے تھے۔ زندگی گزارنے کے لیے دونوں ایک دوسرے کے لیے بہانہ بنے ہوئے تھے۔

اس گھر کا منظر کچھ اس طرح سے اُدھڑا ہوا تھا کہ جب میں مغرب کے وقت اس گھر میں داخل ہوئی تو ایسا لگا کہ یہاں چپ کا ایک دار دورہ ہے۔ شاید گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔ مگر ہم لوگوں کے پہنچتے ہی کسی کونے سے باندی بوبو نے امی

کے گلے میں آ کر اپنی بانہیں ڈال دیں اور تپاک سے ملیں۔ شگفتہ گفتگو کرنا تو خیر دور کی بات تھی، مگر جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کہ میری بکھری بکھری سی باندی بو بو تو امی سے لپٹ کر روئی بھی نہیں تھیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ شاید وہ غم کی انتہا تھی یعنی مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔ اپنے دل کا کوئی حال بیان نہیں کیا، جیسے کہہ رہی ہوں کہ...... مجھے کچھ بھی نہیں کہنا ہے...... سمندر کے اس پار کی یادوں کو جگانے سے یا پھر کراچی کی سلگتی ریت پر گردشیں کھاتی ہوئی زندگی کا شکوہ کرنے سے بہتر ہے کہ مسکرائے جاؤ، کوئی شکوہ نہ شکایت۔

ایک بوسیدہ سی خاموشی گھر پر مسلط تھی۔ اب جب میں اس آنگن کے منظر کو اپنے تصور میں لاتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ اس گھر کی روح جیسے کسی گہرے پردوں میں لپٹی تھی اور جیسے کسی تاریک وقت کے بہاؤ میں بہی چلی جا رہی تھی۔ ہم لوگوں کے پہنچتے ہی گھر میں جیسے ایک زمانے کے بعد کوئی حرکت ہوئی ہو۔

لکڑی جلا کر پہلے انھوں نے چولھے کے کوئلے کو سرخ کیا۔ پورا گھر دھواں دھواں ہو گیا۔ ہم لوگ آنگن میں بچھی ہوئی پلنگ پر بیٹھے بیٹھے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے چکوٹھی روٹی پکائی اور کئی انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ ورانڈے میں شاید ایک چوکی بھی تھی، جس پر دسترخوان لگایا اور کھانا نکالا۔ چکوٹھی روٹی اور آملیٹ تو نہ جانے میں نے کتنی بار کھائی ہوگی، مگر باندی بو بو کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چکوٹھی روٹی اور آملیٹ کا مزہ بس مجھے آج تک یاد ہے۔ بڑی محنت سے انھوں نے اس کھانے کو تیار کیا تھا۔ امی کو باجی کو اور مجھے دیکھ دیکھ نہال و نہال ہو رہی تھیں۔ کچھ باتیں بھی کرتی جاتیں اور مسکرائے بھی جاتیں۔ علی امام بھیا بھی ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ چونکہ وہ عدالت گنج پٹنہ میں امی کے ساتھ بہت دنوں تک رہ چکے تھے، اس لیے امی سے ان کو خاص انسیت تھی۔ لیکن قدرتی طور پر وہ ایک خاموش طبیعت انسان تھے۔ اگر امی کو دیکھ کر آنکھیں نم بھی ہوئی ہوں گی تو اس خاموش جذبات کا کسی کو پتہ نہیں چل سکا ہوگا۔ ہاں ان کے لہجے کی تھکن کو میں اپنی اس کم عمری میں بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ درحقیقت وہ گھر مجھے ایک بیاباں لگ رہا تھا۔ بے رحم تنہائیوں کا ایک ریگزار تھا جہاں ضبط کی بے نم کھردری دیواروں کے بیچ دو زندگیاں تھیں۔ دو انسان سانس لے رہے تھے۔ دونوں بھائی بہن کے ہونٹوں پہ لفظ اترے مگر اترنے سے پہلے ہی جیسے پگھل گئے، اپنی شناخت کھو بیٹھے۔ بس ایک ٹھہری سی خاموشی میں دونوں زندگی کے آخری دنوں تک سانس لیتے رہے۔

ہم لوگ تو بس صرف ایک مہمان کی شکل میں اس گھر میں گئے تھے۔ مہمان گیا اور چلا آیا۔ پھر ان لوگوں پر اور کیا کیا

گزری، کس طرح کی صبحیں اور کس طرح کی شامیں گزریں، کسی کو خبر نہیں۔

ہم لوگوں کے ہندوستان واپس آنے کے بعد پتہ چلا کہ ایک کے بعد ایک دونوں بھائی بہن دکھ درد کو سمیٹے اندھیرے اور اجالے میں چھنتے اور نکلتے ہوئے آخر کراچی کی شور شرابے والی غیر مانوس دنیا سے نکل کر بہت دور چلے گئے، جہاں دونوں کو آخر کار سکون حاصل ہوا۔ ایسی جگہ چلے گئے جہاں جانے کا انتظار شاید انھیں مدت سے تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ لمحے مر جاتے ہیں...... ارے کون لمحہ اور کون سے لمحے کی یاد؟ مگر سچ پوچھیے تو ہر لمحہ اپنی اپنی زندگی اوپر سے لے کر آتا ہے اور اس کی روشنی یا سیاہی اپنا نشان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔

چھوٹے ابا سید عبدالمجید کو جب اپنے تصور میں لاتی ہوں تو سلطان گنج پٹنہ کا پورا ایک منظر نامہ مکمل ہوتا ہے۔ ان کے بغیر ان در و دیوار کو اور اس جگہ کو تصور میں لانا بھی جیسے محال ہے۔ ان کا بھولنا ہم لوگوں کے لیے یا اور کسی کے لیے بھی، جو ان کو جانتا تھا، اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ میرے صرف چھوٹے چچا ہی نہیں تھے، بلکہ وہ میرے ایک دوست تھے۔ درحقیقت جب میں چھوٹی تھی تو ان کا رعب مجھ پر بے پناہ تھا۔ لیکن بڑے ہونے کے بعد ان کی باتوں کو سن کر ان کی باتوں کا جواب دے کر مجھے بے حد لطف آتا تھا۔ خاص کر جن دنوں میں نئی نئی لندن پہنچی تو چھوٹے ابا وہیں تھے۔ وہاں کی خاموش زندگی میں دن دن بھر ان کا ساتھ رہتا تھا اور ہم دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گپیں ہانکتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے اس قیام کے دوران میں، میں اکثر سوچتی تھی کہ یا اللہ مجھے اب ایسا لگ رہا ہے کہ میں تو اپنے چھوٹے ابا کو بالکل ہی نہیں جانتی تھی۔ میں نے ان ہی دنوں ان سے کہا تھا، ”چھوٹے ابا، آپ سے پہلے مجھے بے تکلف ہو کر بات کرنے میں ڈر لگتا تھا“ تو بولے، ”تمھاری تربیت کے لیے وہ ضروری تھا۔“

ابا اور چھوٹے ابا میں بے حد پیار تھا۔ مجھے یاد ہے اگر ہم لوگوں کے یہاں کوئی اچھی چیز پکتی تھی، تو ابا کبھی بھی دسترخوان پر نہیں بیٹھتے تھے جب تک کہ اسے چھوٹے ابا کو پہلے نہ بھیجا جائے۔ امی سے ابا کو ہمیشہ یہ کہتے ہوئے سنا، ”جو (مجید) کو پہلے بھیجا ہے؟“ ابا پیار سے چھوٹے ابا کو جو کہا کرتے تھے۔ صبح صبح امی اور ابا جب باغ کے کاموں سے فارغ ہو کر آتے تو ٹھیک اسی وقت چھوٹے ابا اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی پشت پر کیے ہوئے، ہم لوگوں کے یہاں آتے تھے۔ ہر مسئلے پر گفتگو کرتے۔ گھر الگ الگ تھا، مگر کمپاؤنڈ ایک تھا۔ جسم الگ الگ تھا مگر دل ایک تھا، سوچ ایک تھی، ایک کا مسئلہ دوسرے کا

مسئلہ تھا۔ انداز کلام جدا جدا تھے، مگر مفہوم اور گفتگو ایک جیسے تھے۔ ابا کی گفتگو کا جو مفہوم تھا وہی چھوٹے ابا کا ہوتا تھا۔ میرے ابا کچھ خاموش طبیعت کے تھے، مگر چھوٹے ابا ہر محفل میں شریک ہوتے تھے۔ ہر موضوع پر گفتگو میں حصہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ جب شادی بیاہ کے بہاری گیت گاتے، تو کرسی کھینچ کر ہم لوگوں کے قریب بیٹھ جاتے اور اس قدر محظوظ ہوتے کہ بیان سے باہر...... "ارے بھائی! ایک وہ گیت بھی تو تھا...... وہ والا گاؤ نا!" شاعر جو ٹھہرے۔ شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ دو کتابوں کے خالق تھے۔ "یادِ وطن" اور ایک مثنوی تھی "حیات و کائنات۔" "مثنوی جلوۂ صد رنگ اور" بزم و رزم فطرت" مجموعۂ کلام۔

چھوٹے ابا کے ادبی ذوق کی وجہ سے ہم لوگوں کے گھر پر بڑے بڑے مشاعرے ہوتے۔ جناب اختر اور ینوی زیادہ تر نظامت کرتے اور ایسی نظامت کرتے کہ ان کے ادا کیے ہوئے جملوں کو ہم لوگ ہفتوں مہینوں تک دہراتے اور پھر اپنی غزلیں اور نظمیں بھی اس پُرکشش انداز میں سناتے کہ سننے والا سنتا ہی رہ جائے۔

چھوٹے ابا کی مثنوی کے پیش گفتار کے چند اشعار:

آج پھر آئی ہے وطن کی یاد
پھر تڑپنے لگا دلِ ناشاد
زخم پھر دل کے مسکرانے لگے
اشک رنگیں فروغ پانے لگے
اشکِ خونیں کا پھر بندھا ہے تار
دامن اپنا بنا ہے پھر گلزار
پھر جنوں اپنا حشر ساماں ہے
تار تار اپنا پھر گریباں ہے
پھر نقوشِ کہن ابھرنے لگے
دلِ پُر غم سے چھیڑ کرنے لگے

پھر بندھا سلسلہ خیالوں کا
بھولی بسری ہزار یادوں کا
پھر رہا ہوں جنوں میں آوارہ
دل شکستہ، زبون و ناکارہ
دل کو ملتا نہیں کہیں بھی سکوں
جب سے شاخِ شجر سے چھوٹا ہوں
میرے دل کو کہیں سکوں نہ ملا
چاہے انگلینڈ ہو کہ امریکہ
کہیں اپنے وطن کی بات نہ تھی
ایسا دن اور ایسی رات نہ تھی
وہ مسرت ملی نہ وہ راحت
وہ محبت ملی نہ وہ چاہت
شاہو بیگہ جو تھا ہمارا وطن
چھوٹا، بلبل سے چھوٹے جیسے چمن
اس کو تو چھوٹے تیس سال ہوئے
یادیں اس کی نہیں گئیں دل سے
دل میں تازہ ہیں خوبیاں اس کی
اور سب داستانیاں اس کی

دوسری نظم ''مسلمانوں کا ٹولا'' سے چند اشعار:

ہائے علامہ فضل حق آزاد
میرے رشتے کے ماموں اور استاد

نکتہ داں، نکتہ سنج دانشور
اور علم و ہنر کے تھے پیکر
عربی اور فارسی کے تھے ماہر
اور اردو زبان پر قادر
صف اوّل کے وہ غزل گو تھے
ان کے شعروں میں ہیں بیاں کے مزے
شاعری کی زباں بہت شستہ
تھی سلیس، عام فہم اور پختہ
وہ ذہانت وہ قاعدوں پہ عبور
وہ ذکاوت وہ سادگی وہ شعور
تھے ہر اک صنف شعر میں افضل
ہو قصیدہ، رباعی یا کہ غزل
نظم گوئی میں بعد از اقبالؔ
شاید ان سا کسی کو تھا نہ کمال
تھے وہ قاری و حافظ قرآں
مجلسوں میں تھے اچھے مرثیہ خواں
خوش کلام اور خوش گلو بھی تھے
اور پرستارِ رنگ و بو بھی تھے
پختہ لَے اور رس بھری آواز
ٹھمری گانے کا خاص تھا انداز

جوش میں جب کبھی وہ آتے تھے
کوئی ٹھمری کی لے سناتے تھے
پڑھتے تھے تحتِ لفظ میں اشعار
ہو ترنم کی لے بھی جس پہ نثار
گاؤں کی ساری صحبتوں میں شریک
اور محرّم کی مجلسوں میں شریک
ان کی آواز میں تھا سوز و گداز
سوز پڑھنے کا خاص تھا انداز
خلق کی جیتی جاگتی تصویر
گفتگو میں حلاوت اور تاثیر
مسکراہٹ میں تازگی بہار
پھول کی بارشیں دمِ گفتار
ایسے باغ و بہار انساں کی
گلفشاں، گلفروش صحبت تھی
صحبتیں ان کی یاد آتی ہیں جب
ہوتا ہے اپنے دل کا حال عجب

☆☆

[illegible]

مہر باجی کا خط پٹنہ سے روانہ کیا ہوا، امی کے نام

(دائیں سے اوپر): طیبہ عزیز، مہر بانو
(دائیں سے نیچے): قمر بانو، انجم عزیز، سلطانہ بانو

دائیں سے: مہر بانو (بچہ افشاں احمد)، سلطانہ بانو، انجم عزیز، رضوان جعفری، طیبہ عزیز، قمر بانو

(۹)

اسی شاہو بیگہ میں علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابا اور چھوٹے ابا دونوں ہی نے ان کے بارے میں مجھے بہت ساری باتیں بتائی تھیں۔ وہ ابا کے ماموں ہوتے تھے۔ میرا ددھیال شاہو بیگہ ایک بہت ہی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ابا نے بتایا تھا کہ کل ملا کر بیس برادری کے لوگ تھے اور سب ہی قریب قریب ایک دوسرے کے رشتہ دار تھے۔ وہ سب کے سب آپس میں اس قدر مل جل کر ایک بے حد ہی خوشگوار ماحول میں رہتے تھے کہ اس کی دھوم دور دور تک تھی۔

فضل حق آزاد دادا کے ایک بھائی اور چھ بہنیں تھیں۔ انھوں نے اپنے والد میر فدا حسین کی طرح رئیسانہ مزاج پایا تھا او بڑے ہی غریب پرور بھی تھے۔ ابا اور چھوٹے ابا کا ان کے آخری زمانے میں اٹھنا بیٹھنا ساتھ ساتھ تھا۔ چھوٹے ابا (سید عبدالمجید) فضل حق آزاد دادا کے شاگرد بھی تھے۔

فضل حق آزاد دادا کے والد نے اس زمانے کے مشہور قاری محمد جان صاحب کو لکھنؤ سے شاہو بیگہ معقول تنخواہ پر قرآن شریف حفظ کرانے اور قرأت سے پڑھوانے کے لیے بلایا۔ فضل حق آزاد دادا اور ان کے چھوٹے بھائی سید محب الحق دادا نے ان سے تعلیم پائی اور ساتھ میں گاؤں کے دوسرے بچے بھی پڑھنے کو آتے۔ اس کے بعد علم کا دوسری سمت رخ ہوا۔ اور قاضی رضا حسین کی شمع انجمن کے پروانہ بن کر مستقل طور پر شاہو بیگہ سے پٹنہ تشریف لے گئے۔ اور پھر اس کے بعد ان کی سخن وری کو اس قدر پھلنے پھولنے کا موقع ملا کہ ان کی شعری صلاحیت آسمان کو چھونے لگی۔

قادر الکلام شاعر فضل حق آزاد عظیم آبادی ایک عظیم فنکار تھے۔ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں۔

شاعری کی۔ اردو نظم نگاری میں انھوں نے وہ حسن پیدا کیا جسکا کمال و جمال آج تک دیکھا جا سکتا ہے۔ مرثیہ نگاری میں وہ ہمدوش انیس و دبیر ہیں اور بیانیہ نظموں میں ہم لہجۂ نظیر۔ قومی شاعری میں حالیؔ اور فکری شاعری میں اقبالؔ کے مقابل ہیں۔ فارسی میں جو انھوں نے شاعری کی ہے وہ بھی بے مثال ہے۔ بقول سید حسن:

’’ آزاد کے فارسی کلام کا سب سے اہم حصہ قصائد کا ہے۔ ان میں سے ایک نئے سال کی آمد پر لکھا گیا ہے اور اس کا سال تصنیف ۱۸۸۷ء اور تاریخ ۱۰ر جنوری ہے۔ آزاد اس موقع پر کلکتہ میں موجود تھے اور وہاں جو کچھ انھوں نے دیکھا اس سے متاثر ہو کر قصیدہ لکھا۔ ان کی نثری صلاحیت بھی با کمال تھی۔ ‘‘

(’’مطالعہ آزاد، مرتب ذکی الحق، ص: ۹۵۰)

ایک مسلسل کہانی بہ عنوان سوانح آزاد دو قسطوں میں موجود ہے۔ ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کا کچھ حصہ ان کی زندگی میں ہی نذر آتش ہو گیا اور موت کے بعد لوگوں کی لاپرواہی کی وجہ سے کیڑوں کی خوراک بن گئے۔

۲۰۰۴ء میں کلیم عاجز صاحب پٹنہ سے جب امریکہ تشریف لائے تھے تو مجھے ایک واقعہ فضل حق آزاد دادا کے بارے میں سنایا تھا کہ درگاہ شاہ ارزاں کے ایک مشاعرے میں لکھنؤ کے کسی استاد نے عظیم آباد کے شعرا کی تعریف کی، مگر اس تعریف کو سن کر شمشاد لکھنوی مرحوم نے بڑے ہی طنز سے یہ شعر پڑھا کہ:

اظہار ہوئے مثلِ غزالوں کے سامنے
دعوۂ غزل کا لکھنؤ والوں کے سامنے
تو فضل حق دادا نے یہ شعر پڑھا ——

یہ بستی اب بھی بازارِ ختن ہے باکمالوں سے
غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے

فضلِ حق دادا کی نظم ’’قیدِ ناگزیر‘‘ نظم نگاری کے فن کو بلندیوں پر لے جاتی ہے۔

قیدِ ناگزیر

شب کے اخیر حصۂ غفلت میں یک بیک
جب ساری کائنات ہے آغوشِ خواب میں
کھلتی کبھی ہے اور جھپکتی کبھی پلک
اک التہاب ہے دلِ پُر اضطراب میں
جس طرح آب دان بر آتش میں ہو آب
خمیاز ہائے نشر عناصر لیے ہوئے
آنکھوں میں مستحیل کچھ آنسو ہیں یا گلاب
خونِ جگر سے دعوتِ مژگاں لیے ہوئے

کیوں دل میں یہ کھٹک ہے کسی گلعذار کی
دل آب آب جس کے ہوا ہے فراق سے
یاد آ گئی ہے یاد، کسی جاں نثار کی
یا آ گئے ہیں آنکھوں میں اشک اتفاق سے

کچھ بھی نہیں وہ ہائے کہاں ہم کہاں وہ دل
کیسی کسی کی یاد یہ سب اک خیال ہے
ماضی کی حسرتیں غم آئندہ جاں گسل
اس قیدِ ناگزیر سے چھٹنا محال ہے

☆☆

اب میں فضل حق دادا کی نثر نگاری کی ایک مثال نمونے کے طور پر پیش کرنا چاہتی ہوں:

''شاعری اور فن شاعری، دو چیزیں ہیں، علیحدہ علیحدہ اور دونوں میں وہی نسبت ہے جو عمارت کو فنِ تعمیر سے ہے...... جس طرح فنِ تعمیر کے دو بڑے اصول استحکام و عافیت دائر و سائر ہیں، اسی طرح نئی شاعری میں بھی حالات و مذاق دو قوی اصول ہیں جن کو اس فن میں بہت بڑا دخل ہے۔ اگر چہ اصول ما سبق فنون مسبوق الذکر میں اصول متفق علیہ نہیں۔ لیکن ان کے برتاؤ میں بحسب تقاضائے مقام وحالات و مذاق آسمان و زمین کا فرق نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اگر ایسی چھتیں ہوں جیسی عرب میں ہیں تو شاید ایک برسات بھی پوری نہ دیکھ سکیں اور اگر ہندوستان کا معشوق جس کے پاس ناک کی کیل، کان کی بجلیوں، کڑوں چھڑوں کے سوا نہ خنجر نہ تیغ دو پیکر نہ ترکش نہ کمان کچھ بھی نہیں۔ شیراز و اصفہان میں پایا جائے تو اس کے سوا کہ ''مادہ را بچندیں ہنر آراستن و بہ زمرۂ مرداں فرستادن یعنی چہ'' اور کیا کہا جائے گا۔ علیٰ ہذا معشوق فارسی ہندوستان کے لیے نادر شاہی حملہ ہوگا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ کسی ملک کی شاعری، دوسرے ملک کی شاعری کا پورا چربہ اتار لے اور پھر مزا دے سکے اس لیے اردو بھی انگریزی شاعری کا چربہ نہیں ہو سکتی اور ہوئی بھی تو مزہ گیا...... ہمارے خیال میں حسنِ شاعری مرقع کشی اور اظہار جذبات کے علاوہ اسلوب بیان سے بہت زیادہ تعلق رکھتا ہے اور وہ اسلوب کی ایک خاص قسم شاعرانہ اسلوب ہے اس کی۔ حقیقت سخن سنج دماغوں کے سوا اور کہیں نہیں ہوتی:

گفت پامال نازِ من کہ شود
سبزہ از تربتم دمید کہ من

کون سا دل ہے جو سنتے ہی تڑپ نہ جائے، یہ جادو کس نے بھرا ہے؟ اسی اسلوب بیان نے...... فن کا اعجاز کہ اس نے حیات و موت سب کو برابر کر دیا اور محال کو ممکن کر دیا...... شاعری کوئی منطق

---

[1] شاعری و فن شاعری، تاج، بانکی پور، ۱۰ رنومبر ۱۹۰۲ء، صفحہ: ۲

نہیں کہ قال وقول سے قائل کرے، وہ تو ایسی تلوار ہے جو انھیں کو زخمی کرتی ہے جو گھائل ہوتے ہیں:

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر"

میر کے بارے میں کہتے ہیں:

"حقیقتاً جو دل و دماغ، رنگ و بو، طینت و طبیعت میر صاحب ساتھ لائے تھے اس میں اور کسی کی شرکت نہ تھی ورنہ قابلیت کے لوگ تو کل بھی میر سے بڑھ کر تھے اور آج بھی نکلیں گے، لیکن صرف قابلیت سے کوئی شاعر میر تقی میر یا میر درد نہیں ہو سکتا۔ فن شاعری و لوازمات شاعری کے علاوہ شاعر کو خود اپنی خو بو، طبیعت و طینت، دل و دماغ پر نظر چاہیے۔ میر صاحب کا ہر شعر اپنے معنی کے علاوہ ایک عالم رکھتا ہے جس کو ان کی ذات، مقام و مراتب اور ان کے زمانے کے حالات سے ایسا تعلق ہے جو شبیہ کو اپنی صورت سے ہوتا ہے۔"

☆☆☆

(۱۰)

چھوٹے ابا کے ادبی ذوق کی وجہ سے ہم لوگوں کے گھر پر بڑے بڑے مشاعرے ہوتے۔ جناب اختر اور ینوی زیادہ تر نظامت کرتے اور ایسی نظامت کرتے کہ ان کے ادا کیے ہوئے جملوں کو ہم لوگ ہفتوں مہینوں تک دہراتے اور پھر اپنی غزلیں اور نظمیں بھی اس پُرکشش انداز میں سناتے کہ سننے والا سنتا ہی رہ جائے۔

اختر احمد اور ینوی میرے خالو لگتے تھے جو کہ ایم۔اے، ڈی لٹ۔ صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی اور ہندوستان و پاکستان کے ایک مشہور مصنف، افسانہ نگار، شاعر، مقرر، مبلغ تھے۔ ان کی بیگم شکیلہ اختر میری امّی کی اپنی second cousin تھیں جن کی لکھی ہوئی کتاب ''شیطان کی ڈائری'' بہت ہی مقبول ہوئی تھی۔ اختر اور ینوی خالو ارول میں کافی دن تک رہے۔ ارول کی سون ندی ریت کے ٹیلے اور خوشگوار فضاؤں میں اس جگہ کی ہر شے کو شاعرانہ نظروں سے دیکھتے تھے اور اپنے فن میں اسے منتقل کرتے رہے۔ میں بہت چھوٹی تھی جب امّی مجھے پٹنہ میں ان کے گھر لے کر گئی تھیں۔ ان دنوں اختر خالو کی طبیعت خراب تھی۔ بس ایک دھندلا سا کچھ یاد ہے۔ لیکن ہم لوگوں کے گھر سلطان گنج میں وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور نظامت کی باگ ڈور بس وہی سنبھالتے تھے۔ ان کی گفتگو کا انداز بے حد مختلف اور نرالا تھا۔ ان کی زبان سے ادا کیے ہوئے جملوں کو سن کر میں تو بس بالکل بے بس ہو جاتی اور سوچتی ارے یہ کیا بول گئے۔ ایسا لگتا کہ کوئی چیز ریشم کی طرح پھسل گئی اور میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

جناب شرف الدین احمد (عظیم آبادی) جو کہ سخن دہلوی کے نواسے تھے، جنھوں نے اپنی کتاب ''جراثیمِ ادب'' میں لکھا ہے کہ اختر ایک ایسے گاؤں کے رہنے والے ہیں جہاں کی بھاشا دتی اور لکھنؤ کی اردو سے بالکل مختلف ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ

ان کی تحقیق نے اردو الفاظ میں کچھ اضافہ ضرور کیا ہے۔ ایک روز کسی لکھنوی ادیب سے یہ الجھ پڑے، پوچھا،''بانس کی آپ کے یہاں کتنی قسمیں ہیں اور ان کے لیے الگ الگ کون سا لفظ ہے؟ بے چارے نے جواب دیا،''ایک تو بانس، دوسرا لفظ لاٹھی ہے۔'' اختر نے کہا،''بس؟ اب میری زبان میں سنیے۔ بانس، کماچی، چھپٹی، بینا، ڈنڈا، لاٹھی، سونٹا اور ان سب کا جد امجد بونگ۔'' اور اس کے بعد سب کی وجہ تسمیہ بھی بالتفصیل بیان کی۔ اسی طرح ایک دوست کی بی بی کے شاندار قدو قامت پہ اظہار خیال کی ضرورت پڑی۔ کسی نے کہا،''قد و قامت ترا قیامت ہے۔'' کسی نے کہا،''معاذ اللہ۔'' آپ نے کہا''یہ بھی کافی نہیں، کہیے معاذ اللہ کی پناہ۔'' ادبی نقطہ نظر کو ابھی پرے رکھیے مگر کیا خوب! آگے لکھتے ہیں کہ ٹی بی تو ایک معمولی سی چیز تھی جو اس کے پاس محض غلطی سے آگئی تھی، اور جب اس غریب نے دیکھا کہ اختر میں اس سے بھی زیادہ خطرناک جراثیم پہلے سے موجود ہیں تو اس نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ ہمیشہ کے لیے چلی جائے۔

اب اس کا کیا جواب ہے کہ یہ حضرت نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہوئے ایک دیہات میں پہنچتے ہیں جہاں کی بے چاری معصوم لڑکیاں اپنے گھروں کی چاردیواریوں سے بھی کبھی باہر نہیں نکلتی تھیں۔ لیکن جونہی یہ کسی لڑکی سے باورچی خانے میں بھی ملتے ہیں تو وہ غریب بے ساختہ شعر کہنے لگتی ہے، وہ خود گھبراتی ہے کہ کیا ہو گیا۔

شکیلہ خالہ نے بھی ۱۹۵۶ء میں ''نقوش'' کے شخصیات نمبر میں خاص طور پر اشارہ کیا ہے، وہ لکھتی ہیں:''اختر صاحب اکتوبر کی چھٹیوں میں ارول آئے تو ایکدم سے راجہ اندر بن کر آئے۔ وہ دن بڑے یادگار طور پر گزرے ہیں۔ ہم سب کے سب اختر صاحب کے گرد ایک گھیرا لگائے بیٹھے رہتے۔ کسی کے ہاتھ میں'' بانگ درا'' ہوتی اور کسی کے ہاتھ میں'' دیوان غالب''۔ ہر طرف بس دیوان ہی دیوان نظر آتے تھے۔ مومن کی شاعری چھڑتی، غالب کا انداز بیان سمجھایا جاتا اور اقبال کے ترانوں میں ماضی پہ تبصرے ہوتے رہتے۔ اختر صاحب نے ایک خالص شاعرانہ ماحول پیدا کر کے ہمارے دلوں کو امنگوں سے بھر دیا تھا۔ شاعری اور احساس شعری سے ہم اتنے ہم آہنگ ہو گئے تھے کہ اچانک طور پر ہم ساری بہنوں نے ایک ہی ساتھ شعر کہنا شروع کر دیا۔ اختر صاحب حیران ہو گئے۔ یہ سون کے میٹھے پانی ہی کی کرامات تھیں جو ایک ساتھ دیسی لڑکیاں جذباتی شعر کہنے لگ گئیں جو تعلیمی لحاظ سے بے حد کمزور تھیں۔ پام ولا پورے طور پر شعر و ادب کا گہوارہ بن کر رہ گیا تھا۔ آدھی آدھی رات تک بہت باتیں ہوتی رہتیں۔ مصرع طرح دیا جاتا، شعر لکھے جاتے اور محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی۔

صدارت کی کرسی اختر صاحب کے لیے مخصوص تھی اور باری باری عائشہ شمیم، شکیلہ اختر، عزیزہ نگار، رضیہ رعنا، نسیم [illegible]

اور نسیم سوز اپنا کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کرتیں۔ اندر سبھا کی مجلس جمی رہتی اور راجہ اندر اپنی جگہ پر استھاپت رہتے۔"

ایک جگہ اور لکھا ہے: "گھنٹوں وہ شیلی، کیٹس، بائرن اور براؤننگ کی نظمیں سمجھاتے رہتے۔ کبھی دیر دیر تک غالب، میر اور اقبال سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے مجھ کو ان کی خصوصیات بتاتے۔ اس وقت ان کے الفاظ اور خیالات کی روانی کو دیکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ ہی محسوس ہوتا کہ علم کا یہ سمندر کسی بہت بڑے ساحل سے ٹکرانے کو بے چین ہے اور میں......" شکیلہ خالہ نے خود ہی لکھا تھا کہ "یہ سون کے میٹھے پانی ہی کا اثر تھا جو ایکساتھ ساری لڑکیاں شعر کہنے لگیں۔ سون سے ان کو خود بڑی محبت رہی ہے، بقول انھیں کے:

سبزۂ شاداب پر شہلا جمالوں کا ہجوم
سون کی وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم
شاعرِ سرشار کے رنگیں خیالوں کا ہجوم

اختر خالو کا ایک اور مشہور شعر ہے:

جن کے دل میں درد کم ہوتا ہے وہ روتے ہیں جلد
میرا دامن کیوں بھلا منت کشِ آنسو رہے

شکیلہ خالہ سے اور میری ساس سے بھی بڑی گہری دوستی تھی۔ جب میں شادی کر کے گیا گئی تو میری ساس سے انھوں نے کہا تھا، "سکینہ تم میری بیٹی کو اپنے گھر لے گئی ہو۔"

(۱۱)

میرے گھر میں یا کسی مکان میں آج سے پچاس سال پہلے تک کے مشاعرے، شاعروں اور سامعین اور تماش بین تینوں کے لیے سبق آموز تربیت گاہ، حوصلہ افزا اور خیال افروز ہوتے تھے۔ اول تو اس وقت تک کی شاعری، شاعر کی زندگی سے دور نہیں، نزدیک ہوتی تھی۔ پھر زبان غیر آلودہ، پاک صاف، نرم، شیریں، سادہ اور معصوم ہوتی تھی۔ خیالات میں بلندی، ستھراپن، سچائی، اسلوب اور اظہار میں غیر پیچیدگی اور صفائی، روانی اور شادابی جس کے نتیجے میں سننے والوں کا ذہن فوراً متوجہ ہو جاتا۔ قبولیت کی آمادگی اور استقبال کی تیاری ہوتی۔ شاعر جو کہتا سامعین کے دل میں بلا تاخیر اُتر جاتا۔ یہ سچائی کی خوبی ہے۔ شاعر دنیا پرستی سے شعر کہتے وقت الگ ہو جاتا، تو پھر تاثر میں کیا تاخیر؟

میرے گھر میں جب مشاعرے ہوتے تو چونکہ گھر والے خود بھی شعر و ادب کے استاد اور رسیا ہوتے، اس لیے شعرا کا انتخاب بھی اسی معیار اور سطح کا ہوتا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس وقت یہ بات نہ تھی کہ جس نے کالج کی کتابیں لکھ پڑھ لیں یا کچھ کتابوں کا مطالعہ کر لیا اور طبیعت میں کچھ موزونیت ہوئی تو غزل خواں اور غزل گو بن گیا۔ بزرگوں کی تربیت تھی اس لیے شعر وہی کہتا تھا جس نے اساتذہ کی صحبت اٹھائی ہو۔ اس لیے منتخب شعرا مجلس کی خوبیوں میں اضافہ کر دیتے اور ماحول شعریت سے معمور ہو جاتا اور جلد ہی تاثیر اور قبولیت، استقبال اور بے ساختہ داد و تحسین کا ماحول بن جاتا۔ اس وقت شہر کے استادوں میں عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ولی الرحمٰن ولی کاکوی، علامہ جمیل مظہری، بسمل عظیم آبادی شاگرد شاد عظیم آبادی، کاظم حسنین زار، ثاقب عظیم آبادی مشاعروں کے باوقعت شعرا میں تھے۔ کلیم عاجز نوجوانوں کے سرخیل تھے۔ کلام میں دل کی اور تاریخ کی آواز پوشیدہ تھی اس لیے ان کی غزلیں سب کے دل کی آواز بن گئی تھیں۔ مشاعروں میں شرافت اور سنجیدگی کا

ماحول تھا۔ جو شعروادب کی تاثیر کو اور حسن کو بڑھا دیتا۔ ہم لوگ مشاعروں کی محفل میں شریک تو نہیں ہو سکتے تھے، مگر نشست ایسی جگہ ہوتی، اندرون خانہ سے متصل ہوتی اور ہم لوگ قلم کاغذ لے کر یکسوئی سے متوجہ ہو کر سنتے۔ اور کوشش کرتے کہ شاعر کے کلام کو تحریر میں منتقل کریں۔ سو فیصدی کامیابی نہیں ہوتی مگر ناکام بھی نہیں ہوتے۔ کچھ الفاظ چھوٹتے تو پھر گھر میں تذکروں کے ذریعہ ان کی تصحیح ہو جاتی۔ ان مختصر پاک وصاف نشستوں میں جو لطف آتا، جس رغبت اور توجہ سے کلام سنا جاتا اور جس سہولت اور آسانی سے شاعر کا کلام دلوں میں داخل ہو جاتا وہ آج کے بڑے بڑے مشاعروں میں بڑے بڑے اہتمام، تمہید اور نظامت کے باوجود حاصل نہ ہوتا اور جو بشاشت، آسودگی اور سیری حاصل ہونی چاہیے وہ نہ ہوتی۔ اس کی وجہ فنکاروں کا خلوص اور سامعین کی طلب تھی جس پر اب صناعی کا دبیز پردہ پڑ گیا ہے۔

سید شاہ عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی جو ہم لوگوں کی گلی کے سامنے والی گلی میں رہتے تھے، عظیم آباد کے مشہور شاعر، ان کے بڑے لڑکے بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ یعنی سید شاہ ولی الرحمٰن ولیؔ کاکوی۔ سید شاہ عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی کا ایک شعر اب تک یاد ہے:

شبِ فرقت کو اپنے اے عطاؔ کیا منھ دکھاؤں گا
سحر تک بھی جو اپنی آہ محرومِ اثر ہوگی

جناب کلیم عاجزؔ صاحب اس وقت عظیم آباد کے سب سے بڑے شاعر، ہم لوگوں کے گھر سے چار میل دور پر بی این کالج کے سامنے رہتے تھے۔ ان کا ترنم بے پناہ تھا۔ اس پر ان کی ایک غزل کا یہ شعر:

آنسوؤں کی مے بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سینکڑوں میخانے اُجڑے ایک میخانہ بنا

مجھے یہ شعر آج تک یاد اس لیے ہے کہ اس شعر کو میں نے چاندنی روشنی میں جلدی جلدی کاغذ پر لکھا تھا جب وہ سنا رہے تھے۔ کلیم الدین احمد صاحب جو تنقیدی دنیا میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں انھوں نے کلیم عاجزؔ صاحب کے بارے میں لکھا تھا:

"ان کے شعروں میں 'پھول' بھی ہیں اور 'پتھر' بھی۔ اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول

بن جاتے ہیں۔اس کام کے لیے بھی سلیقے کی ضرورت ہے۔''

کلیم عاجز صاحب کا ہی یہ شعر ہے کہ:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

جناب جمیل مظہری صاحب جب اپنا کلام سنانے لگتے تھے تب بھی سارے لوگ بے حد اشتیاق سے اشعار سنتے۔ہم لوگوں کے گھر پر جتنے بھی مشاعرے ہوتے جمیل مظہری صاحب ضرور آتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ''نقشِ جمیل'' اور ''فکرِ جمیل'' فع مجموعہ کلام شائع ہوا تھا اور ایک مثنوی ''آب وسراب'' کے علاوہ ایک ناول ''شکست و فتح'' جو کہ ان کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، منظرِ عام پر آئے تھے۔

رستے کا نشاں جس کو سمجھتے ہیں جمیل آپ
ممکن ہے کہ گمراہوں کا نقشِ کفِ پا ہو

بقدرِ پیمانۂ تخیّل، سرور ہر دل میں خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
ہے روح تاریکیوں میں حیراں، بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا
بس ایک احساسِ نارسائی نہ جوش اس میں نہ ہوش اس میں
جنوں پہ حالت ربودگی کی، خرد پہ عالم غنودگی کا
خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں یہی نہ معنی ہیں اس کے واعظ
وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو، مکان جلتا ہو جب کسی کا
وہ لاکھ جھکوا لے سر کو میرے مگر یہ دل اب نہیں جھکے گا
کہ کبریائی سے بھی زیادہ مزاج نازک ہے بندگی کا

(۱۲)

عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ اور ایک بہت مشہور شاعر و ادیب جن کا نام پرویز شاہدی تھا، وہ ایک بے پناہ ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مجھے اس بات کا بے حد قلق ہے کہ میں نے جناب پرویز شاہدی کو نہ کبھی دیکھا اور نہ سنا، ان کا ایک شعر ہے:

قسمت میں لکھی تھی محرومی، ناکام تمنا ہونا تھا
کیا کیجئے مجھ کو فطرت کے ہاتھوں کا کھلونا ہونا تھا
کیا میری خطا تھی گر میں نے دو چار گلوں کو چوم لیا
گر ایسی ہی پابندی تھی یہاں ہر پھول کو کانٹا ہونا تھا

شروع میں نہ تو انھوں نے خود اور نہ تو کسی اور نے ہی ان کے کلام کو یکجا کرنے کی کوشش کی مگر پھر ایک مدت کے بعد ان کے کلام کا مجموعہ دلّی سے شائع ہوا۔ وہاں کے کچھ نوجوان ادیبوں کی کاوشوں اور اختر اور ینوی خالو کی سرپرستی میں بڑے ہی آب و تاب سے چھپا تھا۔ یعنی ''تثلیث حیات'' اس کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں کراچی سے جناب احمد زین الدین صاحب نے چھپوایا تھا جو کہ میرے پاس موجود ہے۔

پرویز شاہدی کی بہن جن کا نام کبریٰ اظہار پنہاںؔ تھا وہ ایک اعلیٰ درجے کی شاعرہ تھیں۔ ۱۹۵۲ء میں آل انڈیا خواتین کا مشاعرہ جو کہ انجمن اسلامیہ ہال میں ہوا تھا اس میں انھوں نے شرکت کی تھی۔ امریکہ میں بھی نیویارک کے ایک مشاعرے میں

شریک ہوئیں۔ ان کا پورا مسودہ ان کی لڑکی سارہ مسرت حسن شاداںؔ کے پاس موجود ہے جو نیوجرسی میں مقیم ہیں اور وہ اسے جلد ہی شائع کرنے والی ہیں۔ خدا کرے وہ مجموعہ جلد از جلد چھپ جائے۔ مسرت سے فون پر اکثر ادبی گفتگو ہوتی ہے۔ وہ خود بھی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔

کبریٰ اظہار پنہاںؔ کا ایک شعر:

میرے دل کی الجھنوں کا آ کے طوفاں دیکھئے
اک پریشاں حال کا حالِ پریشاں دیکھئے

پرویز شاہدی کی منجھلی بہن سلمیٰ رحمٰن رازؔ کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

آئے ہیں بعد مرگ وہ آنسو بہانے لاش پہ
کیسے انھیں میں روک لوں دیدۂ تر کو کیا کروں
رازؔ یہ دردِ دل مجھے پھونک ہی دے گا ایک دن
جوشِ تپش کو کیا کروں سوزِ جگر کو کیا کروں

سب سے چھوٹی بہن عالیہ یوسف زریںؔ جو کہ ابھی حیات ہیں، ان کے دو اشعار:

فراقِ دوست میں کوئی خوشی پائی نہیں جاتی
طبیعت اتنی غمگیں ہے کہ بہلائی نہیں جاتی
شمس و قمر سے روشنی دہر میں ہے ہوا کرے
اپنی نظر تمھیں پہ ہے اپنی نظر کو کیا کروں

کبریٰ اظہار پنہاںؔ کی لڑکی مسرت حسن شاداںؔ کے بھی دو اشعار میں یہاں رقم کرتی ہوں:

غیر سے وابستگی رکھتے ہیں اپنے ہی یہاں
پل میں خود اپنے ہی چہرے کو پرایا کر دیا
تم نے تو خود تیرگی کو رہ نمائی سونپ دی
پھر سفر کی وحشتوں کا خوب چرچا کر دیا

جناب غبار بھٹی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نیرنگیٔ جلوہ تو کوئی چیز نہیں ہے
عنوانِ تماشا تو کوئی چیز نہیں ہے
اللہ رے اس نقشِ کفِ پا کی بہاریں
فردوس کا جلوہ تو کوئی چیز نہیں ہے
چوکھٹ رہے اے کاش غبار ان کی سلامت
سر کا مرے سودا تو کوئی چیز نہیں ہے

جناب شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی کی غزل کے چند اشعار:

رہ عشق میں مناسب ہے ذرا جنوں پسندی
کہ زیاں ہے عاشقوں کو یہ مقام ہوش مندی
ترے پیرہن کی بو ہے مرے پیرہن میں پنہاں
مرے عشق با وفا کی کوئی دیکھے ارجمندی

☆☆☆

(۱۳)

سید شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی، حکیم مشتاق احمد خاں، غبار بھٹی، خان بہادر نواب علی سجاد، محمد یعقوب یونس، سید محمد حسین صہبا عظیم آبادی، محمد فاروق احمد پیامی عظیم آبادی اور سید حسن صاحب مشاعروں میں شرکت کرتے۔ پروفیسر حسن عسکری جو ہم لوگوں کے گھر سے بیس گز پر رہتے تھے، وہ بھی مشاعروں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔

ہم لوگوں کو تو اجازت تھی نہیں کہ باضابطہ محفل میں شریک ہوں، اس لیے پیچھے کے دروازے سے کان لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ہاتھ میں کاغذ قلم رکھتے تھے۔ نہ تو ٹیپ ریکارڈر اور نہ وڈیو ریکارڈر ہی ہوتا۔ جو کچھ سنا، وہ چاندنی کی روشنی میں لکھ لیا۔ پیچھے کی لائٹ اس لیے نہیں جلاتے تھے کہ باہر کے لوگوں کو ہم لوگ نظر نہ آجائیں۔ ان مشاعروں کا اثر ہم لوگوں پر یہ ہوتا تھا کہ ہم سب بہنیں مل کر ایک گھر میں مشاعرہ کرتیں۔ کوئی عطا کاکوی بنا، کوئی کلیم عاجز اور پھر کوئی غبار بھٹی۔ گھر کے اندر برآمدے میں پردہ لگا دیا جاتا۔ محلے کی خواتین سامعین ہوتیں اور پھر ایک دوسرا شاندار مشاعرہ شروع ہوتا۔

چھوٹے ابا کی تین لڑکیاں شہر بانو، مہر بانو اور قمر بانو تھیں۔ لڑکے بھی تین تھے۔ سید حسن، سید حُسین اور سید حسنین۔

حسن بھیا جو کہ سرجن تھے، لندن کے ہسپتال میں consultant کی حیثیت سے ایک زمانے تک کام کرتے رہے۔ وہ نام میرے ذہن کا ایک خوش گوار جھونکا تھا۔ سچ مچ میں ان کے روشن چہرے کو تصور میں لا کر شاداب ہو جاتی ہوں۔ نرم دل اور نرم لہجے کے مالک حسن بھیا کا ساتھ لندن میں بہت دنوں تک رہا۔ ان سے مجھے بے حد تقویت ملتی تھی۔ مشکل دنوں میں ڈھارس بندھی رہتی ہے۔ جب بھی میں ان کے گھر جاتی، ان کے استقبال کرنے کا انداز مجھے بہت بھاتا، اس لیے کہ وہ انداز بہت ہی مخلص ہوتا۔ بالکل بچھے جاتے۔ مسکراتے جاتے۔ بے حد خوش ہوتے۔ کہتے، ''اچھا انجم آئی ہیں!

بھائی آؤ بیٹھو،'' تب چائے بنائی جاتی۔ بڑے مگّے میں اپنے لیے اور میرے لیے چائے لاتے۔ شروع شروع میں جب میں لندن پہنچی تو مجھے پہلی بات انھوں نے یہی بتائی کہ چائے میں دودھ گرم کر کے ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چائے میں ٹھنڈا دودھ ملانے کی عادت انھوں نے ہی ڈلوائی اور وہی میری عادت آج تک ہے۔ میں فریج کھول کر جب بھی ٹھنڈا دودھ اپنی چائے میں ڈالتی ہوں تو مجھے حسن بھیا یاد آجاتے ہیں۔ ان سے گپ کر کے اور ان کے پاس بیٹھ کر مجھے بے حد سکون ملتا تھا۔ دل کے مریض تھے اس لیے کافی سنبھل کر رہتے تھے۔ سنبھل کر رہتے کیا تھے، وہی ان کا انداز تھا جھک کر رہنے کا۔ خود کو کبھی بڑا نہیں سمجھا۔ ہر ایک سے دل کھول کر ملتے تھے۔ اسمارٹ، لمبے اور حسین اگر لکھ دوں تو غلط نہ ہوگا۔ چہرے کی وجاہت تو ایک الگ سی بات ہے، مگر دل کا حسن جو چہرے پر جھلک آتا ہے اس سے چہرے کی خوبصورتی دوگنا ہو جاتی ہے۔ بچپن میں انھوں نے کبھی بھی ہم لوگوں پر رعب جھاڑنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ بس ہم لوگوں پر نظر پڑتے ہی پھول کی طرح کھل جاتے تھے۔ روس گھومنے گئے، وہاں کی کسی خوبصورت بلڈنگ کے سامنے اپنی بیگم کی تصویر کھینچنے کے لیے زمین پر بیٹھے۔ تصویر کھینچتے کھینچتے اُدھر کیمرہ Click کر کے خاموش ہوگیا اور ادھر میرا بھیا بھی کیمرے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ اسی کے کچھ دن کے بعد میں عمرہ کرنے سعودی عرب جا رہی تھی۔ ہوائی جہاز بس جدہ ایئرپورٹ پر لینڈ کر ہی رہا تھا کہ میری آنکھ جھپک گئی۔ حسن بھیا میرے سامنے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے، ''انجم، ہم کو چھوڑ کر اکیلے اکیلے جا رہی ہو۔'' میری نیند ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد میں کئی دنوں تک بے چین ہی۔ کسی نے بتایا کہ ان کے نام سے عمرہ کرلو۔ ایک بار عمرہ کرنے کے بعد ہم لوگ پھر عمرہ کرنے مکہ شریف گئے۔ میرے دل کو تھوڑا سا سکون ملا۔

حسن بھیا کچھ دنوں تک اپنے ننیہال آرا ضلع بہار میں بھی رہے تھے اس لیے کسی کسی لفظ کو وہ ایک خاص طرح سے وہاں کی مقامی بولی کے انداز میں بولتے تھے۔ اس لیے میں جب یہ کہتی، ''حسن بھیا اردو میں ذرا گنتی گنیے'' تو خاص انداز سے مسکراتے اور گنتی گننا شروع کر دیتے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ اور چھ۔ چھ کو ہمیشہ ''چھو'' کہتے اور پھر مجھے بے تحاشہ ہنسی آتی اور وہ میرے ساتھ ساتھ خوب ہنستے۔

حُسین بھیا چھوٹے ابا کے منجھلے بیٹے، آج کل سلطان گنج میں ہی مقیم ہیں۔ پھولوں کی کیاریوں میں گلاب اور موتیا اب بھی ان کے گھر کے سامنے جھومتے ہیں اور اس ہری ہری گھاس اور پھولوں کے درمیان حسین بھیا کرسی پر بیٹھ کر قدرت کے شاہکار کو سراہتے رہتے ہیں۔ باغبانی کا جنون تو ہم لوگوں کے خون میں ہے۔ اس لیے پچھلے سال جب میں سلطان گنج

گئی اور حسین بھیا کی محنت کو دیکھا، تو دل سچ مچ باغ باغ ہو گیا۔ صرف باہر سے ہی باغ، پھول اور کیاریاں ہی خوبصورت اور شاداب نہیں ہیں، بلکہ اس گھر کے مکین بھی دل کے ویسے ہی خوبصورت ہیں۔ ان کا گھر ہم لوگوں کے لیے ہمیشہ کھلا رہا۔ اخلاق اور محبت کی بوچھار ہم لوگوں کو اس گھر سے اتنی ملی کہ ہمیشہ وہاں جانے کو دل چاہتا ہے۔ جب بھی ہندوستان گئے، دونوں میاں بیوی ایئر پورٹ آجاتے اور ایسا استقبال کرتے کہ اس گھر سے کہیں اور جانے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ میری کتاب ''سرگوشی بہار کی'' یعنی میرے شعری مجموعے کی اشاعت میں انھوں نے میری بے پناہ مدد کی۔ ان کے پرسکون چہرے اور پرسکون شخصیت کو دیکھ کر مجھے بے حد اچھا لگتا ہے۔

حسنین بھیا یعنی میرے چچا کے سب سے چھوٹے لڑکے کا نام زبان پر آتے ہی یہ شعر یاد آتا ہے:

سرور آنکھوں سے، مستی بیاں سے آئے گی
وہ نام لوں گی تو خوشبو زباں سے آئے گی

کچھ عجب نرالی، انوکھی شخصیت کے مالک، حسنین بھیا، اصول کے پابند، وقت کے پابند، وعدوں کے نبھانے والے، انگریز صاحب، بات بالکل To the point کرنے والے۔ حسنین بھیا کو جب یاد کرتی ہوں تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ ایسا شاداب انسان، زندگی سے بھرپور شخص جس کی ایک ایک ادا پر جان قربان کر دینے کو جی چاہتا تھا۔ ایک دن سینے میں درد ہوا، تو ڈاکٹر کا فون نمبر کہیں سے حاصل کیا اور بستر کے سرہانے رکھ دیا۔ جو زندگی میں کبھی ڈاکٹر کے یہاں نہیں گیا تھا وہ اپنی حالت کو بھانپتے ہوئے بھی ابھی شش و پنج ہی میں تھا کہ درد کا دوسرا دورہ ایسا پڑا کہ ہسپتال تک نہ جا سکا اور اپنے معبودِ حقیقی سے آناً فاناً جا ملا۔ ان کی یہ جوانی کی موت غیروں سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اپنوں کا حال تو پوچھنا ہی بیکار ہے۔

شب و روز کے ہر کام کو بہت ہی احتیاط سے کرنے والا، سوچ کر بولنے والا، سوٹ بوٹ میں قرینے سے تیار ہونے والا، نفاست پسند، بولتی ہوئی آنکھوں والا، ارادتاً سفر کرنے والا بے ارادہ نہ جانے کون سی مبہم منزل کی طرف ایسے چپکے سے چلا گیا کہ ان سے ملنے کا جو خواب میں دیکھتی تھی وہ خواب اسی طرح سے میرے دل میں منجمد ہو کر رہ گئے۔ ان کے خوشنما خطوط جو میں نے بڑی باجی کے پاس کراچی میں پڑھے تھے، اس کے ہر صفحے پر زندگی کی ایسی ایسی شوخیاں بکھری پڑی

تھیں، وہ خطوط ایسے دل گداز تھے جس کو میں آج تک نہیں بھول پائی ہوں۔ اب تو دل بس یہی چاہتا ہے کہ اس کے ایک ایک ورق پر گلاب کی پتیوں کا حاشیہ بنا کر اسے میں اپنی دیواروں پر ٹانگ ڈالوں اور ان اچھوتے حروف کی خوشبوؤں کے ساتھ اپنی بچی ہوئی زندگی بسر کروں۔

میرے بچپن میں گھر کا ہر اصول حسنین بھیا اور چھوٹے ابا مل کر بناتے تھے۔ ہم بہنوں میں اگر کسی بات پر جھگڑا ہوا، تو وہ ایک جج کی طرح کرسی پر بیٹھ جاتے اور پھر پوری ایک عدالت کی صورت کا سا سماں منٹوں میں آنکھوں کے سامنے ہوتا، ''اچھا آپ بتایئے آپ پہلے کیا بولیں؟...... ٹھیک ہے اب آپ چپ ہو جایئے، اب ان کے بولنے کی باری ہے...... ٹھیک ہے، لیکن آپ نے ایسا کیوں کہا؟...... یہاں پر آپ کی غلطی ہے...... چلیے مان لیجیے اور معافی مانگ کر بات ختم کیجیے......'' پھر دوسرے کو بھی آخر میں جج صاحب فیصلہ سنا دیتے، ''جناب آپ بھی فلاں فلاں جگہ پر غلط تھیں اور آرام سے اپنی غلطی قبول کر لیجیے......'' اور پھر ایک سکون کا سماں...... ساری لڑائی ختم!

اپنے ہی کمپاؤنڈ میں کھیلتی رہتی اور اس بیچ اگر باہر کے کسی آدمی کو دیکھتی تو بھاگم بھاگ گھر کے اندر چلی جاتی تھی۔ خدا جانے ایسی عادت ہم لوگوں کی کیوں تھی؟ شاید بچپن میں کسی نے کچھ اس طرح ڈرایا ہوگا کہ کسی کو دیکھتے ہی گھر کے اندر چلی جاؤ۔ مگر حسنین بھیا فوراً ہم لوگوں کو پکڑ کر باہر لاتے اور کہتے، ''نجم، ان سے ملو یہ فلاں صاحب ہیں۔ چلیے سلام کیجیے...... اور یہ بیچارے تو اچھی خاصی صورت شکل کے مالک ہیں، ان کو دیکھ کر بے تحاشہ بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر کہتے، ''جایئے ان کے لیے چائے بنوا کر لایئے۔''

ان کی شادی انگلینڈ میں ELS بھابھی سے ہوئی جو کہ Dutch ہیں۔ دونوں نے اپنی شادی شدہ زندگی کو بہت ہی خوش گوار طرح سے گزارا اور آج تک ہم لوگوں سے ربط قائم رکھتی ہیں۔

بلا تصنع گفتگو کرتے۔ بلا تکلف اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ سچے، کھرے اور پر کشش سے حسنین بھیا کے ساتھ میرا بچپن گزرا جس کی تھوڑی تھوڑی سی یاد، انگلینڈ جاتے وقت، پٹنہ اسٹیشن پر ٹرین کے دروازے پر ہار سے لدے پھندے دولہے کے تصور کو سینے سے لگائے رہتی ہوں، جس کا ذکر روحِ شعر و نغمہ کی طرح بکھر جاتا ہے۔ جس کے مسکراتے ہوئے تکلم کی یاد سے ہی کونہ کونہ مہک اٹھتا ہے۔

اپنی شادی کے بعد جب میں لندن آئی تو وہ بھی وہاں موجود تھے اور سب ملا کر ان سے کوئی دس بار کے قریب

ملاقات ہوئی ہوگی اور بس۔ میرے گھر اپنی بیگم اور بچوں کو لے کر آئے تھے۔ اسی مسکراہٹ کے ساتھ، وہی انداز، وہی سچائی، وہی کھرا پن لیے ہوئے!

شہربانو باجی کا پورا نام ہم لوگ نہیں لیتے، صرف بانو باجی کہتے ہیں۔ ان کی شادی میرے بچپن میں ہی ہوگئی تھی اور پھر شادی کے بعد زیادہ تر میاں کے ساتھ باہر رہیں، کبھی امریکہ، کبھی الجیریا اور کبھی سعودی عرب۔ جب بھی ان کے آنے کی خبر آتی تھی تو ہم لوگ بے حد خوش ہوتے تھے۔ گھر میں جیسے بہار آجاتی تھی۔ گھر کا پورا سماں ہی بدل جاتا۔ جس جس ملک سے آتیں، وہاں کی کہانیاں سناتیں تو ہم لوگ بے حد انہماک سے سنتے۔ ان کے شوہر یعنی ہمارے نوشے بھائی فارن سروس میں تھے اس لیے بانو باجی کے خوب مزے تھے۔ اتنی کم عمری میں قریب قریب ساری دنیا گھوم چکی تھیں۔ بچوں کی پیاری پیاری حرکتوں سے ہم لوگ بہت محظوظ ہوتے تھے، لیکن یہ شور وغل صرف چند ہفتوں ہی کے لیے ہوتا تھا۔ پھر ان کے جانے کے بعد سناٹا چھا جاتا تھا۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ بانو باجی پہلی بار جب امریکہ سے آئی تھیں تو ہم لوگوں کو یہ بتاتی تھیں کہ وہاں پانی کا نل بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ داہنی طرف گھماؤ تو ٹھنڈا پانی گرتا تھا اور بائیں طرف گھمایا جائے تو گرم پانی گرتا تھا۔ یہ سب سن کر ہم لوگوں کو سخت تعجب ہوتا تھا، اور نہ جانے اور کتنی ساری باتیں بتاتی تھیں۔ بچوں کے کپڑے، ان کے کھلونے دیکھ دیکھ کر ہم لوگ دنگ رہتے۔ بانو باجی جب چلی جاتیں تو پھر ان کی واپسی کا ہم لوگ انتظار کرتے۔

مہر باجی کی شادی پٹنہ ہی میں ہوئی۔ اس لیے وہ ہمیشہ پٹنہ میں رہیں۔ یہ میرے چھوٹے چچا کی منجھلی لڑکی تھیں۔ ان کی محبت اور شفقت کو میں ہمیشہ یاد کرتی ہوں۔ اپنے پورے سراپے سے بولتیں اور بے حد زور ڈال کر باتیں کرتیں۔ تھوڑی جذباتی، تھوڑی تیا کی...... منٹوں میں رونے لگتیں اور پھر فوراً ہی کسی نے ذرا سا سمجھایا بجھایا، تو بس ایک دم سے ہنس پڑیں۔ بڑی اماں کے ساتھ والا کمرہ مہر باجی کا ہوا کرتا تھا۔ ان کے کمرے کے سامنے گلاب کی لتے دار جھاڑی ہوا کرتی تھی۔ مجھے ایک منظر یاد آرہا ہے کہ مہر باجی اپنے کمرے میں پڑھنے کے ٹیبل کرسی پر اپنے سیاہ گھنگھریالے بال کھولے بیٹھی تھیں اور ٹیبل پر کشیدہ کاری کا کڑھا ہوا ایک خوبصورت ٹیبل کلاتھ بچھا ہوا تھا۔ اور اس سفید ٹیبل کلاتھ پر کھڑکی سے آتی ہوئی گلاب کی شاخ جس میں ایک تازہ لال گلاب کھلا رہتا تھا، ان کے ٹیبل پر رکھا رہتا تھا اور اسی گلاب کی جھاڑی سے ٹوٹا ہوا ایک لال گلاب ان کے بالوں سے اٹکا رہتا تھا۔ میں اکثر ان کے کمرے میں جاتی تھی تو مجھے وہ اپنی ایک خاص قسم کی مسکراہٹ سے

میرا استقبال کرتیں۔ بہت ہی کم عمری میں ذیابیطس کی مریض ہوگئی تھیں اور صحت دن بہ دن اتنی خراب ہوتی گئی کہ جان کے لالے پڑ گئے اور آخر کار ایک دن ہم سبھی کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

چھوٹے ابا کی سب سے چھوٹی لڑکی قمر بانو میری ہم عمر، میری دوست، ہم جماعت اور صبح سے شام تک کی ساتھی تھی۔ قمر، سلطانہ اور میں تینوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ہر پل اور ہر لمحے کا ساتھ تھا۔ پیدائش بھی قریب قریب ایک ہی زمانے کی تینوں کی تھی۔ بڑھے پلے بھی ایک ساتھ، پڑھے لکھے بھی ایک ساتھ، سمجھ بوجھ بھی ایک جیسی، شادی بیاہ بھی قریب قریب ایک ہی ساتھ ہوئی۔ ایک ہی اسکول اور ایک ہی کالج میں تینوں جاتے تھے۔ ان وقتوں کا ایک لمحہ بھی رائیگاں نہ گیا۔ اگر کوئی مانگے تو ایک ایک پل کا حساب دے سکتی ہوں۔ کسی نے کب کیا کہا تھا؟ اس کا جواب میں نے کیا دیا تھا؟ پھر اس جواب کے اثرات اس شخص پر کیا ہوئے تھے؟ پھر میں نے کیا کہا؟ کون کس بات پر رویا؟ کس کو کس بات پر ڈانٹ پڑی تھی؟

ہاں تو بات میں قمر کی کر رہی تھی۔ حسین و جمیل قمر، چھریرے بدن کی، جب سائیکل چلاتیں اور اس کی مہارت کا مظاہرہ کرتی تھیں تو لڑکیاں کیا لڑکے بھی رشک کرتے کہ کاش وہ بھی اتنا پرفیکٹ سائیکل چلاتے۔ تلنگی اڑانے میں ماہر۔ نہ جانے کتنی کتنی تلنگیاں ہم لوگوں کے کمپاؤنڈ میں قمر کے منجھے ہوئے دھاگے سے کٹ کٹ کر گرتی تھیں اور ہم لوگ اس کا تماشہ دیر دیر تک دیکھتے تھے۔ لٹو کھیلنے کی ایسی مہارت تھی کہ اکثر لٹو کھیلنے والے جب کمپاؤنڈ میں آتے تو منٹوں میں ان کے لٹو کو پھاڑ دیتی۔ گلی ڈنڈا، گولی اور نہ جانے کون کون سا لڑکوں کا کھیل کھیلتیں۔ ٹیبل ٹینس، چیس، کیرم بورڈ اور بیڈمنٹن کا دور پر دور چلتا تھا اور کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ گھر کے کمپاؤنڈ میں ہنسنا بولنا، کھلکھلانا، بحثیں کرنا، چاندنی رات میں گنگا کے ساحل کی سیر کرنا، شاپنگ کرنا، پٹنہ مارکیٹ کی زیارت کے لیے جانا، سب کچھ ساتھ ساتھ ہوتا۔ وہ سارے لمحے جو ٹھہر ٹھہر کر میرے تصور کی دنیا میں چمکتے ہیں، وہ میرے لیے بہت ہی عزیز ہیں۔ قمر کا چہرہ جب میرے سامنے آجاتا ہے تو اس کی باتیں اور تین انگلیوں کو ناک پر رکھ کر بے اختیار کھلکھلا دینا ویسے ہی جیسے رات میں چاند کی ایک کرن پہاڑوں پر روپہلی روشنی پھیلا دیتی ہے اور پھر میرا تصور اور بھی جگمگانے لگتا ہے۔

اس وقت کے لوگ بڑے باکمال ہوتے تھے۔ اس طرح کے لوگوں کے سائے میں بڑھنا پلنا ایک نعمت کی طرح، ایک خوشبو کی طرح اور ایک گلِ شاداب کی طرح تھا۔

☆☆☆

(۱۴)

اس جہانِ رنگ و بو میں جیسے سب رشتوں میں کشش تھی، خوبصورتی تھی۔ بے پناہ قوت برداشت کا ہر کوئی مالک ہوتا تھا۔ صرف سب کا انداز الگ الگ ہوتا۔ کوئی کم بولتا، کسی کا پورا سراپا بولتا۔ لوگوں میں خامیاں بھی ہوتی تھیں مگر دوسرا ان خامیوں کو جانتے ہوئے اس سے محبت کرتا تھا۔ اگر غور سے سوچیے تو اس میں الگ قسم کا حسن ہے۔ اس میں ایک نرالی چاہت کی چاشنی ملتی ہے۔ وہ دور ہی اور تھا، وہ لوگ ہی اور تھے۔ ہر گھڑی دلچسپ گزرتی، ہر ساعت رنگوں سے بھرپور ہوتی۔ خوش طبعی، خوش نگاہی، جاں نثاری، جاں سپاری، توانائی، بیداری سے محفل بس سجی رہتی۔ ہار سنگار، جوہی، بیلے اور رات کی رانی سے نسیمِ صبح اور شام کی ہوا لدی پھندی ہوئی آتی اور جاتی رہتی۔

اپنے بچپن کے حافظے اور معصوم طبیعت کی وجہ سے مجھے ان باتوں کے بیان کرنے میں زیادہ ہی آسانی ہو رہی ہے، جن کا بیان ان لوگوں کے ذریعہ ممکن نہیں ہے جن کی طلب و خواہش بدل گئی ہے اور ان کے ذہن میں نئی دنیا کی مادی ترقی کی فوقیت اور برتری سمائی ہوئی ہے اور ان خیالات کا گزر ان کے ذہن میں نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس دور کی روحانیت کے ماحول میں تربیت نصیب ہوئی ہے اور ان کی محبتوں کا بھرپور تاثر میرے حافظے پر چھایا ہوا ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں میں جو مصنوعی معاشرتی ترقیاں زندگیوں میں داخل ہوئی ہیں ان کا گزر اس وقت اتنی شدت سے نہیں تھا۔ زندگی فطرت سے گہری وابستگی رکھتی تھی۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی خالص فضا سے انسان وابستہ تھا۔ فطرت اور قدرت کا سایہ زندگیوں پر تھا۔ ہوائیں صاف، ہواؤں میں رقص کرنے والی آوازیں اور صدائیں پاک صاف پانی مٹی سے پیدا ہونے والی اشیا پاک

صاف اور غیر آلودہ۔ ان کا استعمال بھی اللہ کی منشا کے مطابق ہوتا تھا۔ اس لیے زندگیوں میں وہ روشنیاں تھیں جو آنکھوں سے اُتر کر دل میں سما جاتیں اور مشامِ جاں کو ہر وقت تازہ اور شاداب رکھتیں۔ دلوں پر شغال کی گرفت زیادہ نہیں تھی۔ اتنی تھی کہ اس سے انسان کچھ ریاضت کے بعد چھٹکارہ حاصل کر کے فطرت اور قدرت کی گود میں پھر واپس آ جاتا تھا۔ ارمان اور خواہش ہوس کا شکار نہیں ہوتی تھیں۔ تمنائیں، معصوم آرزوئیں قدرت سے باغیانہ قدم نہیں اٹھاتی تھیں۔ آنکھوں میں میں مشاہدۂ قدرت اور فطرت کی استعداد باقی تھی اور اسی طرف سبقت اور پرواز بھی تھی۔ مختصر یہ کہ زندگی روحانیت کی آغوش سے محروم نہیں ہوئی تھی۔

ایسی زندگیاں جس نے دیکھی ہوں اور محبت، پرستش اور پیار کی نگاہوں سے دیکھی ہوں ان کی لذت حاصل کی ہو، ان کا مزہ لیا ہو، ان کی چاشنی چکھی ہو، ان کی شیرینیوں سے سیراب ہوئی ہو، ان آنکھوں میں وہ سچائیاں اب تک کیوں زندہ نہ رہیں۔ چنانچہ میری آنکھوں میں وہ سچی قدرت سے وابستہ زندگیاں اب بھی نمایاں ہیں۔ ان کے ارد گرد کا ماحول اس سچائی سے زندہ ہے۔ انھیں زندہ رکھنے، قائم رکھنے، تازہ رکھنے کی جو شرائط ہیں، وہ میں نے ہاتھ سے جانے نہیں دی ہیں، ان کی حفاظت کی ہے۔ ان سے محبت کی ہے، ان سے پیار کیا ہے۔ انھیں اپنی زندگی کی آبرو سمجھا ہے۔ ان کی عظمت دل میں باقی رکھی ہے۔ طلب و تمنا کو آوارہ اور بے لگام نہیں ہونے دیا ہے۔ نئی دنیا کی آب و تاب پر انھیں قربان نہیں کیا ہے۔ اپنی چاہت کو ان کے ماتحت رکھا ہے۔ اپنی خواہش کو ان کے تابع رکھا ہے۔ ان کی عزت کو آج کی جھوٹی اور مصنوعی عزت پر مقدم رکھا ہے۔ اس لیے مجھے حق ہے کہ میں اعتماد و یقین سے یہ کہوں کہ یہ اب بھی اور اس وقت بھی سچے ہیں۔ قابلِ تقلید ہیں۔ آنکھوں میں بٹھانے کے لائق ہیں۔ اس دور کی بڑی سے بڑی سچائی کو پوری قوت اور دلیری سے سامنے لایا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اصل سچ یہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گواہی یہ ہے، حسن یہ ہے، خوبصورتی یہ ہے، جو عظمت کے قابل، احترام کے قابل اور بھروسہ اور اعتماد کے قابل ہے۔

اب میں ایک ایسا نام لینے جا رہی ہوں جس کے دل کی نرمی، مزاج کا ٹھہراؤ، جھک کر ملنے کے انداز کی گرمی میری آنکھوں سے سفر کرتی ہوئی میرے دل تک پہنچ جاتی تھی۔ باتوں میں تھوڑی سی لکنت لیکن اس لکنت کو سن کر اس کی معصومیت، کسی برسات کی موسلا دھار بارش کی طرح برس کر میرے وجود پر چھا جاتی تھی۔ میں اکثر اس لڑکے کے بارے میں سوچتی تھی کہ یا اللہ اتنا بھی نیک کوئی انسان ہوتا ہے؟ وہ کوئی اور نہیں تھا، میرا بھانجا سیّد پرویز شہاب الدین، جو کہ میری چچیری بہن شہر بانو شہاب الدین کا لڑکا تھا۔ اس کے اندر ایک ایسی خود اعتمادی تھی کہ وہ محنت سے بڑے سے بڑے کاموں میں کامیابی حاصل کر لیتا تھا، پرویز کی پیدائش برما (Burma) میں ۱۹۶۲ء میں ہوئی، اس لیے کہ ان دنوں بانو باجی اور نوشے بھائی (سیّد شہاب الدین) جو کہ میرے شوہر کے بڑے بھائی ہیں Foreign service میں پوسٹڈ تھے۔ انھیں دنوں اس نے ماں باپ کے ساتھ ساتھ بہت سارے ممالک کی سیر کی اور مختلف کلچروں کا تجربہ بھی کیا اور یہی وجہ تھی کہ اسے بچپن ہی سے گھومنے پھرنے کا اور ساری دنیا کو دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔

پرویز کی ابتدائی تعلیم پٹنہ، گیا، رانچی اور دہلی میں ہوئی۔ لیکن اس نے گریجویٹ کی ڈگری Mechanical Engineering کی I.I.T Delhi سے حاصل کیا۔ I.I.T میں Dr. Kiran Seth نے پرویز کو Operation Research سے متعارف کرایا تو اس نے Operation Research میں پی ایچ ڈی کے پروگرام میں apply کیا اور نتیجے کے طور پر اسے Stanford University میں Full Scholarship مل گیا۔ اسی کے بعد پرویز نے اپنی Thesis جمع کی تو اس کو Coveted George Nicholson Award مل گیا۔

۱۹۹۰ء میں I.B.M میں نوکری کرنے لگا اور پانچ سال تک ان لوگوں کے ساتھ منسلک رہا۔ لیکن درحقیقت وہ ہمیشہ سے ہی Academics and Teaching میں جانا چاہتا تھا اس لیے ۱۹۹۴ء میں Columbia University میں پروفیسر ہو گیا اور وہاں پڑھانے لگا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس کو Full time position مل گئی جو کہ ۱۹۹۵ء سے شروع ہوئی اور وہ وہاں کا Youngest tenured full professor ہو گیا جو کہ کولمبیا کا ایک چہیتا پروفیسر بن گیا۔ اور پھر ۲۰۰۴ء میں The great Teacher award بھی ملا۔

مجھے ایک شام یاد آ رہی ہے، ایک ڈراؤنی شام، جب میں اپنے کچن میں کسی کام میں مصروف تھی کہ فون کی گھنٹی بجی...... اور کسی نے مجھے بتایا کہ کل شام سے پرویز گھر نہیں آئے ہیں۔ میں اپنے گھر میں پریشان حال ادھر سے اُدھر دوڑتی رہی، روتی رہی، دعا کرتی رہی، ساتھ ساتھ اپنے دل کو سمجھاتی بھی رہی۔ لیکن کچھ ایسا ہو گیا جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کسی نے اپنے بے رحم ہاتھوں سے ایک موٹیل میں پرویز کو قتل کر دیا۔ اسی نے کیا ہو گا جس سے پرویز کی ترقی دیکھی نہیں گئی۔ ۱۷ نومبر ۲۰۰۵ء کو پرویز کی لاش نیویارک کے موٹیل سے برآمد ہوئی۔ میں اپنے اس قلم کی روشنائی سے نہیں بلکہ اپنے دل کے خون اور جگر کے لہو کو کاغذ پر پھیلا رہی ہوں۔ مجھے ان جملوں کو لکھنے میں بہت ہی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک ایسی ہستی، ایک ایسی شخصیت جسے یاد کرنے سے ہی جیسے ریشم کی نرمیاں موجیں بن کر میرے اندر بہنے لگتی ہیں۔ وہ ہم سے جدا ہو گیا تھا اور ایسے سفر پر جا نکلا جہاں سے کوئی بھی واپس نہیں آیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی محبت، اس کے لہجے کی نرمی کی ٹھنڈک اب بھی میرے لیے محفوظ ہے۔ محبت کی کہانی یوں بھی موت کے بعد بھی کہاں ختم ہوتی ہے۔ پرویز اپنی پُر خلوص دوستانہ زندگی، شائستگی، نرم گفتنی اور علمی معلومات کے لیے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

درحقیقت پرویز کی زندگی میں تو کئی کئی ہفتوں تک اس سے فون پر بات نہ بھی ہوئی تو اطمینان ہی رہا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہی ہے، جب چاہوں گی اس سے بات کرلوں گی۔ اس کی محبت بھری آواز سن لوں گی۔ اس کے مرنے کے تین دن قبل میری اور اس کی فون پر بات ہوئی تھی مگر ان لمحوں میں، میں نے یہ کب سوچا تھا کہ اس سے اس طرح ہمیشہ کے لیے چھوٹ جانا پڑے گا اور اتنے بڑے غم سے ٹکرانا پڑے گا۔ تدفین کے لیے نیویارک سے دہلی لے جایا گیا۔

بعد میں جب اس کے گھر گئی تو لوگوں نے بتایا کہ دو دن قبل وہ میرا شعری مجموعہ ''سرگوشی بہار کی'' نکال کر اپنے کچھ دوستوں کو دکھا رہا تھا کہ یہ میری منجھلی امّی کی کتاب ہے...... دیکھئے نا......

یہ سن کر دل لہولہان ہو گیا، چور چور ہو گیا۔ یک بیک ایسا لگا کہ سبزے کا لہلہانا، پھولوں کا کھِلنا، پتوں کا سرسرانا، ہر جاندار جو سانس لیتا ہے اس کا سانس لینا بس پل بھر کے لیے تھم سا گیا ہو۔ دنیا جیسے ٹھہر گئی اور میں تن تنہا ایک بڑے سے خالی میدان میں کھڑی کی کھڑی بے بسی سے اس ٹھہری ہوئی دنیا کو گھور رہی ہوں...... گھورتی ہی جا رہی ہوں...... اور اس کے بعد آنسوؤں کے سرچشمے پر کوئی اختیار نہیں رہا......

پسماندگان میں بیوی صوفیہ احمد، ایک بیٹی ضُحیٰ اور ایک بیٹا زین ہے۔ اللہ اس کے ماں باپ، بہنوں اور رشتہ داروں کو صبر کی تلقین عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ اللہ رب العزت مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

☆☆☆☆☆

صوفیہ انجم تاج اس کتاب کو لکھتے ہوئے بیک وقت دو دنیاؤں میں سانس لیتی ہیں۔ کوئی کارِ دیگر ممکن ہی نہیں تھا۔ ماضی اور حال میں یہ مفاہمت اور مطابقت کسی زمانے میں ورجینیا وولف نے اپنا شہرۂ آفاق ناول "TO THE LIGHT HOUSE" لکھتے ہوئے پیش کی تھی، جب لاشعور کی برقی رَو شعور پر اپنا دبیز پردہ ڈال کر اُسے یوں ڈھک دیتی ہے کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ماضی کیا ہے اور حال کیا ہے۔ دونوں میں کہاں تفاوت ہے اور کہاں مطابقت۔ اُن کے اپنے الفاظ میں تخلیقی قوت کی کارکردگی میں یہ ایک عجیب کیفیت ہے۔

''مجھے ایسے لگا جیسے میرے اندر دو روحیں بستی ہوں۔ ایک وہ جو بچپن کی حسین یادوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی آج تک اسی زمانے میں رہ رہی ہے جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ دوسری وہ جو عصرِ حاضر کی بالغ عورت ہے جس نے زندگی کے نشیب و فراز کو قدم بقدم چل کر طے کیا ہے۔ یہ دونوں روحیں آپس میں پرانی سہیلیوں کی طرح گئی باریوں گلے ملتی ہیں کہ قیاس کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ بچپن کی معصوم اور کھلنڈری روح کون سی ہے اور آج کی تعلیم یافتہ، زمانہ شناس بالغ روح کون سی ہے ــــ!''

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

''انجم تاج کی تخلیقات ان کے پُرخلوص جذبات، شدتِ احساس اور تعلقِ خاطر کے وہ نازک آبگینے ہیں جن کی قدر وہی کچھ کر سکتا ہے جس کا خمیر خود ان اجزائے ترکیبی سے مرکب ہو......!''

مقصد الہ آبادی